# پاکستانی اردو ادب
# اور
# اہل قلم خواتین

احمد پراچہ

# پاکستانی اردو ادب

## اور

# اہل قلم خواتین

احمد پراچہ



نیشنل بک فاؤنڈیشن

اسلام آباد

این بی ایف طبع اول : 2000: ایک ہزار

کوڈ نمبر : جی بی او آر /1000/726

مطبع : ورڈ میٹ، اسلام آباد

ISBN : 969-37-0183-6

پبلشرز

نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد

# فہرست

(حصہ اول)


آغاز کلام ۱

سخنے چند ۴

شعری ادب اور شاعری ۹


(حصہ دوئم)


اردو ناول نگاری میں خواتین کا حصہ ۱۹۴

ناولٹ ۲۳۶

خواتین کا افسانہ ۲۴۲

خواتین کے سفرنامے ۲۸۴

تحقیق وتنقید ۲۹۸

اردو ڈرامہ ۳۱۱

رپورتاژ ۳۲۰

اردو تراجم ۳۲۲

متفرق اصناف شعر ونثر ۳۲۷

کتابیات ۳۳۵

# آغازِ کلام

آغاز کلام سے پہلے چند بنیادی باتیں قارئین کرام کے ذہن نشین کرانا ضروری سمجھتا ہوں جو اس کتاب کے مطالعہ میں مد ثابت ہوں گی۔

☆ پاکستان کے مختلف علاقوں میں اہل قلم خواتین کا اُردو ادب کے حوالے سے 1947ء سے لے کر اب تک جو کام منظرِ عام پر آیا ہے یہ اسی کام کا سرسری سا جائزہ ہے۔ گویا "مشتے نمونہ از خروارے" کے مصداق کچھ معروف اہل قلم خواتین کے فن کی جھلکیاں پیش کی گئی ہیں کیونکہ 1947ء سے اب تک کی تمام قلمکار خواتین یا ان کی جملہ تخلیقات کا ذکر ممکن نہ تھا۔ تاہم اس منظر نامے پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی جا سکتی ہے۔

☆ چند نمایاں شخصیات اور 1947ء کے بعد سے تاحال فروغ پانے والی ادبی ساجیات کا ذکر کیا جا سکتا ہے لیکن اس منظر نامے کی تفصیل ممکن نہیں تاہم اجمال پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جبکہ مجھے اس بات کا کوئی زعم نہیں کہ اس کتاب کا ہر باب جتنی تجزیاتی اور تنقیدی صلاحیت کا متقاضی ہے اس

معیار پر میں پورا اترا ہوں کیونکہ تنقید میرا منصب نہیں اور نہ ہی میں اپنے آپ کو کسی اَدَب پارے پر تنقید کرنے کا اہل سمجھتا ہوں، میں نے جن اہل قلم خواتین کے فن پاروں کے متعلق چند جملوں میں جو اظہارِ خیال یا تبصرہ کیا بھی ہے تو یہ میرے ذاتی تاثرات اور خیالات ہیں چنانچہ میرے ان جملوں کو باقاعدہ تنقید کے زمرے میں رکھ کر نہیں دیکھنا چاہئے۔ نیز یہ کتاب تنقید کی بجائے پاکستانی اہل قلم خواتین کے حوالے سے تحقیق اور ادب کی تحسین و تفہیم ہے۔

☆ یہ کتاب تنقیدی زاویہ نگاہ سے لکھی ہی نہیں گئی، اِس کی حیثیت محض تعارف اور تذکرہ کی سی ہے اور اس کا مقصد پاکستانی قلمکار خواتین کے نام اور کام کو محفوظ کرنا تھا۔ میری کوشش یہ رہی ہے کہ اُردُو کی اُن تمام پاکستانی قلمکار خواتین کے اِسمائے گرامی اس تذکرہ میں شامل ہو جائیں جو مجھ تک پہنچ گئے ہیں۔ تاہم اگر کسی شاعرہ، ادیبہ یا ڈرامہ نویس کا نام مجھ تک نہ پہنچ سکا ہو تو اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

☆ میرے لئے تمام اہل قلم خواتین قابلِ صد احترام ہیں، بحیثیت مجموعی اہل قلم خواتین کا انفرادی تشخص کسی سے بھی کم یا کمتر نہیں لہذا میں نے اس بات کو ملحوظ رکھا کہ اہلِ قلم خواتین میں اُردُو اَدَب کے اہم ترین اور نمایاں ناموں میں سے کوئی معروف اور معتبر نام رہ نہ جائے اور پھر معیار بھی مجروح نہ ہو۔

☆ میں نے نہ صرف اپنے طور پر بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور تجربہ کار اپنے اہلِ قلم دوستوں کے باہمی مشورے سے اس کتاب میں شامل قلمکار خواتین کے ناموں کی ترتیب اور تقدیم و تاخیر کا خاص طور پر خیال رکھا ہے اور ہر فنکارہ کے لکھنے کے

آغاز کے سال کو بنیاد بنانے کی پوری محنت اور کوشش کی ہے، پھر بھی نام آگے پیچھے ہو گئے ہوں تو میں انتہائی انکساری کے ساتھ معذرت خواہ ہوں۔

☆ میں نے اس کتاب میں ابواب کو اصناف وار تقسیم کرنے کا التزام کیا ہے لیکن میرے ایک دیرینہ محترم قلمکار دوست نے کچھ یوں اظہارِ خیال کیا ہے کہ اصناف وار تقسیم سے غیر ضروری تکرار پیدا ہوتی ہے اس لئے مناسب ہے کہ شاعری اور نثر کے دو عنوانات قائم کر کے ایک فنکارہ کی تمام حیثیتوں اور جہتوں کا ایک ہی جگہ جائزہ لیا جاتا اس سے ہر فنکارہ کے بارے میں ایک مجموعی تاثر سامنے آتا۔

☆ لیکن کتاب کی مخصوص بنت کے پیشِ نظر اس کے لئے اصناف وار تقسیم ناگزیر تھی چنانچہ میں نے اصناف وار تقسیم ہی کو مناسب سمجھا۔

☆ جہاں تک میری رسائی تھی میں نے اپنے محدود اور کمزور وسائل کے باوجود اپنی سی کوشش کی ہے کہ یہ کتاب ایک ایسی دستاویز ثابت ہو کہ پاکستانی اہلِ قلم خواتین کے گراں قدر کام اور اُن کی فکر و نظر کے مطالعے کے لئے اس کی حیثیت لازمۂ خاص کی ہو۔ اِس میں مجھے کہاں تک کامیابی ہوئی ہے اِس بارے میں کسی رائے کا اظہار قارئینِ کرام ہی کے لئے مناسب ہے۔

﴿احمد پراچہ﴾

# سخنے چند

اَدَب کے اثرات یک لخت رونما نہیں ہوتے بلکہ اَدَب دھیمی آنچ کی طرح کام کرتا ہے۔ اَدَب زندگی کے تغیرپذیر حالات کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتا رہتا ہے، عام حالات میں ادب کا رجحان شاذ ہی بدلتا ہے کسی ملک یا قوم کے ادب میں نمایاں تغیر اس وقت آتا ہے جب وہ کسی بڑے ہمہ گیر حادثے سے دوچار ہو۔ یہ ہمہ گیر حادثے اور انقلابی عوامل ادب اور زندگی کو نئے راستوں سے روشناس کراتے ہیں۔ اس کے سبب سے خارجی وباطنی محرکات کے دھارے پھوٹ پڑتے ہیں جس میں مختلف نوعیت کے مسائل، اُلجھنیں اور حالات سامنے آتے ہیں۔ اِس وقت ملک کا باشعور طبقہ اپنے فن کے بل بوتے پر نئی زندگی کے مصائب ومحاسن کا تجزیہ کر کے زندگی کے خفیہ گوشوں کی نقاب کشائی کرتا ہے اور اس طرح آئندہ کے

لیے ایک باقاعدہ اورواضح لائحہ عمل پیش کرتا ہے۔

1947ء کی ملکی تقسیم اگرچہ ہمارے ماضی کے خوابوں کی تعبیر تھی لیکن بد قسمتی سے یہ بٹوارا ہمارے لیے ایک عظیم حادثہ بن گیا، یہ ہمہ گیر انقلاب تھا جس نے ہماری زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا ہمارے ادب پر بھی اس کا اثر پڑا۔ چنانچہ پاکستانی دور کے ادب میں اثرات کا بڑا گہرا عکس پایا جاتا ہے۔

ڈاکٹر ابولیث صدیقی کے مطابق

''اگرچہ چودہ کروڑ انسانوں کی آبادی کو جو مملکتِ پاکستان میں بستی ہے۔ ایک قوم مان لیں تو لازماً ہمیں اس کے لیے ایک ایسے ادب کی ضرورت ہے جو جذبہء قومیت کا عکاس ہو جو اس کی امیدوں اور محرومیوں کا آئینہ دار ہو جو پاکستان کے استحکام میں معاون ہو اور اس کی بنیادی اقدار کو قائم رکھتا ہو''۔

پاکستان کے مختلف علاقوں کی مختلف زبانیں ہیں مثلاً سندھی، بلوچی، پشتو، پنجابی، سرائیکی وغیرہ چنانچہ یہ مختلف علاقائی زبانیں پاکستانی ثقافت کے عناصر مکمل طور پر ترجمان ہیں۔ اور ان کی حوصلہ افزائی نظریہ پاکستان کی سالمیت اور ترقی میں مدومعاون ثابت ہوں گی۔

تقسیم وطن کے بعد کچھ عرصہ تو بظاہر یہ مسئلہ پیچیدہ نظر آتا تھا کہ کیا پاکستانی ادب کیلئے کوئی ایک زبان ممکن ہے......؟

لسانی افادیت کے علاوہ ہر زبان اپنے اندر ایک تہذیبی اور ثقافتی پہلو بھی رکھتی ہے جو درحقیقت کسی قوم کی مجموعی سماجی تاریخ کا آئینہ دار ہوتا ہے لیکن جب پاکستان کی مختلف زبانوں کے اہلِ قلم کی سوچ ایک تھی کہ '' مذہب '' تصورِ پاکستان کی پہلی اہم بنیاد ہے اور پاکستانی باشندے کی زندگی اور اس کے اطوار میں ایک وحدت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ پاکستان کی مختلف زبانوں کے ادیب اور شاعر اُردو کے علاوہ اپنی علاقائی زبانوں میں بھی لکھتے آرہے ہیں۔ یہی نظریہ بالآخر

''پاکستانی اُدب'' کی اساس بن گیا۔

پاکستانی اُدب ...... قیامِ پاکستان ہی سے زندگی کی سچائی کا ترجمان رہا ہے اور اس کے ذریعے معاصر اُدب میں معاشرتی تبدیلیوں کا پورا منظر نامہ سمٹ کر آتا رہا ہے۔ چنانچہ نئے ذہنی رجحانات کے دوش بدوش ہیئتوں اور اصنافِ اُدب کے مسائل بھی پاکستانی ادب کا اہم حصہ رہے ہیں۔ لیکن فردِ واحد کے لئے محدود وسائل میں رہ کر جملہ پاکستانی زبانوں میں لکھے جاتے والے اصناف اُدب پر کام کرنا اگر ممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا لہٰذا میں نے رابطہ کی قومی زبان اُردو کی اصنافِ اُدب تک محدود رہ کر یہ کام کیا ہے۔

ہر اُدب کے پس پردہ ایک تصوراتی و نظریاتی پیکر موجود ہوتا ہے۔ ادیب شعوری طور پر اس کی تراش خراش میں اپنا خونِ جگر صرف کرتا ہے۔ چنانچہ پاکستانی ادیبوں نے بھی تمام اصنافِ اُدب میں گوہر پارے تخلیق کئے۔ اور یوں پاکستان کی نظریاتی و فکری تاریخ کو مستقبل کے لئے رقم کر دیا لیکن پاکستانی اُدب کی رفتار بالخصوص شاعری میں نمایاں رہی۔

فنونِ لطیفہ میں فنکار کے مرد یا عورت ہونے کی بنیاد پر کوئی تخصیص تو نہیں کی جا سکتی لیکن اظہار رویئے میں بہر حال ذات شامل ہوتی ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارا معاشرہ مرد کا معاشرہ ہے تاہم مردوں کے ساتھ ساتھ اہلِ قلم خواتین کا کردار بھی نمایاں رہا ہے لیکن افسوس کا پہلو یہ ہے کہ ادبیاتِ پاکستان میں عورتوں کا حصہ بہت کم اور بسا اوقات بالکل نایاب ہے ایک طرف تو شعر و ادب کے شعبوں میں قومی بلکہ عالمی سطح پر مردوں کے بڑے بڑے نام سامنے آتے ہیں۔

جبکہ اس کے برعکس کوئی خاتون اس میدان میں بین الاقوامی شہرت حاصل نہ کر سکی۔ عموماً علمی و ادبی رسائل و جرائد میں اول تو اہلِ قلم خواتین کے نام نظر آتے نہیں اگر کسی رسالے میں خواتین کو شامل کیا بھی جاتا ہے تو مردوں کے مقابلے

میں بس گنتی کی چند ہی خواتین کے نام ہوتے ہیں حالانکہ جو داخلی اور جذباتی لوازمات شعر و ادب کے لیے لازم ہیں وہ مردوں کی نسبت عورتوں کے حلقے میں کہیں زیادہ آئے ہیں چنانچہ پاکستان کے قیام کے بعد بہت سی ایسی شاعرات نے اپنی شعری پہچان کرائی جن کے یہاں نہ صرف اظہار کی سطح پر لہجہ جذبات اور احساسات اور موضوعات کے حوالے سے ایک نئی دنیا کا احساس ہوتا ہے کہ تخلیق کار مرد نہیں عورت ہے۔

پاکستان میں ایسی اہل قلم خواتین کی تعداد بے شمار پائی جاتی ہے جنھوں نے شعر وادب کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے اصنافِ ادب میں بھی بھرپور اضافے کیے ہیں لیکن یہاں فرداً فرداً تمام اہلِ قلم خواتین کے اسمائے گرامی کا حوالہ دینا ممکن نہیں۔ البتہ ان کی ہمعصر اہل قلم خواتین کے متعدد جوہر قابل کے نام شامل ہیں اور لکھنے والیوں کی تازہ دم کھیپ میں بہت سے نام نمایاں ہیں جن کی تخلیقات نے پاکستان کی ادبی رفتار میں باوقار اضافے کیے ہیں۔

اس سلسلے میں غیر محسوس طور پر پاکستانی جدید اَدب پاکستان کی اہلِ قلم خواتین کی مساعی سے نئی نسل کے ادباء و شعراء میں تبدیلی آئی اور یہی تبدیلی اصولاً نام ہے ''رفتارِ اَدب'' کا۔ مثال کے طور پر شاعری کے میدان میں کچھ نام ایسے ہیں جو خود ہی رجحان ساز ہیں اور انھوں نے شعر کی ساخت کو قومی فکر اور پاکستانی رنگ و روپ میں پیش کیا چنانچہ شاعروں کے حوالے سے پاکستان میں اَدب کی رفتار خوشگوار حد تک تسلی بخش رہی ہے اور شاعرات نے اَدب کے میدان میں زندگی آمیز اضافے کئے ہیں اور نئی نسل کی ذہنی اور فکری ترتیب میں بڑا حصہ لیا۔

اَدب چاہے کسی ملک و قوم کا ہو۔ اس کا لکھنے والا مرد ہو یا عورت اس میں ہمیں انسانوں کے احساسات اور ان کے خیالات و جذبات کا اظہار ملے گا۔ وہاں اگر مناظر قدرت کی عکاسی ملے گی تو اس کے سینے میں ہمیں انسان کے دل کی دھڑکن

سنائی دے گی۔

یہاں اگر اہل قلم خواتین کے اس جائزے کی روشنی میں یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اردو ادب میں ابتداء تا حال جتنے رجحانات رونما ہوئے ہیں اہل قلم خواتین نے ان سب کی ترجمانی اور فروغ میں نمایاں حصہ لیا ہے، اور جب ہم مجموعی طور پر پاکستانی اردو ادب اور اہلِ قلم خواتین کے حوالے سے دیکھتے ہیں تو ہمیں قطعی مایوسی نہیں ہوتی بلکہ اس بات پر فخر محسوس ہوتا ہے کہ پاکستانی اردو ادب میں ہماری اہلِ قلم خواتین نے معیار اور رفتار کے اعتبار سے آنے والی نسلوں کے لیئے ایک دقیق اور با مقصد ادب کی تخلیق میں قومی اور تاریخی فرض احسن طور پر نبھایا ہے۔

احمد پراچہ

۳۰ جولائی ۱۹۹۹ء — مکان نمبر ۳۵۰ سیکٹر نمبر ۴ کونسل ٹاؤن کوہاٹ

# شعری اَدَب اور شاعرات

نئے دور میں زندگی کے متعلق نیا رویہ اپنے ساتھ نئی صلاحیتیں لے کر طلوع ہوا، نئے لسانی تجربے وسیلہ اظہار بنے، نئی حقیقتوں نے نئی راہیں تراشیں اس کے لیے نظم کو وسیلہ اظہار بنانا وقت کا اہم تقاضا تھا اور پھر عام تاثر کے بر خلاف اردو اَدب کی تاریخ میں بھی غزل پر نظم کا تقدم ثابت ہے۔

بیسویں صدی میں جدید اردو نظم میں ہیئت کے گوناگوں تجربے ہوتے رہے ہیں۔ گزشتہ چھ دہوں میں کئی اہم نظم نگار سامنے آئے ہیں اور انہوں نے نظم کے فکری اور فنی امکانات کی خاطر خواہ توسیع کی ہے ان کی نمائندہ نظمیں کیفیت اور مقدار

کے لحاظ سے یقیناً اس قابل ہیں کہ انہیں ایک نئے تخلیقی دور کی علامت قرار دیا جائے۔ موجودہ برق رفتار زمانے میں فکر اور ادبی رویوں کی شناخت اور قدر سنجی کے لیے یہ مدت کم نہیں ہے اس لیئے یہ کہنا کہ معاصر اردو نظم بھی تجرباتی منزل سے گزر رہی ہے اور تفہیم و تنقید کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ زمانہ ناشناسی اور لاعلمی کا مظاہرہ کرنے کے مترادف ہے۔ اطمینان کی بات یہ ہے کہ معاصر شعر و اَدب کی پرکھ کے لیے اب تنقیدی شعور پختہ ہو چکا ہے اور تخلیقی اَدب کے دوش بدوش سرگرم سفر ہے۔

تقسیم وطن 1940ء سے پہلے قیام پاکستان تک نظم کو شاعری کی تمام اصناف میں اہمیت رہی اور 1990ء تک کی اردو نظم کو اگر کوئی عمومی نام دیا جا سکتا ہے تو وہ ہے جدید اردو نظم اس دور میں کسی نظم گو نے پابند شاعری کو اپنا کر نئے خیالات اور جذبات کی ترسیل کی اور کسی نے آزاد نظم اور نثری نظم کی روشِ نو پر چل کر اپنے تخیل اور تجربوں کی نئی اور تازہ جہتوں کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا یوں ہم اس دور کی نظم کو جدید خیالوں اور نئے سانچوں سے متصف پاتے ہیں۔ یہ پچاس برس اردو نظم کی جدید ہیئتوں اور نئے طرزِ اظہار کی بوقلمونی سے مزین ہیں۔ اس وقت تک پابند نظموں کے علاوہ آزاد اور معرا نظمیں بھی اپنا ایک مقام بنا چکی تھیں لیکن شاعری میں ہیئت کے تجربات کی ندی بہہ رہی ہے۔ شاعری کی ہیئت میں نئے نئے شگوفے کھلے ہیں۔ آزاد نظم کہنے والے کے پیشِ نظر سب سے زیادہ جو چیز رہی ہے وہ یہ ہے کہ اپنے خیالات کو زیادہ وضاحت کے ساتھ عوام تک پہنچادے یہی وجہ ہے کہ وہ قافیہ پیمائی کی جانب زیادہ توجہ نہیں کرتا۔ ارکان کی تعداد کا تعین بھی اسی خیال کے پیشِ نظر ضروری نہیں۔ وہ بھی موقع محل کی مناسبت سے گھٹائے بڑھائے جا سکتے ہیں چنانچہ اس وقت کی معیاری آزاد شاعری پچھلی پابند شاعری سے خیال، اندازِ بیان، اسلوب اور طرزِ ادا کے اعتبار سے بالکل مختلف ہے۔ آزاد نظم کو ایک

صنف سخن کی حیثیت سے اب مخالفین نے بھی تسلیم کر لیا ہے۔ اس صنف سخن میں طبع آزمائی کرنے والے بعض اچھے شاعر اور شاعرات اردو کے ' حوالے سے منظر عام پر آئیں۔

گزشتہ پچاس برسوں میں شاعرات کے کردار اور اِن کے طرزِ نگارش کے حوالے سے بات کی جائے تو پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد پہلے پچیس برسوں میں جن شاعرات کے نام ابھر کے سامنے آئے اور جنہیں مقبولیت بھی حاصل ہوئی ان میں ادا جعفری کے علاوہ زہرا نگاہ، رابعہ نہاں، صفیہ شمیم ملیح آبادی، ثریا فخری، بسمل صابری، وحیدہ نسیم، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض کی کاوشیں مستحسن ہیں۔ اِن شاعرات نے مختلف موضاعات مثلاً رومان۔ سیاست، سماجی رویوں اور رجحانات پر بڑی عمدہ اور مؤثر نظمیں کہی ہیں۔ ان شاعرات کی نظموں میں ان کی ذات اور معاشرتی و سماجی تلخیاں ملتی ہیں اور اُن کے شعری مجموعوں میں شامل نظموں میں ان کی نظم نگاری کی قوت اور توانائی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

پاکستانی اَدَب اور اردو شاعرات کے حوالے سے دیکھا جائے تو پاکستان کے آخری پچیس برسوں میں معیاری کلام کے حوالے سے جدید اردو نظم میں جن شاعرات کا لہجہ سرایت کر رہا ہے اور حقیقتاً نئی نظم کا خاکہ جن خطوط سے بنا ان میں شاہین مفتی، بلقیس محمود، فاطمہ حسن، شبنم شکیل، غزالہ خاکوانی، پروین شاکر، ثمینہ راجہ، شہناز مزمل، منصورہ احمد، ناہید قاسمی اور نوشی گیلانی وغیرہ کی نظموں کو دیکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان شاعرات کے کلام نے نئی نسل کو نئی صداقتوں سے روشناس کرایا ہے، ان شاعرات کی اس نامکمل فہرست میں بیشمار نام رہ گئے ہوں گے کیونکہ اس وقت میرا مقصود یہ فہرست مرتب کر کے شاعرات کو الگ الگ خانوں میں بانٹنا نہیں ہے بلکہ اپنے موقف کی تقویت کے لیئے ان چند ناموں کی مثال دی ہے ان شاعرات کی نظمیں پڑھنے کو ملتی رہتی ہیں۔ ان شاعرات کے ہاں نہ صرف اسلوب کی تاز

گی نمایاں ہے بلکہ ان کا طرز فکر بھی ایک دوسرے سے مختلف اور جدا ہے اور جن کے ہاں بھرپور انداز ابلاغ وجود ہے اور ان کی شہرت اور شناخت اسی ابلاغ کی مرہون منت ہے۔

تاہم ایک ہی عہد میں زندگی بسر کرنے اور ایک ہی معاشرے میں رہنے کے باوجود نظم میں نگہت سلیم، بشریٰ اعجاز اور دیگر شاعرات کا رنگ اور آہنگ جدا جدا ہے بلکہ نسرین سروش، شبہ طراز، نجمہ منصور، عذرا عباس وغیرہ کی نظموں کے رنگ اور ذائقے مختلف ہیں۔ اسی طرح تازہ دم کھیپ میں یاسمین حبیب، ریحانہ قمر، رخسانہ نازی، ناصرہ زبیری، شمسہ کنول، نسرین عباس، فاخرہ بتول وغیرہ کا لہجہ اور آہنگ مختلف اور جدا بھی ہے ان کے ساتھ ساتھ کچھ آگے پیچھے ہم عصر شاعرات کی کھیپ میں نیلما سرور، پروین جاوید، بہار النساء بہار، سعیدہ شبنم اور صبیحہ صبا بھی شامل ہیں یہ سب ایسی شاعرات ہیں جنھوں نے نظم کو شدتِ احساس کے خلوص و اعتبار کے حوالوں سے بھرتا ہے۔

لیکن عہدِ حاضر کی شاعرات میں جس شاعرہ کا شمار بہ اعتبار طویل مشق سخن اور ریاضتِ فن پاکستان کی صفِ اول کی معتبر شاعرات میں ہوتا ہے وہ معتبر نام ادا جعفری کا ہے۔ موصوفہ ۲۲ اگست ۱۹۲۶ء کو ''بدایوں'' (بھارت) میں پیدا ہوئیں، تقسیم وطن کے بعد پاکستان آگئیں اور مستقل طور پر پاکستان میں رہ رہی ہیں۔

آپ شادی سے پہلے ''ادا بدایونی'' کے نام سے لکھتی تھیں لیکن شادی کے بعد ادا جعفری کے نام سے لکھنے لگیں۔ ان کی سخن سرائی کا آغاز ترقی پسند تحریک کے دورِ شباب کے بعد دوسری جنگ عظیم کی بھونچالی فضا اور پاک و ہند کی تحریک آزادی کے پرآشوب ماحول میں ہوتا ہے۔ یہ فضا بیسویں صدی کی پانچویں دہائی یعنی 1940ء اور 1950ء کے درمیانی عرصے سے خاص تعلق رکھتی ہے۔ یہ دہائی جس میں ادا

جعفری، شباب و ریحان کی وادیوں کی سفیر رہی ہوں گی۔ سیاسی و سماجی اور شعری و ادبی ہر لحاظ سے پر آشوب و ہنگامہ خیز دہائی تھی۔ قومی و بین الاقوامی دونوں سطح پر ایک بھیانک بے اطمینانی اور انتشار کا عالم طاری تھا۔

چنانچہ ادا جعفری کو بڑے کٹھن مرحلوں سے گزرنا پڑا ہے اور دیدہ و دل پر بیشمار عذاب سہنے پڑے ہیں۔ 1940ء اور 1950ء کے درمیانی عرصے میں وہ کبھی جادوے کی تلاش میں رہیں، کبھی منزل کی، کبھی اپنے آپ سے دست و گریباں رہیں اور کبھی گرد و پیش سے لیکن اس عالم تذبذب میں بھی وہ کبھی از خود رفتہ یا بر افروختہ نہیں ہوئیں ان پر کبھی بے دلی و مایوسی کا غلبہ نہیں چھایا۔ ہزار آفتوں کے باوجود اپنے آشوب آگہی اور کرب روحانی کے اظہار کیلیے ہمہ وقت بے چین و مضطرب رہیں۔

اس بے چینی و اضطراب کا کیا عالم تھا اس کی تصویر ادا جعفری کے اولین مجموعۂ کلام ''میں ساز ڈھونڈتی رہی'' (مطبوعہ۔ ۱۹۵۰ء) میں شامل نظم میں دیکھی جاسکتی ہے۔

بہار کھلکھلا اُٹھی
جنوں نواز بدلیوں کی چھاؤں میں
ہر ایک شاخ لالہ زار سجدہ ریز ہو گئی
ہر ایک سجدہ ریز شاخسار پر طیور چہچہا اُٹھے
ہوائے مرغزار گنگنا اُٹھی
جنوں نوازیاں بڑھیں
فسانہ سازیاں بڑھیں
مگر بہار کو ابھی تک آرزوئے نغمہ تھی
شہید کیف انتظار و جستجوئے نغمہ تھی

میں سا ز ڈھو نڈ نے لگی
میں ساز ڈ ھو نڈ تی رہی
میں محوِ جستجو ر ہی
مجھے وہ سازِ دلنواز آج تک نہ مل سکا
وہ اودی بدلیاں کہ فخرِ صد بہار تھیں
فلک کی چشمِ خوں فشاں سے اشک بن کے ڈھل گئیں
زمیں پہ شعلہ باریاں فلک پہ گڑگڑاہٹیں
کہ سن رہے ہیں چشم و دل نظامِ نو کی آہٹیں
بہار بیت ہی چکی خزاں بھی بیت جائے گی
مگر میں ایک سوچ میں پڑی ہوئی ہوں آج بھی
وہ میری آرزو کی ناؤ کھے سکے گا یا نہیں
نظامِ نو بھی مجھ کو ساز دے سکے گا ، یا نہیں

ادا جعفری وہ پہلی شاعرہ ہیں جنھوں نے اُردو اَدب کی تاریخ میں طبقہ نسواں کی شاعری کو اعتبار بخشا۔ بظاہر یہ بیان مبالغہ آمیز لگتا ہے۔ لیکن اردو شاعری کی روایت اور تاریخ اَدب پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں اور مانتے ہیں کہ ہماری صدی کی چھٹی دہائی سے قبل اُردو شاعری میں شاعرات کے نام خال خال ہی نظر آتے تھے۔

ادا جعفری کا پہلا مجموعۂ کلام ''میں ساز ڈھونڈتی رہی'' 1947ء میں ترتیب پاچکا تھا لیکن تقسیم ہند کے ہنگاموں کی وجہ سے ۴۹۔۵۰ء میں طبع ہوا جو پاکستانی شعری اَدب کی رفتار اور معیار میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

نصف صدی پہلے قاضی محمد عبد الغفار نے ادا جعفری (ادا بدایونی) کو جن

شاعرات مثلاً حیا لکھنوی، نوشابہ قدوائی، ذکیہ سلطانہ اور صفیہ شمیم کی صف میں کھڑے دیکھا تھا آج وہ خود فراموشی کی دُھند میں غائب ہو چکی ہیں مگر ان کے بر عکس ادا جعفری کی شاعری پر تازہ نکھار آیا ہے۔

ادا جعفری نے اپنے دور کا اثر قبول کرتے ہوئے بھی اپنے قلم کی جنبش سے کچھ نقش الگ بنائے ہیں۔ ''میں ساز ڈھونڈتی رہی'' کا یہ تجزیہ کہ زندگی میرے لئے خواب نہ تھی، گیت نہ تھی۔

''شہر درد'' میں ''میراثِ آدم'' کے اجتماعی تجربے میں تبدیل ہو جاتا ہے

ہاتھ کٹتے رہے اور ننھا سا اک روشنی کا دیا
ہاتھ سے ہاتھ تک منتقل ہوتا جاتا رہا
جگمگاتا رہا

پاکستان کی تاریخ میں المیۂ کراچی بھی ہر اعتبار سے ایک اہم اور نا قابلِ فراموش واقعہ ہے۔ زندگی کے دوسرے شعبوں کے ساتھ ساتھ شعر و ادب پر بھی اس کے اثرات مرتب ہوئے۔

1980ء کی دہائی سے لے کر اب تک بلکہ آج بھی کراچی جن حالات و واقعات سے دوچار ہے۔ وہ ہر محبِ وطن پاکستانی کے لئے باعثِ آزار ہے۔ کراچی کے سانحے پر لکھے جانے والے اَدب کو کسی طرح بھی وقتی ہنگامی اور صحافتی اَدب کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

چنانچہ نہ صرف کراچی کے بلکہ پاکستان کے دوسرے علاقوں میں بسنے والے اہلِ قلم شعراء اور شاعرات نے بھی کراچی کے پس منظر میں اظہار کیا ہے پاکستان کی کچھ دیگر شاعرات کی طرح ادا جعفری نے بھی کراچی کے دگرگوں حالات

سے متاثر ہو کر اپنے احساسات و جذبات کا اظہار کیا ہے۔

اب یہ کس سے کہیں
پھول کی پتیاں نوچ کر
آندھی کی گلیوں میں بچھا دی گئیں
میرے شہرِ محبت کے سب بام و در
دہشت و خوف کی دھول سے اٹ گئے
نفرتوں کی دہکتی ہوئی آگ میں
نسل در نسل کے خواب جلتے رہے
اور نہ جانے کسی کو خبر بھی ہوئی یا نہیں؟

شہر قائد کے نام

ادا جعفری

ادا جعفری بنیادی طور پر نظم کی شاعرہ ہیں ان کی نظمیں سیاسی اور معاشرتی شعور کی آئینہ دار ہیں۔ ڈاکٹر رشید امجد کے لفظوں میں۔

''ادا جعفری کی نظموں کی بڑی تعداد متنوع۔ موضوعات احساسات اور رویوں کی نمائندہ ہے۔ حب وطن سے لیکر انسان کے ازلی و ابدی مسائل اور کائناتی وسعتوں کو چھونے کی تمنا۔ چھوٹے بڑے دکھ۔ مختلف احساسات۔ جذبے اور فکر میں گندھ کر فنی خوبصورتیوں سے آراستہ ہو کر شعر میں ڈھلتے ہیں تو ادا جعفری کی شاعرانہ عظمت اور انفرادیت کو نمایاں کرتے ہیں ان کی نظم ''سلسلے'' میں انسانی رشتوں کے حوالے سے اقوام عالم کی چھوڑی ہوئی تہذیبی۔ فکری علمی اور فنی میراث پر بنی نوع انسان کا یکساں حق جس حسن و خوبی سے نبھایا ہے اس کی مثال بہت کم

ملتی ہے۔

عالمی سطح پر سوچ کا یہی وہ لہجہ ہے جو ادا جعفری کا رشتہ روئے زمین پر پھیلی ہوئی انسانیت سے جوڑ دیتا ہے اور انہیں انسان کی اجتماعی آرزوؤں اور ولولوں کا بے باک ترجمان بنا دیتا ہے۔''

ادا جعفری ترقی پسندانہ رجحانات رکھتی ہیں۔ گزشتہ پانچ دہائیوں کے شعری سرمایہ میں ان کا نام اور کلام سب سے الگ اپنا انفرادی ذائقہ رکھتا ہے ان کے مجموعہ ہائے شعری میں ان کی شاعری مسلسل ارتقاء اور ترقی کا واضح پتہ دیتی ہے۔ ان کی شاعری، ان کی بیشتر نظمیں بہترین اظہارِ خیال کی مظہر ہیں، ان کے کلام میں ان کانٹوں کی نوک صاف نظر آرہی ہے جو دلوں میں کھٹک رہے ہیں۔

''جوہی کی کلیاں''۔ ''جھیل''۔ ''صبح بنارس۔'' بہار کا راگ'' اور ایسی متعدد نظموں میں ادا جعفری نے اپنے ساز کے تار کو انگلی لگائی ہے جس سے ایک غمگین نغمہ اُبھرتا ہے۔ بہت مدھم۔

ہاں ابرِ سیہ، انجم رخشندہ پہ چھا جا
آنکھوں تلے پھرنے لگے ماضی کے نظارے
تاروں کی طرح میرے تصور میں ہیں روشن
وہ لمحے جو فردوسِ محبت میں گزارے
کیا بھول گئے ہیں وہ محبت کی کہانی
کیا یاد انہیں اب نہیں جمنا کے کنارے
میرے مہ تاباں سے ادا کون یہ پوچھے
تنہا کوئی کب تک شبِ مہتاب گزارے

''یادِ ماضی''

(میں ساز ڈھونڈتی رہی)

ادا جعفری کی نظم کا ایک یہ رنگ بھی ملاحظہ ہو۔ وہ کہتی ہیں۔

یہ مرے دل میں خیال آتا ہے
زندگی کیوں فقط اک آہِ مسلسل ہی رہے
کیوں نہ بیدار کروں وہ نغمے
وقت بھی سن کے جنہیں تھم جائے
رہگزاروں میں یہ بہتا ہوا خون
موت کے سائے تلے سسکیاں بھرتی ہے حیات
اس اُمڈتے ہوئے طوفان سے کنارا کر لوں
یہ سسکتی ہوئی لاشیں یہ حیاتِ مردہ
یہ جبینیں جنہیں سجدوں سے نہیں ہے فرصت
یہ امنگیں جنہیں فاقوں نے کچل ڈالا ہے
یہ بلکتی ہوئی روحیں، یہ تڑپتے ہوئے دل
یہ ترستی ہوئی نظریں، یہ ڈھلکتے ہوئے اشک
ان ڈھلکتے ہوئے اشکوں کو چُرا کر میں بھی
اپنے ایوانِ تصوّر میں چراغاں کر لوں

شاعرہ نے جو کچھ بھی اس رنگ میں کہا ہے اس میں قدیم اور فرسودہ نظام زندگی کے خلاف بغاوت کا ایک بے پناہ جذبہ کارفرما ہے ان کی آواز سراپا طلب اور

احتجاج ہے۔ان کے اندازبیان سے ایک ایسی قوتِ ارادی مترشح ہے جس کے بغیر جدید اَدب کے کسی معمار کا پیام موٴثر نہیں ہو سکتا۔

دورِ جدید کی اہم اور منفرد شاعرات کا مُحاکمہ کیا جائے تو ادا جعفری کا نام اور کلام نمایاں ہے

چنانچہ اس حوالے سے ادا جعفری کو جدید اردو شاعری کی خاتونِ اوّل کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ انہوں نے پہلی بغاوت کرتے ہوئے روایتِ کہنہ اور اردو غزل کو نسوانی سوچ اور نسوانی طرزِ احساس کے لیئے کامیابی سے استعمال کیا۔ غزل میں ادا جعفری کا ایک خاص لہجہ متعین ہو چکا ہے جو غزل کی روایت کے ساتھ جدید اندازِ شعر گوئی اور لطیف نسوانی احساسات کے خوبصورت امتزاج کا حامل ہے۔ انہوں نے اردو شاعری میں پہلی مرتبہ شاعرہ کی حیثیت سے غزل میں صیغہ تانیث کا استعمال کرتے ہوئے نہایت جرأت سے اپنے جذبے اور وارداتِ قلبی کا اظہار کیا۔

تم پاس نہیں ہو تو عجب حال ہے دل کا.
یوں جیسے میں کچھ رکھ کر کہیں بھول گئی ہوں.

سر کی چادر بھی ہوا میں نہ سنبھالی جائے
اور گھٹا ہے کہ برسنے کا بہانہ چاہے

اُردو شاعری میں اثباتِ زندگی کے مختلف رنگ ملتے ہیں ادا جعفری نے ہماری تہذیبی شائستگی سے اپنی شاعری کا دامن باندھا ہے اور عصری رجحانات کی نقش گری کرتے ہوئے اپنی غزلوں اور نظموں پر دلآویزی کے پرسے اپنے دستخط ثبت کیے ہیں۔ ادا کا اوّلین شعری مجموعہ ''میں ساز ڈھونڈتی رہی'' تھا یہ اپنی نوعیت کا پہلا

شعری اجتہاد تھا جس نے دنیائے اُدب کو چونکا کر رکھ دیا ان کا یہ پہلا مجموعہ کلام ان کی فکری جہتوں اور جرأت اظہار کے مستقبل کی جولانیوں کا پیش خیمہ تھا۔ ادا جعفری کی متعدد شعری تصویروں میں بولنے کی صفت پائی جاتی ہے۔ 1968ء میں ان کا دوسرا مجموعہ کلام ''شہر درد'' طبع ہوا۔ 1974ء میں ''غزالاں تم تو واقف ہو'' اور 1984ء میں ''سازِ سخن بہانہ ہے'' طبع ہوا۔

ادا جعفری کی نظمیں اور غزلیں بدلتی ہوئی عصری حقیقتوں اور موضوعات پر طبع آزمائی کے حوالے سے نئی دلکشی، رعنائی اور ندرتِ فکر لیے ہوئے ہیں۔ ان کی غزل میں ان کے پُر آہنگ لہجے کا انکشاف ان کے اشعار میں ہوتا ہے۔ مثلاً وہ کہتی ہیں۔

ہونٹوں کو مسکرانے کی عادت سی پڑ گئی
دل بھی کہے میں ہوتا تو کیا تھا برا ہمیں

نازِ وفا کا بت بھی ہمیں توڑنا پڑا
لوگو،شکست دل سے بڑا سانحہ ہوا

انجان نگا ہوں کی یہ مانوس سی خوشبو
کچھ یادسا پڑتا ہے کہ پہلے بھی ملے ہیں

یہ اشعار ایسے لہجے۔ ایسی کیفیت اور ایسے فکری اور احساساتی زاویوں کا پتہ دیتے ہیں جو اردو غزلوں کے سرمائے کو زیادہ باثروت بناتے ہیں اور جن کی رنگینی و دلآویزی ادا جعفری سے عبارت ہے۔ ادا جعفری کی غزل میں جگر مرادآبادی کے تغزل کا رنگ بھی کہیں کہیں اس طرح جھلکتا ہے۔

سامنے بے نقاب بیٹھے ہیں
وقعت حسن و مہر و ماہ گئی
اس نے نظریں اٹھا کے دیکھ لیا
عشق کی جرأت نگاہ گئی

ایسی تمام نظمیں جن میں حضرت محمدؐ سے محبت اور عقیدت کا اظہار کیا جائے یا آپ کے محاسن بیان کیے جائیں نعت کی تعریف میں آتی ہیں۔ نعت کا کینوس بہت وسیع ہے تاہم کچھ شاعرات نے دیگر اصنافِ سخن کے علاوہ نعت میں بھی بے پناہ امکانات پیدا کیے ہیں اور اپنے اپنے انداز میں حضور نبی کریمؐ سے عقیدتوں کا اظہار کیا ہے جس میں جذبۂ عقیدت کے ساتھ ساتھ فکری توانائی اور اسلوب کی شگفتگی اور جدید استدلالیت پائی جاتی ہے۔

ادا جعفری کا شمار پاکستان کی بزرگ شاعرات میں ہوتا ہے ان کی نعتیں ان کے طوافِ عقیدت کا سلسلۂ لطیف و جمیل بھی ہے۔

یا سرور کون و مکاں، اے نازش دُنیا و دیں
تمَ ہو حبیبِ کبریا، تمَ ہو دُعائے مرسلیں
ہے سجدہ گاہ قدسیاں یہ آستاں یہ سر زمیں
یا سید روحانیاں
یا رحمتہ للعالمیں

"یا رحمتہ للعالمیں"

(سازِ سخن بہانہ ہے)

ادا جعفری کی نعتوں میں ولولہ تازہ اور جذبہ رندانہ کی رمق موجود ہے اور ان کی نعتوں میں حضورؐ کی ذات سے والہانہ محبت۔ سپردگی اور وارفتگی کا بے ساختہ اظہار ملتا ہے۔

ہر دور کی امید ہیں ہر عہد کا پیماں
پہچان ہے انؐ کی نہ زمیں سے نہ زماں سے

ادا جعفری کے نعتیہ اشعار کا ایک یہ رنگ بھی دیکھئے۔

تریؐ یاد دل کو متاع گرامی
ترا نام لب پر کمال عبادت
چراغاں چراغاں نقوش کف پا
کہیں ماہ تاباں، کہیں مہر طلعت

''ہائیکو''۔ جاپانی صنفِ سخن ہے، تین دہے پہلے ہائیکو ہمارے شعری ادب میں نوارد تھا مگر اس کی ہیئت۔ اسلوب اور اس کے دامن میں کھلے ہوئے نو بہ نو مضامین اور رنگ برنگی پھولوں کو دیکھیں تو یہ نوارد ہمیں ایک ''آشنا اجنبی'' کی طرح دکھائی دیتا ہے اب پچھلے تین عشروں سے یہ صنفِ سخن ہمارے ہاں کئی سخنوروں اور اہلِ ذوق کی توجہ کا مرکز بن رہی ہے۔

ادا جعفری ابتدائی ہائیکو نگار شاعرات کے قافلے کی اہم اور ممتاز رکن ہیں۔ انہوں نے سب سے پہلے ہائیکو پر قلم اٹھایا ابتداء میں انہوں نے وزن کے آہنگ میں اپنا الگ انداز اختیار کیا لیکن بعد میں وہ کراچی کے آہنگ کا تتبع کرنے لگیں ان کے ہائیکو ان دونوں رنگوں اور آہنگوں کی عکاسی کرتے ہیں۔

کس قدر تنہائی تھی
دُور سے آتی ہوئی موہوم سی آواز تھی
دل کو سہارا دے گئی

کھینچ لیتی ہے دل کو
پہاڑوں کی پگڈنڈیوں پر سے آتی
بنفشہ کے پھولوں کی خوشبو

ادا جعفری کے نام سے ان کا شاعری کا جو امیج اُبھرتا ہے وہ ایک ماں کا ہے ان کی شخصیت میں مکمل نرم لہجے، دعاؤں سے لبریز، محبتوں اور اپنی ذات کی قربانیوں کے ساتھ بچوں کی پرورش کرنے والی ماں موجود ہے۔

کلس تک آگئے سائے
پرندے اپنے اپنے آشیانوں کی طرف پلٹے
مرے بچے گھر کب آئیں گے

ہائیکو میں انہوں نے ہائیکو کے مخصوص اوزان ۵+۷+۵ سے انحراف کیا ہے لیکن کتنا خوبصورت۔

دیپک بھی جلا رکھنا
شاید کوئی پردیسی گھر لوٹ کے آ جائے
گجرا بھی بنا رکھنا

اسے تو ہوش ہی نہ تھا
کُھلی ہتھیلیوں پہ جو نصاب ہجر لکھ گیا
کہ وقت کیسے تھم گیا

ادا جعفری نے ہائیکو کے طرز پر کچھ نظمیں بھی لکھی ہیں ان میں انہوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے کام لے کر فکر و فن کے خوبصورت گوشے تلاش کئے ہیں اور ان کی ان نظموں میں فطری جذبے مختلف رنگوں میں ظاہر ہوئے ہیں۔

ابھی تک دُعا کی گھڑی ہے
ہزاروں برس سے ہتھیلی پر حرف تمنا اٹھائے
وہ لڑکی ابھی تک کھڑی ہے

(صدیوں کا سفر)

چاندنی زخم زخم ہے
وہ دُور ہے تو مجھ پہ اب فریب روز و شب کھلا
کہ دھوپ بھی ہے سانولی
(خالی ہاتھ)

ایک آنسو ہی تھا
رات کی جھیل میں اک ستا رہ گرا
کس سے کیا کہہ سکا
(ایک آنسو ہی تھا)

ریت سی برستی ہے
ایک بُوند پانی کو بارشوں کے موسم میں
آنکھ کیوں ترستی ہے
(بارشوں کے موسم میں)

پھر اور کچھ سوچا نہیں
اک ریزہ مہتاب سا چھلکا تھا اس کی آنکھ سے
دل آج تک بھولا نہیں
(اُجالا)

یہ سانحہ کبھو نہ ہو
کہ میں نما زہجر پڑھ سکوں
اور آنکھ با وضو نہ ہو

(کبھونہ ہو)

قیام پاکستان کے بعد اچھی غزل گو اور نظم نگار شاعرات سامنے آنے لگی تھیں جن میں کچھ معروف اور کچھ نسبتاً کم معروف شاعرات شامل ہیں لیکن ان میں سے اکثر نے اپنے نسوانی پن کا اظہار شاعری میں نہیں کیا البتہ زہرہ نگاہ (جو شادی کے بعد زہرہ ماجد علی کہلاتی ہیں) نے اپنے نسوانی تجربات اور اپنے عمومی انسانی تجربات کے درمیان ایک ایسا توازن قائم کیا ہے جو موصوفہ کے کلام میں نیا پن پیدا کرنے کے لئے کافی ہے۔ اور ایسا ہونا بھی چاہئے تھا کیونکہ زہرہ نگاہ منفرد نسوانی لہجے کی ایسی بااعتماد شاعرہ ہیں۔ جنہوں نے خوبصورت تراکیب استعمال کی ہیں۔

ڈاکٹر رشید امجد کے لفظوں میں۔ ''زہرہ نگاہ اپنی شاعری میں گھر کی بنیادوں میں وفا کے رشتوں کی تہذیب کرتی اور رفاقتوں کو نئے معنی پہناتی ہیں۔ رفاقتوں اور محبتوں کے اس سفر میں زہرہ نگاہ کے یہاں روائیتی عورت کے جتنے رُوپ بھی نظر آتے ہیں ان میں ذاتی زندگی کی تلخ و شیریں لمحوں کی آمیزش کے ساتھ ساتھ اس عورت کے وجود کا بھی احساس اُجاگر ہوتا ہے جو اس استحصالی معاشرے کی کڑی دُھوپ تاپتے تاپتے اب کندن بن چکی ہے اور یہ احساس دلا کر کہ۔ ''ہماری شخصیت کے آئینے میں ہمارے عکس سب چٹخے ہوئے ہیں ہمارے جسم کے بوجھل تقاضے، ہماری روح تک گہنا چکے ہیں۔''

رفاقتوں کے اس سفر میں جہاں عورت کے وجود کا احساس ملتا ہے وہاں اس کا وجود مصلحت آشنا بھی ہے۔

ملائم ، گرم سمجھوتے کی چادر
یہ چادر میں نے برسوں میں بُنی ہے
کہیں بھی سچ کے گل بُوٹے نہیں ہیں
کسی بھی جھوٹ کا ٹانکا نہیں ہے
اسی سے میں بھی تن ڈھک لوں گی اپنا
اسی سے تم بھی آسودہ رہوگے
نہ خوش ہوگے نہ پژمردہ رہوگے
اسی کو تان، بن جائے گا گھر
بچھا لیں گے تو کھل اٹھے گا آنگن
اٹھا لیں گے تو گر جائے گی چلمن۔
(سمجھوتہ)

کسی شاعر کے فکر و فن کی تفہیم میں اس شاعر کا مجموعۂ کلام ممد ثابت ہوتا ہے زہرہ نگاہ کے مجموعۂ کلام ''شام کا پہلا تارہ'' سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ زہرہ نگاہ کے اظہار میں ایک سلیقہ اور شائستگی ہے اپنی ہمعصر شاعرات ادا جعفری رابعہ نہاں۔ سیدہ حنا وغیرہ کی طرح زہرہ نگاہ کے یہاں بھی روایت کی پاسداری۔ اظہار کی شائستگی۔ تہذیب اور فنی پختگی کا احساس موجود ہے۔

زہرہ نگاہ کی شاعری ترقی پسند تحریک کی ایک اہم آواز ہے لیکن اپنے تجربے کے اظہار میں فہمیدہ ریاض کی طرح بے باک نہیں۔ پروین شاکر کی طرح ایمائی ہیں۔ لیکن ان کے کلام میں ایک ایسی گہرائی اور تازگی ہے جو شاعرہ موصوفہ کی نسوانی شخصیت کا سرمایہ کہی جاسکتی ہے مثال کے طور پر وہ کہتی ہے۔

میرے بچے ہزار بار میں نے تم کو ایک قصہ سنایا

کبھی لوری کے آنچل میں
کبھی بانہوں کے جھولے میں تمہیں بہلا کے لپٹا کے سلایا
تمہارے گرم رخساروں کو اپنے سرد ہونٹوں سے چھوا ہے

تم سے اک وعدہ کیا ہے
وہی وعدہ جو انسانوں کی تقدیروں میں لکھا ہے
تحفظ کا، تمہاری آبرو کی سر بلندی کا۔

اور یہی وعدہ ہے جو آج تک انسانی سماج سے عورت کا تقاضا ہے اور انسانی سماج سے یہ تحفظ۔ یہ آرزو مندی۔ استحصالی نظام میں ممکن نہیں، تاہم یہاں یہ کہنا غیر مناسب نہ ہو گا کہ کسی نظم کو اچھا سمجھنا یا اچھا نہ سمجھنا زیادہ تر ایک اضافی امر ہے جو نظم اضافی طور پر بہت سے لوگوں کو پسند آتی ہے وہ عام طور پر اچھی سمجھی جاتی ہے محض اقدار کی نمود پر کسی نظم کو اچھا یا بُرا اقرار دینا ذرا مشکل ہے صرف یہی ضروری نہیں کہ کوئی قدر شاعر اور ناظر کے درمیان مشترک ہو بلکہ یہ بھی لازم ہے کہ وہ قدر نظم کے جذبے اور رنگ میں رچ کے نمودار ہوئی ہو۔

زہرہ نگاہ کی نظموں میں نئے اور ترقی پسندانہ رویوں کے خد و خال ملتے ہیں اور ان کے لہجہ میں تمکنت بھی ہے اور وہ ان اولین شاعرات میں سے ہیں جن کے یہاں عورت کا خالص طرزِ احساس اُبھرا ہے ان کا تعلق شاعرات کی اس نسل سے ہے جو ماضی میں مشاعروں پر چھائی ہوئی تھی اور تب تقسیم وطن کے دنوں میں وہ خوبصورت غزلیں کہنے اور مشاعرے لوٹنے والی شاعرہ کہلاتی تھیں۔

ڈاکٹر رشید امجد کے مطابق۔ ''غزل کی روایت۔ تکنیک اور مستند تلازمات اور استعارات کے ساتھ اگرچہ ایک خاص طرح کی فضا خود بخود جنم لیتی ہے لیکن زہرہ

نگاہ نے اپنے نسائی طرزِ احساس اور طرزِ فکر سے اپنی انفرادیت کی راہ نکالی ہے۔ اپنی ہمعصر شاعرات کی طرح انھوں نے اپنا سفر کچے جذبات اور نو عمری کے ناپختہ۔ کچے پکے خیالات سے شروع نہیں کیا نہ ہی جسم کی ضرورتوں اور اشتہا کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا۔ منفرد لب ولہجہ کی مترنم شاعرہ نے نسائی جذبات کو سچائی اور اعتماد سے دلکش شعروں کے رُوپ میں ڈھالا ہے، زہرہ نگاہ کے نسائی جذبات کے اظہار کے سلسلہ میں ان کی ایک غزل ملاحظہ ہو۔

اپنا ہر انداز آنکھوں کو تر و تازہ لگا
اتنے دن کے بعد مجھ کو آئینہ اچھا لگا

سارا آرائش کا ساماں میز پر سوتا رہا
اور چہرہ جھلملاتا ، جاگتا ہنستا لگا

کیسے ہر کونے میں دیواروں کے چہرے کھل اُٹھے
کیسا ہر کونا مجھے کہتا لگا ، سنتا لگا

ملگجے کپڑوں پہ اُس دن کس غضب کی آب تھی
سارے گھر کا کام اُس دن کس قدر ہلکا لگا

چال پر پھر سے نمایاں تھا دلاویزی کا نقش
جس کو واپس آتے آتے کس قدر عرصہ لگا

میں تو اپنے آپ کو اس دن بہت اچھی لگی
وہ جو تھک کر دیر سے آیا اسے کیسا لگا

فیض احمد فیض کے لفظوں میں۔ ''اس دور کی شاعری میں آپ بیتی کے خون جگر کی نمود اور جگ بیتی کی پرچھائیوں کا وجود روایت اور ایجاد دونوں کے تلازمے کچھ اس صناعی سے یکجا ہوئے ہیں کہ اگر زہرہ، اسی پر اکتفا کر لیتیں جب بھی جریدۂ سخن پر ان کا نقش یقیناً دوام حاصل کر لیتا لیکن اب تو انہوں نے ستاروں بھرے شہر کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے اور اس رنگ کو تج کر ایک بالکل نیا اسلوب اختیار کیا اور اس کی طاقت سے اپنے موضوعِ سخن میں بھی بہت کچھ ترمیم کر لی ہے اس کلام میں روزمرہ کی زندگی کے جذباتی معاملات بھی ہیں جنہیں زہرہ نگاہ، صدف نازک کی شاعری کہتی ہیں جیسے ملائم گرم سمجھوتے کی چادر۔ قصیدہ۔ بہار۔ نیا گھر۔ علی اور نعمان کے نام۔ سیاسی واقعات کے تاثرات بھی، وہ وعدہ بھی جو کہ انسانوں کی تقدیروں میں لکھا ہے اور محض تغزل بھی ان منظومات میں نہ جدیدیت کے غیر شاعرانہ جذبات کا کوئی پرتو ہے۔ روائیتی نقش و نگار اور آرائشی رنگ و روغن کا سہارا لیے بغیر دل کو لگتا ہوا شعر کہنا بہت دل گردے کا کام ہے۔''

حکایت غم دُنیا طویل تھی کہہ دی
حکایت غم دل مختصر ہے کیا کہئے

رُک جا ہجوم گل کہ ابھی حوصلہ نہیں
دل سے خیال تنگئی داماں گیا نہیں

زہرہ نگاہ نے غزل میں جو انفرادیت کا رنگ پیدا کیا ہے وہ بڑی عمدگی کا حامل ہے ان کی غزلوں میں خوش سلیقگی۔ آہنگ کا تنوع اور غزلیہ لہجہ کی بازگشت سے ان کے شاعرانہ تفکر اور تخیل۔ شعری روّیہ کے اثرات سے ہمیں خصوصاً متوجہ کرتی ہیں

جس نے ہمیں ہنس کر دیکھا تھا
وہ پہلا دوست ہمارا تھا
وہ شام کا پہلا تارہ تھا
جو شاید ہم دونوں کے لیے
کچھ وقت سے پہلے نکلا تھا
جس نے ہمیں دُکھ سے دیکھا تھا
وہ پہلا دوست ہمارا تھا
وہ شام کا پہلا تارہ تھا

ڈاکٹر رشید امجد کے لفظوں میں۔ " نظم کی طرح زہرہ نگاہ کی غزل بھی ایک نفاست اور سلیقہ سے مزین ہے لیکن روایت کے قریب ہونے اور کلاسیکی اثر کی وجہ سے ان کے یہاں نسائی لہجہ نہیں اُبھر تا بلکہ غزل کی ایک عمومی کیفیت برقرار رہتی ہے اور صغیہ مذکر بھی قائم رہتا ہے۔

نہیں نہیں ہمیں اب تری جستجو بھی نہیں
تجھے بھی بھول گئے ہم تری خوشی کے لیئے

کلی اداس، چمن سوگوار گل خاموش
یہ انتظار بہاراں ہے دیکھئے کیا ہو

پاکستانی نظم کی روایت کو آگے بڑھانے والی پاکستانی شاعرات کا قابلِ تعریف حصہ رہا ہے اور پاکستان کے پچاس سالہ ادبی سفر میں اُردو شاعری کی ایک وجہِ تخصیص یہ بھی بنتی ہے کہ اس دور نے اُردو ادب کو کئی جرأت مند شاعرات دیں جن کے نام شاعرات کے جمگھٹے میں نمایاں ہیں اور ان شاعرات میں سے کچھ شاعرات نے تو سخنوری کی زبردست رچاؤ سے اُردو شاعری کے کینوس کو وسیع تر کیا چنانچہ یہ امر واضح ہے کہ جدید نظم کی شاعرات میں فہمیدہ ریاض۔ کشور ناہید۔ منصورہ احمد۔ ناہید قاسمی اور بلقیس محمود کی نظمیں خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

پاکستان میں شاعرات کا کوئی شمار نہیں لیکن آوازوں کے اس گھنے جنگل میں دیگر شاعرات کی ان آوازوں میں نرم اور گداز اور سُریلی آوازیں بھی تارِ رگِ سنگ کی مانند پھیلی ہوئی ہیں۔ فہمیدہ ریاض کی آواز بھی کم سُریلی نہیں ہے۔

فہمیدہ ریاض 1934ء میں پیدا ہوئیں، آپ غزل اور نظم کی شاعرہ ہیں ان کی نظمیں رومانی بھی ہیں اور سیاسی بھی۔ ان کی دونوں قسم کی نظموں میں رعنائی اور توانائی پائی جاتی ہے لیکن ان کی شاعری ردِ عمل کی شاعری ہے اور اس میں وہ انتہا تک پہنچ چکی ہیں۔ شاعرہ موصوفہ ایک خود آگاہ اور جہاں آگاہ شاعرہ ہیں۔ شاعری میں ان کے تجربوں کا سلسلہ بے حد وسیع ہے۔

بیسویں صدی کی عورت کی اُلجھنیں اس کی محرومیاں اور کامیابیاں بھی فہمیدہ ریاض کی نظموں میں نمایاں نظر آتی ہیں۔ وہ بے باک۔ جرأت مند اور کھلے ذہن کی خاتون ہیں انہوں نے بہت بلند اور خوبصورت نظمیں تخلیق کی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے عورت کے تجربات کی سچائیوں کو انتہائی بے باک اظہار سے مربوط کر کے بہت سے ان

لکھے اور اُن کے جذبوں کے حوالے سے ایک ایسی فضا مرتب کر دی جس میں عورت ایک سراپا احتجاج بن کر اُبھری ، فہمیدہ ریاض کے یہاں جسم کی پکار خاص نمایاں اور بلند آہنگی کے ساتھ سُنائی دیتی ہے اس سے ان کے یہاں ایک طرح کی انفرادیت پیدا ہوئی ہے۔ عورت کے منہ سے اپنے جذبوں کا اظہار چونکانے والا بھی ہے اور خاصا نیا بھی۔

فہمیدہ ریاض کی نظموں میں عورت کے جنسی رویئے بڑے نمایاں ہیں لیکن فہمیدہ اور پروین شاکر میں ایک قدرِ مشترک یہ ہے کہ دونوں کی نظموں میں ابلاغ کا مسئلہ نہیں ہوتا۔

تقسیم وطن کے بعد۔ جدید دور کی شاعرات میں ایک نمایاں رجحان نسوانی جذبات واحساسات کا اظہار بھی ہے۔ فہمیدہ ریاض کا اسلوب نیا لیکن پُر کشش ہے ان کے اسلوب میں بڑی دلکشی ہے۔ پاکستانی شاعرات میں انہیں منفرد حیثیت حاصل ہے ان کی نظمیں اور ان کے اشعار جذبے کی شدت اور خوبصورت تشبیہوں کے باعث فوری طور پر قاری اور سامع کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ تاہم فہمیدہ ریاض کی نظموں کے بعض موضوعات پر چند لوگوں کو کچھ اعتراض ہے ان کے خیال میں یہ فحش ہیں یا چونکانے کے لیے لکھی گئی ہیں۔ لیکن فہمیدہ ریاض نے ادبی پنڈتوں کی مخالفت کو درخورِ اعتنانہ سمجھا اور جدید تر نظم کے لیے فضا ہموار کرنے کے لیے مستقل مزاجی سے اجتہاد میں مصروف رہیں۔ انہوں نے احساس دلایا کہ وصال کی طلب صرف مَرد میں نہیں عورت میں بھی ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنی ذات کے حوالے سے اہم نفسیاتی اُلجھاؤ کی تشریح کرتے ہوئے زندگی پر اس الجھاؤ کے اثرات کا تجزیہ کیا ہے ان کی روح کا کرب شدید نوعیت کا ہے۔ ان کے لب ولہجے میں خلش۔ سوز۔ یاسیت اور نغمگی کی وحدت سے ایک ہمہ رنگ شعری کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔

فہمیدہ ریاض نے عورت کی جنسی اور نفسیاتی پہلوؤں پر خصوصی توجہ دی اور اپنی نظموں میں بڑی بے باکی سے ان موضوعات کو شامل کیا جو اس سے قبل شجر

ممنوعہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ ''بھیگی کالی رات کی بیٹی''، ''بدن دریدہ''، ''وصل اک کرن بن کر''، ''ابد''، ''زبان کا بوسہ''، ''نذر فراق'' یہ نظمیں خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ فہمیدہ کی نظموں میں پہلی بار عورت کے حوالے سے جو تصویر اُبھرتی ہے وہ واضح بھی ہے اور درد انگیز بھی اور موثر بھی لیکن اس میں فحاشی اور ابتذال نہیں ہے۔

''بدن دریدہ'' کی نظمیں بے راہ روی کی تبلیغ سے کوئی علاقہ نہیں رکھتیں۔ اس مجموعہ کی نظمیں چونکانے والے عمل کا مظہر نہیں ہیں۔ ان نظموں میں ایک مظلوم و شکست خوردہ وجود، دیواروں سے سر ٹکرا کر خود سے ہمکلام ہوا ہے اور خود کلامی کے اس ڈرامائی عمل کی مدد سے وہ دوسروں کو اپنے اس۔ کرب کی اطلاع دیتا ہے جس سے وہ دوچار ہے۔ مثلاً فہمیدہ ریاض کی نظم ''میگھ دوت'' کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

میں بنت ہجر ہوں
مجھ میں ایسی آگ ہے
میں کہ میرے واسطے
وطن بھی فراق ہے
میری ایسی پیاس ہے
میگھ رس میں بھیگ کر
ہانپتی کھڑی کھڑی
کہہ رہا ہے دل مرا

یہی
ہے
مدھر ملن کی گھڑی

میگھ دوت
(بدن دریدہ)

یہ تشنگی کی کمی نہیں بلکہ وفور کی پیدا کردہ ہے۔ فہمیدہ ریاض کے یہاں جرأت اور بے باکی ضرور ہے لیکن اسے انھوں نے فن کے حوالے سے ایک شائستہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ''پتھر کی زبان'' (مطبوعہ ۱۹۶۷ء) فہمیدہ ریاض کا پہلا شعری مجموعہ تھا جس نے انھیں خاصا متنازع بنادیا۔ اس مجموعہ کا لہجہ باغیانہ تھا لیکن یہ موضوعات کا تقاضہ تھا۔ ''پتھر کی زبان'' کی گویائی بدن اور جذبوں کی آسودگی کا اظہار نہیں بلکہ سماجی جبر و خوف، واہموں، مصلحتوں اور یاس سے لیکر آزاد فضا میں سانس لینے کی خواہش ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد کے مطابق فہمیدہ ریاض کے دوسرے مجموعۂ کلام ''بدن دریدہ'' میں بھی نظموں کی تعداد بہت ہی زیادہ ہیں۔ شاعرہ کے بعد کے مجموعوں ''دھوپ''، ''کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے''، ''ہم رکاب'' میں ان کا موضوعاتی دائرہ بہت وسیع ہو جاتا ہے۔ 1977ء کے مارشل لاء کے بعد ان کی شاعری میں ایک بڑی تبدیلی آئی اور انھوں نے سیاسی، سماجی جبر کے خلاف آواز بلند کی اس دور کی شاعری میں موضوعات ہی تبدیل نہیں ہوئے بلکہ مجموعی رویوں میں بھی ایک تبدیلی کا احساس ہوتا ہے اور جذبات و احساسات کی بجائے مزاحمت کا رنگ غالب آجاتا ہے اس سے ان کے استعاراتی انداز پہ بھی اثر پڑا ہے تلازمات و استعارات کی تبدیلی سے ان کی بے باکی ایک طرح کے باغیانہ رویے میں تبدیل ہوئی ہے والہانہ پن کی بجائے تدبر اور فکر نے لے لی۔

بلند سر بے کسوں کی حرمت
یہی تو تھی جسم و جاں کی قیمت
متاع انمول ہاتھ آئی
لپٹ کے دامن سے ساتھ آئی
وہی گھٹی آہ چیخ بن کر ضمیرِ عالم ٹٹولتی ہے
بہت نمک خوار مضطرب ہیں کہ برملا راز کھولتی ہے
یہ غیرت خاک ہے
کہ جو میرے نطق میں ڈھل کے بولتی ہے

(مغرور)

رات آتی ہے
وقت کے لب پہ دزدیدہ آہ کی مانند
اور دن کا آنسو بے اختیار
آ سمان کے رُخسار پر ڈھلک جاتا ہے
میرے وطن کا افق کس قدر افسردہ ہے

(کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے)

ہمارے ہاں جو نئے تجربے ہو رہے ہیں جو نئی لفظیات وضع کی جا رہی ہیں اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ عصر حاضر کی شاعرات کو اس حقیقت کا پوری طرح ادراک ہے کہ ان کی غزل میں نیا پن بھی ہے اور نئی نسل کی شاعرات ہوتے ہوئے وہ

اپنے تخلیقی عمل کو نئے تجربوں اور نئی لفظیات سے ہم آہنگ بھی کرتی ہیں اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہے کہ ہماری شاعری میں ثقافتی اور تہذیبی حوالے تو ہمیشہ سے موجود رہے ہیں تاہم عہدِ موجود کی غزل میں ان کی ہیئت بڑی حد تک بدل گئی ہے اب یہ حوالے عصری صورتِ حال کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے علامتوں اور استعاروں کی شکل میں سامنے آرہے ہیں اُردو میں جدید ترین غزل کے میدان میں جو مختلف نوعیت کے تجربے کئے جارہے ہیں آج کی ہمعصر شاعرات نے قارئین اور سامعین دونوں کو اپنی جانب متوجہ کیا ہے ان میں فہمیدہ ریاض۔ کشور ناہید اور پروین شاکر کے بعد نوشی گیلانی۔ فاطمہ حسن۔ منصورہ احمد۔ شبنم شکیل۔ یاسمین حمید۔ غزالہ خاکوانی کے علاوہ ناصرہ زبیری وغیرہ خاص طور پر اہم اور قابلِ ذکر ہیں۔

فہمیدہ ریاض بنیادی طور پر نظم کی شاعرہ ہیں ان کے جملہ شعری مجموعوں میں نظموں کی تعداد زیادہ ہے انہوں نے اپنی نظموں میں بے باک اظہار کے سہارے سے عورت اور انسان پر ہونے والے مظالم کی کھل کر عکاسی کی ہے۔ "پتھر کی زبان" ، "بدن دریدہ" اور "دھوپ" میں بہت سی ایسی نظمیں ہیں جو عہد جدید میں عورت کی آزادی اور انسانی عظمت کی بحالی کا منشور بن گئی ہیں تاہم ان کی غزلوں میں ایک فکری اور جمالیاتی نظام موجود ہے اور ان کی غزلیں ان کے بلند فنی معیار کو چھوتی ہیں اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کی مظہر ہیں۔ فہمیدہ ریاض کے شعروں کے انتخاب سے ان کی غزلوں کے رنگ وآہنگ کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

سراب ہوں میں تری پیاس کیا بجھاؤں گی
اس اشتیاق سے تشنہ زباں قریب نہ لا

کبھی دھنک سی اُترتی تھی ان نگاہوں میں
وہ شوخ رنگ بھی دھیمے پڑے ہواوں میں

اک طفلک جستجو ہوں شاید
میں اپنے بدن سے کھیلتی ہوں

فہمیدہ ریاض کی شاعری کا اظہار ان کی ہمعصر شاعرات کے مقابلے میں بہت مختلف اظہار ہے۔ ان کے یہاں نسائی لہجہ زیادہ نرمل طریقے سے آیا ہے اور جذبوں کے اظہار میں فطری پن ہے۔

پھر وہی کیف خواب تھا' پھر وہی زہر کی مہک
اک سیاہ ناگ سا دل پہ تمام شب پھرا

سراب ہوں کہ بدن کی یہی شہادت ہے
ہر ایک عضو میں بہتا ہے ریت کا دریا

فہمیدہ ریاض کی یہ روایت شکنی اس حد تک آگے بڑھی کہ بعض دوسری شاعرات نے بھی اس رنگ میں نظمیں لکھنی شروع کر دیں، ان میں کشور ناہید۔ عذرا عباس۔ پروین شاکر۔ ڈاکٹر غزالہ خاکوانی۔ نوشی گیلانی۔ ناصرہ زبیری اور یاسمین حبیب کے نام نمایاں ہیں۔ فہمیدہ ریاض کے علاوہ باقی شاعرات نے اپنی نظموں کو زیادہ بے اعتدال ہونے نہیں دیا ہے۔ لیکن فہمیدہ ریاض اور کشور ناہید نے شاعری میں ایک بڑی تبدیلی پیدا کی، انہوں نے پہلی بار اپنی شاعری میں عورتوں پر معاشرتی جبر

اور خاص طور پر عورتوں پر مردوں کے تشدد پر لکھا اور بڑے بھر پور انداز میں عورتوں کے حقوق کی ترجمانی کی۔ اس جبر کے نتیجے میں عورتوں میں بگاڑ یا غربت کے سبب بے راہ روی پیدا ہوئی اسے بھی اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے مگر یہ دونوں اتنی بے باکی سے اظہار کرتی ہیں کہ ان سے عورت کی شگفتگی کو ذرا ٹھیس بھی لگتی ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر کے لفظوں میں۔ ''بے نام مسافت'' (مطبوعہ۔ 1971ء) میں کشور ناہید نظموں میں اپنی نسوانیت اور اس کے حوالے سے پاکستانی عورت کی سائیکی کو ایکسپلور کرتی محسوس ہوتی ہے۔ جذباتی گھٹن تشنگی اور ان سب کے نتیجے میں تناؤ سے چٹختے اعصاب نے ''بے نام مسافت'' کے شعری سفر کے عنوانات مہیا کئے ہیں یہ مجموعہ کشور ناہید کی شخصیت کی نفسی اساس مہیا کرتا ہے۔''

لیکن کشور ناہید اپنی نظم اور غزل کے پس منظر میں ترقی پسند نقطۂ نظر کی شاعرہ ہیں۔ ان کی شاعری میں صوتی آہنگ کی تاثیر کا احساس نمایاں ہے۔ سچائی کی تلخ حقیقت کو شعری پیکر دینا خاصی مہارت چاہتا ہے جبکہ کشور ناہید کو یہ ہنر شروع سے آتا ہے۔ ان کی ایک نظم کا آخری ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

دروازہ جو اندھی، آندھی کھول گئی ہے
بند اسے اب کون کرے گا
میں تو تنکے کی صورت لرزیدہ ہوں
دہشت کی کونپل، اب جھاڑی بن کے
مری چوکھٹ پر اگ آئی ہے

ڈاکٹر رشید امجد کے خیال میں۔ ''اس کی ابتدائی شاعری میں جنسی تموّج اور خوابناک تصور، پسندیدہ موضوع رہے ہیں لیکن اس دور میں بھی اس رومان کے پس

پر دہ ایک سر کش عورت کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں اور ایک ٹھہراؤ کے پیچھے چھپے اضطراب کا احساس ہو تا ہے۔"

کشور ناہید کی طرف دیکھیں تو مختلف انداز ملتے ہیں۔ "بے نام مسافت" کی پہلی نظم "عروسی" ہے جبکہ "گلیاں"۔ "دھوپ دروازے"۔ (مطبوعہ۔1978ء) میں ایک نظم ہے "رات آتی ہے" یہ دونوں نظمیں اکٹھی پڑھیں تو آج کی عورت کی تشنگی اور محرومیت کی تصویر مکمل ہو جاتی ہے

کلی کو پاکیزگی کا جوبن کہا کسی نے
تو خود فریبی کے خول میں
یوں سمٹ گئی وہ
کہ پُھول بن کر بکھر گئی وہ
(آخری وار)

یہ سب رشتے
کچے رنگوں کے کچے دھاگے ہیں
سب پتھر ہیں
اُن کے اُو پر چلو تو بھی لہو لہان
ان کو سہو تو بھی لہو لہان
پراپنے لیے جینا کیوں ممکن نہیں
میری بنّو
سورج مُکھی کی طرح
گھر کے حاکم کی رضا پر

گردن گھماتے گھماتے

میری ریڑھ کی ہڈی چٹخ گئی ہے

جسم کا سارا بوجھ سہنے والی ہڈی چٹخ گئی ہے

(جاروب کش)

الغرض اپنی ان نظموں میں کشور ناہید نے مزید گہرائی میں جا کر عورت کی سائیکی کے پُر اسرار نہاں خانوں میں جھانک کر وہاں سے اپنے لیئے تخلیقی محرک حاصل کیا اور ہمیں یہ احساس دِلایا کہ آج کی عورت کتنی باشعور ہے خصوصاً کشور ناہید۔ فہمیدہ ریاض اور پروین شاکر کی نظمیں نسوانی جذبات کے اظہار کے ساتھ ساتھ سیاسی۔ سماجی۔ معاشرتی اور تہذیبی شعور کی عکاسی ہیں۔

1970ء کی دہائی اور اس کے بعد کی شاعرات کی ایک طویل تعداد ہے جنہوں نے مختلف جہتوں اور مختلف سطحوں پر اُردو شاعری کو آگے بڑھایا اور اس کو ایک تخلیقی تازہ کاری سے ہمکنار کیا ان میں فہمیدہ ریاض۔ کشور ناہید۔ شبنم شکیل۔ عرفانہ عزیز۔ منصورہ احمد۔ پروین شاکر۔ عذرا عباس۔ نگہت سلیم۔ نوشی گیلانی۔ ناہید قاسمی۔ ڈاکٹر غزالہ خاکوانی۔ ماہ طلعت زاہدی۔ شمیم نوید اور شاہدہ تبسم اہم نام ہیں۔

ان شاعرات نے اپنے نسائی لہجے کو برقرار رکھتے ہوئے سیاسی۔ سماجی مسائل اور معاشرتی رویوں کو شعر کا موضوع بنایا ہے۔ خواتین شعراء کے یہاں جس نئے پن اور نئے شعور کا احساس ہوا ہے اس کا تعلق معاشرے میں عورت کی بدلتی ہوئی حیثیت سے ہے۔

کشور ناہید۔ 1940ء میں بلند شہر (یوپی بھارت) میں پیدا ہوئیں لیکن تقسیم کے بعد اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان آگئیں قیام پاکستان کے بعد جدید نظم گو شاعرات کی جو تازہ دم کھیپ سامنے آئی اس میں کشور ناہید، اُردو نظم کی ایک معتبر

شاعرہ کی حیثیت سے ایک جداگانہ شناخت رکھتی ہے اس نے جو شعری رُوپ اختیار کیا ہے بلا مبالغہ وہ منفرد اور عصری تقاضوں کا آئینہ دار ہے اور عہدِ موجود کے شعراء سے مختلف بھی ہے وہ نئی شاعری کی تحریک میں اہم رکن کی حیثیت سے اپنا بھرپور کردار ادا کر رہی ہے چنانچہ کشور ناہید کو ایک رجحان ساز شاعرہ قرار دیا جا سکتا ہے کشور ناہید اپنی بیشتر نظموں میں عورت کی خواہشات اور مسائل کو موضوع بناتی ہے اُس نے عورت کو بڑے کینوس میں دیکھا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کا شعری مجموعہ ''ملامتوں کے درمیان'' (مطبوعہ۔1981ء) زندگی کی کھوج با معنی کھوج ہے

اس کی شاعری میں عورت کی دلی دلی حسی زندگی کے علاوہ محبّت۔ فرقت اور وصال کی گھمبیر اور گداز کیفیتیں بھی کبھی عاشق اور کبھی معشوق کے پیرہن میں نظر آتی ہیں۔ شاعرہ موصوفہ نے اس حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے کہ محبّت۔ عورت کی صرف روح کو بیدار نہیں کرتی جسم کو بھی بیدار کرتی ہے جس بے انصافی اور ظلم کا شکار ہے وہ در حقیقت ہمارے موجودہ سماجی اور سیاسی استحصالی نظام ہی کا ایک رُخ ہے۔

کشور ناہید نے چار دیواری سے نکل کر زندگی سے آنکھیں چار کی ہیں۔ اس کی سیاسی نظمیں بھی توجہ طلب ہیں۔ یوں تو اس کی ساری شاعری کی زیریں لہر سیاسی ہے اس لیئے کہ عورت کی بغاوت اپنے سماجی ڈھانچے کی بنیادوں کو بدلنے کی للکار ہے مگر صرف سیاسی موضوع پر اس نے نظمیں لکھی ہیں اس کی نظم۔ ''دفعہ ۱۴۴'' ہو کہ ''تقریر ۲۷'' ۔ استحصالی نظام کے لیڈروں پر بھرپور طنز ہے ۔ نظم ''دفعہ ۱۴۴'' ۔انگریز کی قانونی جبریت کا اعلانیہ تھا اور آج ہمارے حکمران طبقے کی بیک اوز تلوار بھی ہے۔ نظم اگر نعرہ یا ایک چیخ ہوتی تو میں اس کا ذکر نہ کرتا مگر یہ سیاسی ہوتے ہوئے بھی ہمارے ماحول کی بزدلی کو عریاں کرتی ہے۔

ہم اندھے پن کے متلاشی ہیں
یہاں تمیز کی دریں غائب ہو جاتی ہیں
اور ہم صرف لمس بن کر رہ جاتے ہیں
لمس جو معذرت اور التجا کا آئینہ ہے

باقر مہدی کے لفظوں میں۔

''کشور ناہید نے نظم کو اپنے اظہار کے لیے اولیّت کا درجہ دیا ہے مگر غزل کو صرف نظر انداز ہی نہیں کیا ہے بلکہ اس صدفِ سخن میں بھی کسی مشہور غزل گو شاعر سے کم اچھے شعر نہیں ''نکالے'' ہیں اس کی شاعری کا نقطہ آغاز (شاید) غزل ہی ہو گا یہ الگ بات ہے کہ اس کی شاعری کی بنیاد، غزلیہ شاعری سے یقیناً الگ ہے۔''

کشور ناہید نے غزل میں اپنے فن کی جولانی دکھائی ہے، اس کے پہلے شعری مجموعہ ''لب گویا'' کی غزلیں اُردو غزل میں ایک نئے رنگ کے اضافے کی حیثیت کی حامل ہیں، کشور ناہید نے (لب گویا) میں خیال اور جذبے کی ترقی پسندانہ روش کو اختیار کیا اور عمدہ نظمیں اور غزلیں تخلیق کیں اور اپنی نظموں اور غزلوں میں اُردو شاعری کی پُرانی علامتوں اور استعاروں کو نئے تناظر اور نئی عصری صداقتوں کے حوالے سے زیادہ زرخیز اور معنی خیز بنا دیا ہے۔ وہ اپنے مضامین۔ اسالیب۔ آہنگ۔ طرزِ احساس۔ زبان و بیان اور لہجے کے اعتبار سے اپنی ہمعصر شاعرات میں بلا مبالغہ نمایاں مقام پر کھڑی دکھائی دیتی ہے۔ اس کے پہلے شعری مجموعہ ''لب گویا'' سے چند اشعار ملاحظہ ہوں جو غیر معمولی نہ سہی مگر قابلِ توجہ ضرور ہیں۔

کھلونا ٹوٹتا دیکھوں تو آنکھ بھر آئے
ابھی تلک نہیں بُھولی ہے زندگی بچپن
ان گنت لوگوں کی چاہت نے اُسے دُھندلا دیا
وہ کہاں تک اپنی صورت کو بدلتا جائے گا
اب ایک عمر سے دُکھ بھی کوئی نہیں دیتا
وہ لوگ کیا تھے جو آٹھوں پہر رُلاتے تھے

کشور ناہید کی شاعری میں جہاں نسائی جذبوں کی سچائی اور تیکھا پن ہے وہاں ایک سچے انسان کی طرح معاشرے کے تضاد اور تصنع سے نبرد آزمائی کا حوصلہ بھی پایا جاتا ہے۔

میں نظر آؤں ہر اک سمت جدھر سے چاہوں
یہ گواہی میں ہر اک آئینہ گر سے چاہوں
سُوت کے کچے دھاگوں جیسے رشتے پہ اِتراؤں
ساجن ہاتھ بھی چُھولیں تومیں پُھول گلاب بن جاؤں
آنکھ جب تک ہے نظارے کی طلب ہے باقی
تیری خوشبو کو میں کس ذوق نظر سے چاہوں

اُردو کا کوئی بھی شاعر غزل کو رَد نہیں کر سکتا البتہ اپنے مزاج کے مطابق وہ اصنافِ سخن میں ایک کو دوسرے پر فوقیت دیتا ہے۔ کشور ناہید کی شاعری کی بنیاد غزلیہ شاعری سے یقیناً الگ ہے لیکن نظم کی طرح اس کی غزل بھی اپنے مخصوص رنگ کی وجہ سے شاعرات کے انبوہ میں شناخت کی جا سکتی ہے۔

مری ہنسی کے صنوبر سے ڈر گئے وہ لوگ
کہ جن کے دل میں شب زہر کا بسیرا تھا

خوشیاں تھیں بدن میں زینہ زینہ
پوروں کے وصال جیسے دن تھے

ساری رات میں بیٹھی جاگوں، چاند بھی اُٹھ کے دیکھے
پیتم پاس ہے میرے لیکن لمبی تان کے سوئے

تمہیں تو یاد ہے سولہ برس کی وہ ناہیدؔ
نزاکتیں بھی عجب تھیں بدن چھریرا تھا

کشور ناہید نے مسلسل کاوش سے جدید اُردو شاعری میں ایک نئے لہجے کی تشکیل کی ہے لیکن اس نے کلاسیکی لب و لہجہ کو اپنا کر غزل کو ایک نیا رنگ و آہنگ دیا ہے۔ عورت کی جذباتی کش مکش جنسی کشش اور خوف، اظہار کی زبردست خواہش اور ماحول کی جبّریت ہی نہیں کشور ناہید نے غزل میں اپنے حجابات کو بھی حسین تر بنا کر پیش کیا ہے۔

کہتے ہیں میں سوتے سوتے چلتی ہوں
ہنستا دیکھ کے لوگوں کو رو دیتی ہوں
خواہش میرا پیچھا کرتی رہتی ہے
میں کانٹوں کے ہار پروتی رہتی ہوں

جاگتے میں لکڑی کی طرح سُلگتی ہوں
اور سوتے میں چلتی ہوا سے لڑتی ہوں
اپنا نام بھی اب تو بھول گئی ناہیدؔ
کوئی پکارے توحیرت سے تکتی ہوں

زباں پہ لفظ کی آہٹ سے ہونٹ جاگے ہیں
یہی تو ایک نشانی ہے خوں کی حدّت کی

پتھر میں لہو چمک اُٹھے گا
دیوانے کے ہونٹ کاٹنے سے

باقر مہدی نے کشور ناہید کی کلاسیکی غزل کے حوالے سے اس کے اشعار کی مثالوں کے ساتھ مزید اظہار خیال کرتے ہوئے کہا ہے۔ کیا ان اشعار میں دروں بینی ۔ نغمہ ۔ اور فکر خیزی نہیں ہے۔؟ کیا ان میں تاثر نہیں ہے، کیا یہ صرف ''جدید'' ہیں ؟ ان کا غزل کی کلاسیکی روایت سے کوئی تعلق نہیں ہے

قریۂ ضبط میں تنہا ہوں
خواب کے جسم میں تیشہ ہوں میں
بے سبب ہوں ترے گھر میں موجود
کوئی کھویا ہؤا بچّہ ہوں میں

جھانک لو غار ہوں جالوں سے تنا
دیکھ لو طاق تماشہ ہوں میں
ہیں بہت تیرے شناسا لیکن
تیری دہلیز پہ تنہا ہوں میں

یہ اشعار تو بغیر اُردو غزل کے گہرے مطالعے کے کہے ہی نہیں جا سکتے تھے۔
اور ایک نہایت خوبصورت نفسیاتی شعر ہے۔

مزاج اُس کا مرے آنسوؤں سے ملتا تھا
جھلس گئی ہوں مگر پانیوں کے اندر بھی

کیا یہ شعر عورت کی محرومی اور مظلومی کی طویل داستان کو اپنے میں سموئے ہوئے نہیں ہے۔ مگر کتنے انوکھے انداز میں کشور ناہید نے یہ بات کہی ہے کہ سننے والے کو شروع میں یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ کوئی کانٹا چُھو گیا ہے۔ ایک پوری غزل میں وہ عورت کے جذبات کی کشاکش۔ اپنی شناخت اور اپنے زخمی احساسات کو غزل کا لب و لہجہ یوں عطا کرتی ہے کہ ان شعروں کو بار بار پڑھا جا سکتا ہے۔

ستم شناس ہوں لیکن زباں بریدہ ہوں
میں اپنی پیاس کی تصویر بن کے زندہ ہوں
طلب کی زشت نے دیوانگی مُقدر کی
شفق کے رُوپ میں، میں رنگ آبدیدہ ہوں
"زباں بے قرمزی حدت سے میرے سینے کی

میں مثل سنگ چٹخ کے بھی سنگ خوردہ ہُوں
علاج حرف شُنیدہ کا کس سے ہو پائے
ورق ورق ہُوں مگر حسرت رمیدہ ہُوں
شہید جذبوں کی قبریں سجا کے کیا ہو گا
کھنڈر ہُوں، قامت شب ہُوں، بدن دریدہ ہُوں
وہ ماہ وسال کی شاخوں میں چھپ کے دیکھتا ہے
میں آئینے میں اُسے دیکھ کے تپیدہ ہُوں

باقر مہدی کے لفظوں میں۔ ''میں کشور ناہید کا مجموعی جائزہ لیتا ہوں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ ایک ارتقاء پذیر شعری شخصیت رکھتی ہے اور مغربی شاعری سے متاثر ہونے کے باوجود ایک مشرقی عورت کے ذہن و نظر سے سوچتی ہے۔ حالات، ماحول، خیالات و جذبات کو پرکھنے کا ہنر رکھتی ہے جب ہی تو اس کے مجموعے مسلسل رفتار، بلندی اور عمق کا پتہ دیتے ہیں۔''

کشور ناہید بے تحاشہ لکھتی ہے۔ اس کا حافظہ بے حد اچھا ہے۔ کشور ناہید کی کتابوں کی مانگ بہت ہے۔ اس نے عالمی نظموں کے دو انتخاب ترجمہ کیے ہیں جنہیں ''نظمیں'' اور ''باقی ماندہ خواب'' کے دو مختلف عنوانات سے طبع کیا گیا ہے جبکہ کشور ناہید نے ''سیمون دی بوا'' کی مشہور کتاب ''سیکنڈ سیکس'' کا ترجمہ ''عورت'' کے نام سے کیا ہے اور فحش نگاری کے جُرم میں قانون کی زَد میں لائے جانے کی سازشوں کا سامنا بھی کیا ہے۔ اس نے بچوں کے لیے بے شمار کہانیوں کے انتخاب مرتب کئے ہیں۔

کشور ناہید کی کتاب ''عورت خواب اور خاک''، کے درمیان مشرقی عورت کے مسائل پر لکھی جانے والی ایک ایسی کتاب ہے جس پر شاید بڑی

ہنگامہ خیز ثابت ہوں گی۔ فلسطینی مجاہدہ ''لیلےٰ خالد'' کی ڈائری بھی کشور نے ''میرے لوگ زندہ رہیں گے'' کے عنوان سے ترجمہ کی ہے۔

کشور ناہید کی کلیات جو ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے'' فتنہ سامانیٔ دل'' کے عنوان سے طبع ہو چکی ہے۔

ہر تجربہ روایت کے افق میں کچھ نہ کچھ کشادگی ضرور پیدا کرتا ہے نثری نظم نے بھی اُردو ادب کے آفاق کو کشادہ کیا ہے اور نثر کی توسیع کے حوالے سے اسے اب عام طور سے قبول کر لیا گیا ہے۔

کشور ناہید نے ''نثری نظم'' کو بھی باضابطہ ذریعۂ اظہار بنایا ہے اور بڑی خود اعتمادی سے ان ''نثر پاروں'' کو شعر کرنے کی کوشش کی ہے جو ابھی تک ہمارے شعری ادب میں اپنی صنفی حیثیت تلاش کر رہے ہیں۔

کشور ناہید کے شعری مجموعہ ''ملامتوں کے درمیان'' (مطبوعہ۔1981ء) میں غزلوں چند آزاد نظموں اور ایک طویل نظم بطرز مثنوی تین کے قریب نثری نظمیں بھی شامل ہیں اور یہ نثری نظمیں بے حد متاثر کن ہیں ان نظموں میں کشور کے سچے جذبوں کا اظہار ملتا ہے جو بھری پُری عورت کا اظہار ہے۔

''گلیاں دُھوپ دروازے'' کے مقابلے میں اس میں نثری نظمیں اپنے تجرباتی امکانات کے پورے جوہر کے ساتھ اُبھر کر آئی ہیں۔ سرگوشی وہی ہے مگر الفاظ ۔انداز اور میجری کا تیکھا پن اور بھی نکھر گیا ہے

روایت کی حد بندیاں چاہے سماجی ہوں یا ادبی۔ ادا جعفری سے لیکر کشور ناہید تک اُردو شاعری میں مسلسل ٹوٹتی نظر آتی ہیں اور کشور ناہید کی شعری تصنیف ''گلیاں دُھوپ دروازے'' انہیں حد بندیوں کو ایک جھٹکے کے ساتھ توڑنے کی ایک مجاہدانہ کوشش ہے۔ ''گلیاں دُھوپ دروازے'' اس اعتبار سے اہم ہے کہ کشور ناہید اُردو شاعرات کی صنف میں وہ معتبر آواز ہے جس نے اردو شاعری میں نہ صرف نسائی

تشخص کا تعین کیابلکہ عورت کے سماجی شعور کی بھی نمائندگی کی۔

''گلیاں دُھوپ دروازے'' (مطبوعہ۔ 1978ء) کی اشاعت ہنگامہ خیز ثابت ہوئی اور جہاں تک اس مجموعہ میں شامل صرف نثری نظموں کا تعلق ہے کسی کو یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ اس مجموعہ کی بیشتر نظمیں (نثری نظم) کو نہ صرف شعری صنف کا اعتبار عطا کرتی ہیں بلکہ اپنی مجتہدانہ فکر طبع زاد علامتوں اور منفرد استعاروں کی بناء پر عمدہ شاعری میں شمار ہو سکتی ہیں۔

''گلیاں دُھوپ دروازے'' سے کچھ نثری مصرعے ملاحظہ ہوں۔

گھاس بھی مجھ جیسی ہے
پاؤں تلے بچھ کر ہی ، زندگی کی مراد پاتی ہے
مگر یہ بھیگ کر کس بات کی گواہی بنتی ہے

نہ زمین کی نمو کی خواہش مرتی ہے
نہ عورت کی

سورج مکھی کی طرح
گھر کے حاکم کی رضا پر
گردن گھماتے گھماتے
میری ریڑھ کی ہڈی چٹخ گئی ہے

ارے یہ کیا ہُوا

منه پر طمانچے کا نشان

تنور میں روٹیاں یوں ہی لگتی ہیں

صحرا میں پتھر پھینکو تو، پتھر، ریت میں بے آواز دب جاتے ہیں

کشور ناہید کے اسلوب میں تازگی اور گھمبیر تا ہے، یہ ایسی نظمیں ہیں جو کشور ناہید کی گہری فکر۔ معنی آفرینی اور باکمال اظہار فن کی نمائندگی کرتی ہیں۔

صفیہ شیم ملیح آبادی۔ رشیدہ سلیم سیمیں۔ رابعہ نہاں اور ربیعہ فخری کا شمار شاعرات کی اس نسل میں ہوتا ہے جن کی شاعری کا آغاز تقسیم ملک سے کچھ مدت قبل ہو چکا تھا لیکن ان کی شاعرانہ صلاحیتیں تقسیم وطن کے بعد کھل کر سامنے آئیں۔

صفیہ شمیم ملیح آبادی۔ 28 مارچ 1920ء میں پیدا ہوئیں، وہ اپنے دور کی جانی پہچانی شاعرہ ہونے کے باوجود پچھلے کئی برسوں سے شعر و سخن کے منظر سے غائب ہیں۔ ان کی رباعیات کا مجموعہ ''گریہ و تبسم'' اور نظموں کا مجموعہ ''آہنگ شیم'' کے نام سے طبع ہو چکے ہیں۔ ان کی غزلیں عام طور پر عام فہم۔ صاف اور سادہ ہوتی ہیں۔

کیا خبر منزل مقصود ملے یا نہ ملے

قافلہ راہ میں ہے شام ہوئی جاتی ہے

کونسی اے دل مجبور یہ منزل ہے جہاں

حسرت دید بھی الزام ہوئی جاتی ہے

ماضی کی شاعرات میں ربیعہ فخری کا نام بھی نمایاں ہے آپ 27 مارچ 1917ء میں پیدا ہوئیں ان کی شاعری میں خلوص اور جذبہ کی فراوانی ہے ان کی نظمیں

صاف اور سادہ ہیں اور غزلیں قدیم و جدید کا امتزاج کہی جا سکتی ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ ''بارشِ سنگ'' کے عنوان سے طبع ہو چکا ہے۔

رابعہ نہاں۔ 1920ء میں پیدا ہوئیں، ان کا نام پاکستان کی معروف شاعرات کی فہرست میں شامل ہے انہیں تقریباً تمام اصنافِ سخن میں رابعہ نہاں کے خیالات کی پختگی کا اظہار ملتا ہے۔ ان کا قلم غمِ حسین میں بھی نوحہ کناں رہتا ہے۔ انہوں نے اپنے مراثیوں اور سلاموں میں شہدائے کربلا کی یاد میں اشکِ غم بہائے ہیں اور کلکِ خونچکاں سے صفحۂ قرطاس پر جگر لخت لخت بکھیر دئے ہیں۔ ان کے کلام میں آغاز سے اختتام تک ایک ملال کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ ہلکا ہلکا سا درد۔ ہلکی ہلکی سی کسک ''صبحِ تسلی''۔ ''برگِ سخن''۔ ''نور جھروکے'' اور ''فروغِ سخن'' کے عنوانات سے ان کے شعری مجموعے طبع ہو چکے ہیں۔

رابعہ نہاں کی ایک غزل کا مطلع ملاحظہ ہو۔

دل و نگاہ کے ہر امتحاں سے گزرے ہیں
خموش رہ کے بھی حسنِ بیاں سے گزرے ہیں

شاعرات کے قافلے میں ثریا فخری کا نام بھی کم اہمیت نہیں رکھتا۔ ثریا فخری ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہیں اس نے ۱۹۴۷ء میں اس وقت شعر کہنے شروع کر دئے تھے جب تحریک پاکستان زوروں پر تھی۔ ثریا فخری اپنے خیالات کو اشعار میں ڈھالنے کی خاصی صلاحیت رکھتی ہے یہی وجہ ہے کہ اس کے تجربات و مشاہدات، غزل اور نظم کے اشعار میں بلا تکلف ڈھلتے دکھائی دیتے ہیں مجموعی طور پر ثریا فخری کی یہ تخلیقی کوشش عمدہ اور حوصلہ افزاء ہے۔

بلقیس محمود، بلا مبالغہ اپنے دور کی منفرد اور بڑی شاعرہ تھی۔ خصوصاً بنیادی طور پر نظم کی شاعرہ تھی۔ وسعتِ فکر و تخیل کے لیے نظم ہی بہتر ذریعۂ اظہار ہے بلقیس محمود کا فن غزل سے زیادہ نظم میں کُھل کر اظہار پاتا ہے۔ شاید اسی لیے اس کی نظموں میں تخلیقی توانائی جھلکتی ہے

بلقیس محمود انقلابی سوچ رکھتی تھی۔ اس کی نظموں کے موضوعات میں تنوع ہے ''مجھے بولنے دو'' کے عنوان سے اس کا مجموعہ کلام چھپ چکا ہے۔ اس کے ہاں سیاسی۔ سماجی۔ معاشرتی اور قومی حوالے سے موضوعات کی فراوانی ہے۔ مگر اس نے محبت کے موضوع پر بھی بہت سی نظمیں اور غزلیں کہی ہیں۔ اور یہاں بھی اس کا انداز اور لہجہ مختلف اور منفرد ہے۔

عجیب ہوں، ان سنے الفاظ پہ روتی ہوں
میں لفظوں سے بہلتی ہوں
انہی سے زندہ ہوجاتی ہوں
انہی سے ٹوٹ جاتی ہوں
مجھے رنگ، تکلم عشق کی جنت میں لے جاتا
تخاطب کا تاثر عقل کو مدہوش کر دیتا
وہی میں ہوں مگر اب ان کہے لفظوں پر روتی ہوں

بلقیس محمود، مضبوط اعصاب کی بڑی شاعرہ تھی لیکن وہ عرصہ سے مسلسل علیل چلی آرہی تھی، وہ کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا تھی چنانچہ مختلف وسوسوں اور اندیشوں نے اسے اندر سے کرچی کرچی کر کے رکھ دیا تھا۔ تاہم وہ کچھ عرصہ مزید زندہ رہنا چاہتی تھی۔ اس کے جذبوں میں شدت اور تیز بہاؤ تھا، لیکن وہ جتنی بڑی

شاعرہ تھی اسے اتنی پذیرائی نہ مل سکی۔

سچ بولنے اور لکھنے پر قدغن کے اس دور میں بہت سے ادیبوں اور شاعروں نے اپنے اپنے انداز میں صدائے احتجاج بلند کی مگر بلقیس محمود کے ہاں یہ آواز نہایت واضح اور شدید بھی ہے۔

مؤذن اپنے حجروں میں ہی سوتے رہ گئے ہیں کیا
وفا کے لفظ سیل شب کے اندر بہہ گئے ہیں کیا
سیہ پوشو، کہیں سورج کا کوئی مر گیا ہے کیا
سحرزادو، سویرا شہر خالی کر گیا ہے کیا

پاکستانی نظم کے پہلے دَور کی شاعرات میں سیدہ حنا کا نام آتا ہے۔ نظم کے کینوس پر لفظوں کی بُنت بڑی جانکاری سے وجود میں آتی ہے۔ سیدہ حنا نے بُنت میں فنکارانہ چابکدستی سے ایسی مہارت کا مظاہرہ کیا ہے کہ لفظ اپنی الگ الگ شناخت کے باوجود اجتماعی اساس رکھتے چلے جاتے ہیں۔ سیدہ حنا کا شعری مجموعہ ''عشق سے طبیعت نے'' (مطبوعہ 1990ء) نہ صرف نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے بلکہ اس میں خوبصورت ''ماہیے'' اور دلکش ''ہائیکو'' اور مترنم گیت بھی شامل ہیں۔

ساحل احمد کے لفظوں میں سیدہ حنا نے اپنی نظموں میں طوالت جو شاعری کی اضافی اصطلاح ہے اسے اختصار پسند شعراء کے مقابلے میں زیادہ کامیابی سے برتا اور استعمال کیا ہے۔ تسلسل ان کی ایک خوبصورت نظم ہے۔ یہ نظم نہ صرف کائنات کے خدوخال ہی ابھارتی ہے بلکہ انکشافِ ذات کا وسیلہ بھی بن گئی ہے۔

ازل سے ابد تک تسلسل ہے جس کا
ہم اولاد آدم ہیں
ارضی خُدا ہیں
ازل سے ابد تک کا اك سلسه ہیں

تسلسل
عشق سے طبیعت نے

اس طرح انوکھی خواہش اور خواب گھروندے بھی انکشاف ذات کا نوحہ ہیں۔ ان نظموں میں جذباتی ناآسودگی، روحانی بحران، ذہنی اور نفسیاتی الجھنوں کو ایک مخصوص اسلوب کے توسط سے نموگیر کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

اپنی امی سے روٹھ کر اکثر
سوچا کرتے تھے
الله کرے ہم مر جائیں
اور پھر امی پچھتائیں روئیں

انوکھی خواہش
عشق سے طبیعت نے

آنے والے وقتوں کی
پرچھائیاں اس پر پڑتی تھیں

سہمی سہمی خوفزدہ
بیکل بیکل پھرتی تھیں

خواب گھروندے

سیدہ حنا نے غزل کی بنیادی اساس کو قائم رکھتے ہوئے فطرت کو بے نقاب کرنے اور عصری رویئے کو پہچاننے کی بھی سعی کی ہے۔ ان کو یہ شاعرانہ تفوق فکری محاکات کو بھی نمایاں کرنے میں معاون ہوا ہے۔

سیدہ حنا کی غزلوں میں نفسی اور ذہنی تموج کی جو بازگشت ملتی ہے رمز و ایماء کی تخلیق میں مدد دیتی ہے جس بناء پر کلام کی معنوی سطح بلند ہو جاتی ہے۔ شعر کی معنوی خود پسندی، ذاتی تجربات و مشاہدات کے تخلیقی عمل سے پیدا ہوتی ہے۔

سیدہ حنا نے تغزل و تہذیب کا پاس و لحاظ رکھتے ہوئے عصری آگہی کی جس نہج سے ترجمانی کی ہے وہ داخلی و خارجی حقیقتوں اور سماجی تجزیہ کی عمدہ مثال ہے۔

کانوں میں آرہی ہیں نئے دن کی آہٹیں
کتنی حسیں ہے خواب کی تعبیر دیکھنا

آتے نہیں شمار اب روشنی کے زخم
خنجر کی نوک جیسے نہاں ہر کرن میں تھی

کیسا عجیب شہر تھا، کتنے عجیب لوگ تھے
آنکھیں تو تھیں پر منہ میں کسی کے زباں نہ تھی

شاخوں کی نرم گود میں غنچے جھلس گئے
بے رحم موسموں سے کہیں بھی اماں نہ تھی

ساحل احمد کے لفظوں میں حنا نے ماہیوں میں نسائی لطافت کو نئی معنوی سمت عطا کی ہے اور ان میں فطرت پرستی کے مظاہری اوصاف کو ملوث کرنے کی جو سعی کی ہے وہ گیت کے مزاج سے بہت زیادہ قریب ہے جس کی وجہ سے جذباتی تشنگی کی شعلگی ہر مصرع میں جاری و ساری رہتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے مصروں کے توسط سے جو المیائی مسرت پیدا کی ہے وہ جذباتی پیاس اور تشنہ آرزوں کی تصویر گری میں معاون ہوئی ہے۔

چلنے لگی پروائی
گزرے ہوئے موسم کی
اک چوٹ ابھر آئی

دو پیڑ ہیں کھٹے کے
خود کاڑھے ہیں گوری نے
یہ پھول دوپٹے کے

سورج میں تمازت ہے
کاٹو نہ درختوں کو
سائے کی ضرورت ہے

اردو ماہیا نگار خواتین میں سیدہ حنا کو یہ اولیت حاصل ہے کہ جنوری 1994ء میں ان کے ماہیوں کا مجموعہ سیدہ حنا کے ماہیے کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔ سیدہ حنا کے ہائیکو میں بھی یہی فکری لوازم موجود ہیں۔ مثلاً چند ہائیکو دیکھئے۔

راتوں کو رونا
دن کو خوش و خرم رہنا
کتنا مشکل ہے

ٹاٹ کے پردے سے
دھوپ چمک کر نکلی تو
سایہ ٹھہر گیا

بولے نہ بولے
آنکھیں اس کی ہنستی ہیں
جادو کرتی ہیں

پاکستانی شاعرات کے ناموں کی فہرست پر نظر ڈالیں تو شاہین مفتی کا نام نمایاں نظر آتا ہے۔ شاہین مفتی اقلیم شعر میں زمانہ طالبعلمی میں داخل ہوئیں، وہ ہمعصر نظم گو شاعرات میں اپنی الگ پہچان رکھتی ہیں ان کے ہاں عصری مسائل بھی ہیں، کرب بھی ہے اور پورا دور ہچکولے کھاتا نظر آتا ہے۔

شاہین مفتی کی شاعری کے پس منظر میں رواں زندگی کے شعور کی دشوار گزار پتھریلی پگڈنڈی پر چلنے کا تاثر گہرا ہے۔ موصوفہ نظموں کے علاوہ صنف غزل پر بھی حاوی ہیں۔ ان کا کلام دونوں اصناف سخن کے تخلیقی طرز احساس کی مکمل طور پر ترجمانی کرتا ہے۔ خوبصورت نظموں پر مشتمل ''مسافت'' کے عنوان سے انکی کتاب

چھپ چکی ہے۔

شاہین مفتی کی شاعری پڑھتے ہوئے اکثر وہ مقام آتے ہیں جہاں پڑھنے والا شاعرانہ تجربے کو اپنی روح کے قریب محسوس کرتا ہے۔

اس کے فیض سے میں نے
یہ سراغ پایا ہے
مرشد و فانے
بس
یہ سبق سکھایا ہے
دل کو غسل خوں دے لوں
اشک کو لہو کر لوں
حسن روبرو ہو جب
آنکھ باوضو کر لوں

(عبادت)

شاہیں مفتی کے الفاظ مربوط اور موسیقییت سے بھر پور ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری رنگارنگ خوبصورت پھولوں کا ایسا حسین و جمیل مرقع ہے۔ جس کی خوشبو مشام جاں کو معطر ہی نہیں کرتی بلکہ تازگی بھی بخشتی ہے اگر یوں کہا جائے تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ شاہیں مفتی کی شاعری میں ان کا تجربہ، مشاہدہ اور مطالعہ کے ساتھ ساتھ ان کا خون جگر بھی اپنی چھب دکھلا رہا ہے۔ ان کے رنگ سخن کا ایک انداز یہ بھی ہے۔

آنکھوں میں سلگتا ہے اک لمحہ گم گشتہ
باندھی ہوئی آنچل سے جیون کی کمائی ہے
اور ہاتھ پہ روشن ہے اک ٹوٹا ہوا تارا
لپٹی ہوئی پیروں سے زنجیرو عزاداری
ہونٹوں پہ مچلتا ہے اک نعرہ مستانہ
اور ماتھے پہ لکھی ہے تعزیر و فاداری

مخلوق کے ہاتھوں کی طرف دیکھنا کیا ہے
ہر دست دعا اب کے یہاں سنگ نما ہے
مقتل کی طرف دیکھ کہ وہ کیسے سجا ہے
میثاق محبت کے ہوں اوراق سلامت
یہ رسم سلامت ہے تو عشاق سلامت ہے

(اپنے لیے ایک نظم)

عرفانہ عزیز، کم کہتی ہیں لیکن اچھا کہتی ہیں۔ ان کا شمار توانا شعری صلاحیتوں کی مالک شاعرات میں ہوتا ہے۔ وہ تجربے اور تخلیق کے کرب سے گزر کر اپنی بات کہتی ہیں۔ اپنے عصر کے ساتھ ان کا رشتہ بہت گہرا ہے۔ برگ ریز (شعری مجموعہ) کے بعد ان کا دوسرا مجموعہ کلام، کف بہار، کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔ ان کے دونوں شعری مجموعے اہل ذوق سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔
عرفانہ عزیز کی شاعری نوبہ نو موضوعات اور رنگارنگ احساسات کا ایک ایسا شکوہ قائم کرتی ہے کہ قاری کا احساس اس کی گہری حساسیت کی تہہ تک اترنے لگتی

ہے۔

عرفانہ عزیز کی نظمیں صوتی و معنوی حسن کا امتزاج ہیں۔ ان کی نظموں کی دلکشی اور نغمگی قلب و نظر میں ارتعاش پیدا کرتی ہے۔ ان کی نظموں کو پڑھتے ہوئے تازگی، فراخی اور سانس لینے کی کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔

ڈاکٹر رشید امجد کے مطابق! عرفانہ عزیز کے یہاں خیال، تاثرات، احساسات اور جذبوں کی اہمیت ہے۔ ان کے ہاں اپنی ذات کا بیان اور مسائل کا اس انداز سے اظہار ہے کہ ان میں عمومیت اور ہمہ گیریت پیدا ہو گئی ہے۔ انسان دوستی، حریت پسندی اور وسیع المشربی کا ایک بڑا افق ان کی شاعری میں در آیا ہے۔ وہ زندگی کی دوامی قدروں امن و محبت اور عدل و انصاف کی خواہاں ہیں انسان اور انسانیت ان کے ہاں معتبر جنس ہے۔ یہ وسیع تناظر ان کی غزلوں اور نظموں میں نمایاں ہیں۔

جھکا ہوا ہے اگر ذات کے سفر میں بدن

کنار شوق میں درجہاں دوبارہ دیکھ

انسان کے ساتھ رشتہ انسان اگر ہے

دشوار زندگی کا کوئی مرحلہ نہیں

عرفانہ عزیز کے کلام میں حکیمانہ طرز کے باوجود انفرادی جذبوں کی کھنک ہے۔ اپنے عصر کے ساتھ عرفانہ عزیز کا رشتہ بہت گہرا ہے، انہیں وطن سے باہر وسیع و عریض فضاؤں میں بکھر کر بھی اکثر یہ احساس ہوا کہ ان کا اپنی زمین سے رشتہ بہت گہرا ہے۔ ہجرت نے اگرچہ انہیں لامحدود کرب سے آشنا کیا تو ساتھ ہی سرمدی لطف سے بہرور بھی کیا۔

اب ثنا خواں لب دوست نہیں
گیت مرے
اب غم ذات ہے بادل ایسا
جو پہاڑوں سے گزرتا ہوا پل بھر کے لیے
ان گراں گوش دروبام پہ رک جاتا ہے
جو شنا ساہیں مرے سنگ صدا سے لیکن
دل وحشی کی رسائی میں نہیں
ان گراں گوش دروبام کا کوئی نوحہ
میری آشفتہ نوائی میں نہیں
(سنگ صدا)

نسرین انجم بھٹی سلجھی ہوئی سنجیدہ خاتون ہیں۔ آپ بنیادی طور پر پنجابی زبان میں تخلیقی اظہار کرتی ہیں۔ ان کی مکالماتی نظم پنجابی شاعری کا خوبصورت اور دلکش تجربہ ہے۔ لیکن وہ اردو زبان میں بھی اپنی پہچان رکھتی ہیں۔

اردو میں ان کا لب ولہجہ اور انداز بیان کسی تعارف کا محتاج نہیں انہوں نے اردو شعری ادب میں اپنی بھرپور صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے ان کی شاعری عصر شعور کی ترجمان ہے۔ اور اپنی ہمعصر شاعرات میں اپنا ایک مقام حاصل کر لیا ہے۔

کپڑے کے پھول ، کاغذ کی چڑیا، مٹی کی عورت
سارے ثقافتی ورثے میں
صرف پیوند اور زخم، ایڑھی پر کون بیٹھی ہے
گھونگھٹ لمبا اور گھر چھوٹا
ایک ہی سکہ وہ بھی کھوٹا

نسرین انجم بھٹی نے نثری نظم کو ایک راز سے آشنا کیا ہے۔ یہی اس کا جواز ہے۔ 1996ء کے اختتام پر اور 1997ء کے آغاز میں ان کی اردو نظموں کا مجموعہ (بن باس) کے عنوان سے طبع ہوا۔ یہ شعری مجموعہ شاعرہ کے ترقی پسندانہ رجحانات کا مظہر ہے۔

شبنم شکیل کی شاعری اس کے ارتقائی رجحانات کی آئینہ دار ہے۔ اس کے شعور نے منزل بہ منزل ترقی کی اور اسی طرح ان کی شاعری بھی اس کے شعور کے دوش بدوش چلتی ہے (شب زاد) شعری مجموعہ اس کی تخلیقی زندگی کا ثمر اولین تھا اگرچہ شبنم شکیل نے اپنی فکر کی خشتِ اول (شب زاد) میں روائتی مضامین پر رکھی تھی۔ لیکن دوسرے شعری مجموعہ اضطراب میں روایتی پگڈنڈی پر چلنے کی بجائے ترقی پسند رجحان رکھنے والی شاعرہ کی حیثیت سے سامنے آتی ہے۔ اضطراب میں شبنم شکیل کا لہجہ کہیں احتجاجی ضرور نظر آتا ہے۔ مگر شعری شعور کی پختگی اور مہذب طرز احساس اور تہذیبی شائستگی نمایاں ہے۔

شب زاد سے لے کر اضطراب تک کا تخلیقی سفر کم و بیش تیس برس کے عرصے پر محیط ہے۔ اضطراب میں غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی شامل ہیں۔

افتخار عارف لکھتے ہیں! ''شب زاد سے'' شبنم شکیل نے جس شعری سفر کا آغاز کیا تھا وہ اضطراب میں اپنی ساری توانائیوں اور تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ رونما ہوا ہے۔ مسلسل تصادم و کشمکش اور پیہم آویزش اپنے آپ سے بھی اور اپنے خارج سے بھی شبنم شکیل کو ہمہ وقت بے چین اور مضراب کیے رکھتی ہے۔

پروفیسر شہرت بخاری کے لفظوں میں کلاسیکی انداز بیان کا رکھ رکھاؤ نیز تازگی و شگفتگی کے تازہ کھلے ہوئے پھول جن کی بھینی بھینی خوشبو تسکین دل وجان کا سامان فراہم کرتی ہے۔ موضوعات میں نہایت احتیاط سے حقیقت کا دمکتا ہوا رنگ ایک عورت کا دھڑکتا ہوا دل۔ ہجر وصال کو نازک اور لطیف کیفیتیں اس کے

ساتھ ساتھ مسائل عصر سے آگاہی اور اس کا میٹھا میٹھا درد جیسے احساسات کا اظہار شبنم شکیل کے شعروں میں ملتا ہے۔

نیند تو آنے کو تھی پر دل پچھلے قصے لے بیٹھا
اب خود کو بے وقت سلانے میں کچھ وقت لگے گا

وقت کی گرد نے دھندلا دیے سب نقش ونگار
ورنہ دل ایک دھنک رنگ مکاں تھا پہلے

تازہ کلیوں کے تبسم کا سبب کیا ہو گا
آیا کرتی ہے جوانی میں ہنسی آپ ہی آپ

سن لے گا تیری چاپ تو دھڑکے گا دیر تک
لاکھ اپنے گردو پیش سے دل بے خبر بھی ہو
آدھی ان کی سن چکی ہوں
آدھی بات پہ اڑی ہوئی ہوں

نظم و غزل کے علاوہ شبنم شکیل نے کچھ نعتیں بھی کہی ہیں۔ ان کو نعتیہ شعری اظہار گرفت میں لے لیتا ہے۔ اس کے پڑھنے کا اپنا ایک انداز ہے۔ وہ جذبے اور شائستگی سے پڑھتی ہیں۔ ان کا حضور پاک محمد مصطفےٰ ﷺ سے عقیدت و محبت کا اظہار ملاحظہ ہو۔

بنی آدم کے لیے مائیہ توقیر ہیں آپؐ
جس سے آفاق فروزاں ہیں وہ تنویر ہیں آپؐ
آپؐ کی ذات سے نقاش ازل کا شہکار
جس پہ نازاں ہے مصور بھی وہ تصویر ہیں آپؐ
ہوں تہی مایہ مگر حوصلہ دل کا ہے بلند
ہے مسلم کے بڑے صاحبِ تدبیر ہیں آپؐ

اُردُو شاعری میں رجحانات۔ میلانات اور ہیئت واسلوب کی تازہ کاری کے لحاظ سے ایوانِ سخن میں کچھ شاعرات نمایاں بلکہ کچھ زیادہ ہی نمایاں نظر آتی ہیں جنہوں نے تخلیقی کاوشوں کا اعلےٰ ثبوت دیا ہے ان میں پروین شاکر کا نام بلا مبالغہ اہم ترین نام ہے۔

پروین شاکر 24 نومبر 1952ء کو کراچی میں پیدا ہوئیں انہوں نے شاعری کا آغاز کراچی سے کیا تھا۔ وہ نئی نسل کی ممتاز شاعرہ تھیں اور خوش گو اور جدید تر لہجے کی شاعرہ ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ انہوں نے شاعری کے وقار اور عورت کے دھیمے پن کو حال رکھتے ہوئے شاعری میں نسائی جذبات واحساسات کو بڑی خوبصورتی سے شگفتہ انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ جذباتی کیفیت سے ایک فکری منزل کی طرف سفر کرتی ہیں چنانچہ ان کی شاعری نے نوجوان ذہنوں کو بہت متاثر کیا اور اپنے بے شمار مداح پیدا کیے۔

''خوشبُو'' کے عنوان سے اپنا اَولین شعری مجموعہ طبع کرا کے پروین شاکر نے جدید تر شعری فضا میں خوشبوؤں کی لپٹیں بکھیر دیں اور پہلا تاثر ہی اس قدر بھرپور تھا کہ اس کا ذائقہ مدتوں تک موجود رہے گا۔

ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں۔ ''اس کی ابتدائی شاعری میں عنفوانِ شباب کے

اولیں نسوانی جذبوں کے کچے اور انوکھے تجربوں اور وارداتوں کا قدرے شائستہ اور رمزیاتی اسلوب بیان نکلتا ہے۔ پروین شاکر نے اپنے احساسات کو ایک فنی پختگی کے ساتھ اپنی گرفت میں لیا ہے۔

میرا بھی اک سورج ہے
جو میرا تن چھولے
تو مجھ میں قوسِ قزاح کے پھول اگائے
ذرا بھی اُس نے زاویہ بدلا
اور میں ہو گئی
پانی کا اک سادہ قطرہ
بے منظر، بے رنگ

(پرزم)

"خوشبو"

پروین شاکر کی ایک چھوٹی سی نظم ملاحظہ ہو جو شاعرہ کی اس دور کی شاعری کی آئینہ دار ہے۔

جانے کب تک تری تصویر نگاہوں میں رہی
ہو گئی رات ترے عکس کو تکتے تکتے
میں نے پھر تیرے تصوّر کے کسی لمحے میں
تیری تصویر پہ لب رکھ دیئے آہستہ سے

(اعتراف)

"خوشبو"

''خوشبو'' (مطبوعہ = بار اوّل نومبر 1977ء) سے ''خود کلامی'' (مطبوعہ = جون 1988ء) اور پھر ''صد برگ'' (مطبوعہ = فروری 1980ء) سے ''انکار'' (مطبوعہ = مئی 1990ء) تک کا یہ شعری سفر کتنے متنوع تجربوں۔ سوچوں کی کتنی دیدہ و نادیدہ جہتوں اور حسن اظہار کے کتنے تیوروں سے آراستہ ہے۔ اس کے مجموعہ ہائے شعری میں غزلوں اور متفرق اشعار کے علاوہ نظمیں بھی شامل ہیں۔ جو نظم کے فنی امکانات کے ساتھ ساتھ جدید حسیّت کا احساس دلاتی ہیں بیشتر نظموں میں اس کا نسوانی مزاج شامل ہے اپنے عہد کا کرب بھی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ذات اور اس کا عہد ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں۔

حقیقت ہے کہ پروین شاکر نے بہت سے الفاظ کو نئے معنی دیئے ہیں، اس کی شاعری کا اپنا ایک انداز ہے۔ ''شہزادی کا المیہ''، پروین شاکر کی ایک ایسی نمائندہ نظم ہے کہ جس میں سیاسی و سماجی کتنے ہی منظر سمٹ آئے ہیں۔ یہ ایک طویل نظم ہے اور پوری نظم پڑھنے سے یہ کھلتا ہے کہ پروین شاکر نے معاشرے کی ناہمواری کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ ''شہزادی کا المیہ'' کی آخری لائنیں ملاحظہ ہوں۔

عرضیوں اور غرضیوں کے طوفان بے پناہ میں
گھری ہوئی اک شہزادی
کبھی کبھی سوچتی تو ہو گی
کہ اپنی چھوٹی سی سلطنت کو
جو پہلے ہی دشمنوں کی آنکھوں میں خار بن کر کھٹک رہی ہے
خود اپنی پیاری سپاہ سے کس طرح بچائے
(شہزادی)

پروین شاکر نے نثری نظموں سے بھی قطع نظر نہیں کیا اور اس کے احساسات و جذبات نے ایسے دور میں اظہار کے لیئے نثری نظم کو شرف قبولیت بخشا جب نثری نظم کی مخالفت زوروں پر تھی چونکہ وہ صرف شعری اظہار اور تخلیق کی ہی نہیں ابلاغ کی بھی قائل تھی اس لیئے اس کی نظموں کی فضا ذاتی اور داخلی ہونے کے باوجود پڑھنے والوں کو اس کی شاعری کے ادراک میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ اس سلسلے میں اس کی نظموں کے عنوانات قاری کو بڑی مدد دیتے ہیں۔

نظیر صدیقی کا ادراک اپنی جگہ لیکن ڈاکٹر اعجاز راہی کی نشاندہی مختلف ہے زندگی کے سچ بولنے کی آرزو مندی، مایوسی سے ہم آمیز نہیں ہوتی۔ پروین شاکر کے ہاں اس شدت کو بدرجہ اتم دیکھا جا سکتا ہے۔

تو فی الوقت مرمّو تحلّ ہی کافی ہے
فکر مُغل تو تب ہو
کہ مطلوبہ ویرانیاں مشتبہ ہوں
یہاں تو مکانات کچھ ایسی سرعت سے کھنڈرات میں ڈھل رہے ہیں
کہ ہم سات پشتوں تک
اپنے بسیرے کی فکروں سے آزاد ہو جائیں گے
اب نہ کھیتوں میں فصلوں کی ہے بدشگونی
نہ آنگن میں گڑیا لئے کوئی بچی

ڈاکٹر اعجاز راہی کے لفظوں میں۔ ''اوپر کے مصروں میں پروین شاکر کے لہجے کا درد ایک شدید معاشرتی استبداد کو ظاہر کرتا ہے اور اس سے قبل زندگی کے سچ بولنے کی اس سے بڑی مثال بھی نہیں ملتی۔''

پاکستان کی تاریخ میں المیہ کراچی بھی ہر اعتبار سے ایک اہم اور نا قابلِ فراموش واقعہ ہے۔ کراچی کے المیے کے پس منظر میں نہ صرف نسبتاً کم معروف شعراء نے غزلوں اور نظموں میں اپنے جذبات واحساسات اور خیالات کا اظہار کیا ہے بلکہ معروف اور ممتاز شعراء اور شاعرات نے بھی کراچی کے المیہ کو موضوعِ سخن بنایا ہے تاہم یہ نظمیں اور غزلیں کسی ایک شاعر کی لکھی ہوئی نہیں بلکہ انہیں پورا، ایک عہد لکھ رہا ہے۔ ہر وہ شخص جو اس عہد میں سانس لے رہا ہے۔

یہ سب تجربے۔ مشاہدات اور احساسات اس کے اپنے ہیں۔ آج زندگی کے مسائل ہڑتال۔ بندوق۔ آگ۔ کلاشنکوف اور دھواں یہ سب دھماکوں کے گرد گھومتے ہیں۔ خوف۔ دہشت۔ نا اُمیدی اور ڈر نے ایک مسلسل شک وشبہ اور تذبذب کی فضا کو جنم دیا ہے۔ کچھ دِن فضا پُر امن ہوتی ہے تو یہ خدشہ اور طرح طرح کے جانے اور انجانے وسوسے دل ودماغ میں ہمکتے رہتے ہیں کہ یہ عارضی خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ نہ ہو۔

رونقِ بازار و محل کم نہیں ہے آج بھی
سانحہ اس شہر میں کوئی مگر ہونے کو ہے
(پروین شاکر)

لہٰذا گردو پیش کے اجتماعی ماحول کے دُکھ اور درد سے اُبھرنے والی مایوسی۔ ناکامی۔ تشکک۔ یاسیت۔ سیاسی و سماجی جبر کا بیان نظموں کا موضوع بنا ہوا ہے چنانچہ عروس البلاد کراچی کے معصوم اور بے گناہ شہریوں پر جو افتاد پڑی اور شہر میں ہونے والی ابتری۔ بدحالی اور تباہی سے متاثر ہو کر پروین شاکر نے بھی نوحہ لکھا ہے یہ ایک طویل نظم ہے، اس کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

عکس گُل تر جلا ہُوا تھا
خوابوں کا نگر جلا ہُوا تھا
یا دست دُعا نہ اُٹھ سکا تھا
یا اس کا اثر جلا ہُوا تھا

"کراچی۔۱۹۸۹ء کی آخری شام"
(انکار)

نعت میں جدید اسلوب کا فروغ تاسیسِ پاکستان کے بعد ملتا ہے۔ جدید اردو نعت میں کئی ہیئتی تجربے بھی کئے گئے ہیں۔ پروین شاکر نے آزاد نظم کی صورت میں حسنِ عقیدت کا نیا رنگ دکھایا ہے۔ پروین شاکر کی نعت "وحی" کا یہ ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

فضائے بے نطق جیسے اقراء کا ورد کرنے لگی تھی
وہ سارے لفظ جو
تیرگی کے سیلاب میں کہیں بہہ چکے تھے
پھر روشنی کی لہروں میں
واپسی کے سفر کا آغاز کر رہے تھے
دریچۂ بے خیال میں
آگہی کے سورج اُتر رہے تھے
اس ایک پل میں
وہ میرا اُمّی
مدینتہ العلم بن چکا تھا

"وحی"
(خوشبو)

پروین شاکر (مرحومہ) کی شاعری کے حوالے سے کافی حد تک بھرپور اور متوازن مضامین کے علاوہ کچھ ایسے مضامین بھی آتے ہیں جن میں پروین کی آزاد یا نثری نظموں پر بے جا قسم کے اعتراضات بھی اٹھائے جاتے ہیں جبکہ ان کی دیگر نثری نظموں کے علاوہ ''بشیرے کی گھر والی'' (مشمولہ: ''انکار'') بہت ہی خوبصورت اور طنز سے بھرپور نظم ہے جس میں عورت کی ازلی مظلومیت اور معاشرے اور خاندان کے ظلم و ستم کو۔ اُردُو اور ہندی لفظوں کے تال میل سے بے حد پُر اثر بنایا گیا ہے۔ اور پھر خوشبو اس کی مختصر نظم ''احتیاط'' کی نازک خیالی درجۂ کمال پر ہے اور انسان کو کہنا پڑتا ہے کہ وہ اس قسم کے نازک احساسات و جذبات سے بھرپور مزید نظمیں بھی لکھتی۔

پروین شاکر کی دیگر شاعرانہ خوبیوں میں سے ایک نمایاں اور اچھی خوبی یہ بھی تھی کہ اس نے غزلوں میں عام اور سہل اُردُو الفاظ کا استعمال کیا ہے جبکہ نظموں میں وہ ہندی کے میٹھے اور رسیلے الفاظ کو شامل کر کے اشعار کو دلآویز بنانے کے فن سے بھی واقف تھی انہوں نے بھاری بھر کم عربی و فارسی کے الفاظ سے گریز کیا ہے یوں ان کی شاعری ''سہلِ ممتنع'' کی عمدہ مثال بن گئی ہے۔

ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ مرحومہ نے انگریزی الفاظ کو اپنی شاعری میں اکثر برتا ہے لیکن اسے معیوب حرکت نہیں سمجھا جاتا۔ تاہم یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ اگر وہ ''خوشبو'' کے بعد اپنے آپ کو پُرگوئی کے حوالے نہ کرتی تو بلا شُبہ ''ایکسیڈنٹ'' ۔ ''پہلے پہل'' ۔ ''خلش'' ۔ ''ورکنگ وومن'' ۔ ''بے پناہی'' ۔ ''تقیہ'' ۔ ''سرشاری'' ۔ ''مجھے مت بتانا'' ۔ ''انہونی کی ایک دعا'' اور ''ایک خط'' جیسی مختلف موضوعات پر اور نازک جذبات اور احساسات کی حامل نظمیں اُردُو ادب کو دے کر غزل کی طرح نظم میں بھی اعلیٰ معیار قائم کرتیں تاہم پروین شاکر کی نظموں کو نظر انداز کرنے کا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔

ہمارے عہد کی شاعری اپنی پوری قوت اور تخلیقی توانائی کے باوصف کتنی باخبر ہے اس کا اندازہ پروین شاکر کی غزل سے ہوتا ہے۔ غزل اور نظم ہماری معروف اصناف شاعری ہیں۔ پروین نے بڑے خلوص۔ قرینے۔ سلیقے اور دردمندی سے طبع آزمائی کی ہے۔

اگرچہ ہیئت اور اسلوب کے اعتبار سے غزل میں نت نئے تجربات ہو رہے ہیں لیکن پروین شاکر کی غزلوں کا انداز مخصوص تیوروں کے تناظر کے ساتھ اس کے انفرادی تجربے میں ڈھلتا ہے۔ پروین کی غزل خارجی تجربے اور داخلی واردات کی کشمکش کو اظہار کا قرینہ عطا کرتی ہے اور جذبہ۔ تخیل اور فکر کے تثلیثی امتزاج کی حامل ہے۔

جب ''خوشبو'' طبع ہو کر آئی تو علمی وادبی حلقوں میں خوشگوار حیرت کا اظہار کیا گیا یہ ایسی نئی آواز ہے جو متاثر کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہے۔ پروین شاکر نے نظم اور غزل دونوں حوالوں سے بہت ہی عمدہ تخلیقات پیش کی ہیں اور انہوں نے اپنے خواب آفریں اسلوب کا جادو جگایا ہے۔

پروین شاکر کی غزل کا مطالعہ دراصل اس غزل کا مطالعہ ہے جو ہر طرح کی مخالفت کے باوجود ہر دور میں زندہ اور توانا صنف کی شکل میں موجود ہے ان کی غزل میں جذباتی اور محسوساتی کیفیات کے ساتھ ساتھ سماجی اور سیاسی موضوعات بڑی دلکشی کے ساتھ آئے ہیں اور زندگی کے معاملات کو شعر کے وسیلے سے بیان کرنے کے لئے پروین نے علامت واستعارہ کا سہارہ لیا ہے اور خاص بات یہ ہے کہ ان کے ہاں براہ راست ابلاغ کی خوبی موجود ہے اس تناظر میں بادل۔ چہرہ۔ بدن۔ ردا۔ پھول۔ زخم۔ نگاہ۔ تتلیاں۔ خواب۔ خوشبو۔ رقص اور بام جیسے لفظ اپنی بھرپور معنویت کے ساتھ در آئے ہیں اور ہر جگہ نئی کیفیت اور صورتِ حال کی نمائندگی کرتے ہیں۔

بادل کوئی چُھو گیا تھا مجھ کو
چہرے پہ عجیب تازگی تھی

ماتھے پہ وہ لب تھے ثانیہ بھر
اور، روح مہک رہی ہے اب تک
میرے ماتھے پہ تیرے پیار کا ہاتھ
روح پر دست صبا ہو جیسے

اس نے جلتی ہوئی پیشانی پہ جب ہاتھ رکھا
روح تک آگئی تاثیر مسیحائی کی

پروین شاکر کی ہمعصر شاعرہ فہمیدہ ریاض کی رائے کی مطابق ۔ ''پروین شاکر کے شعروں میں لوک گیتوں کی سی گھمبیر سادگی اور لے بھی ہے اور کلاسیکی موسیقی کی نفاست اور نزاکت بھی۔''

اور واقعی پروین شاکر کی غزل میں غزل کے شعری پیکر کا احساس ہے۔

سندر، کومل سپنوں کی بارات گزر گئی جاناں
دھوپ آنکھوں تک آپہنچی ہے رات گزر گئی جاناں

آج ملبوس میں ہے کیسی تھکن کی خوشبو
رات بھر جاگی ہوئی جیسے دلہن کی خوشبو
حرف تازہ نئی خوشبو میں لکھا چاہتا ہے

باب اک اور محبت کا کُھلا چاہتا ہے
اُن انگلیوں کا لمس تھا اور میری زُلف تھی
گیسو بکھر رہے تھے تو قسمت سنور گئی

''خوشبو'' میں نسائی جذبات و احساسات کی شدت اور اس میں ایک فطری پن اور لہو میں تیرتی گرمی اور جذبے کی سرشاری کا اظہار ملاحظہ ہو۔

میری پھٹی ہوئی رداد ہے بھی گئی بیاں مگر
فیصلہ رک گیا ہے ایک اور گواہ کے لئے

خوشبو کو رقص کرتے ہوئے دیکھنے لگی
سحر بہار میں کہ طلسم صبا میں ہوں

مجھ میں کبھی آہٹ کی طرح سے کوئی آئے
اک بند گلی کی طرح سنسان بہت ہوں

زخم کھلنے کے منتظر کب سے
اور لمس ہوا نہیں ملتا

برسا بھی تو کس دشت کے بے فیض بدن پر
اک عمر مرے کھیت تھے جس ابر کو ترسے

پروین شاکر بنیادی طور پر غزل کی شاعرہ تھیں ان کی غزل صحیح معنوں میں ''نئی غزل'' ہے انھوں نے عام روایت سے ہٹ کر اپنی شاعری کی بنیاد رکھی ہے چنانچہ غزل میں ان کا لہجہ منفرد اور جدید تر غزل میں ان کا الگ مقام ہے۔ معاملہ بندی کو انھوں نے آج کی عورت کے حوالے سے پیش کرتے ہوئے انھی موضوعات کو چھیڑا ہے جن پر غزل کی بنیاد تعمیر ہو چکی ہے۔ پروین شاکر کی شاعری کا محور عشق ہے اور انھوں نے اسے زندہ تر شعری صداقتوں سے آشنا کیا۔ میں اپنے دعوے کی تصدیق کے طور پر یہاں پروین شاکر کے چند شعر پیش کرتا ہوں۔

دل کو لہو کروں تو کوئی نقش بن سکے
تو مجھ کو کربِ ذات کی سچی کمائی دے

یہ کیسے شکاری نے جکڑا ہے مجھ کو
کہ خود میں نے اڑنے کی خواہش کتر دی

مجھ پہ چھا جائے وہ برسات کی خوشبو کی طرح
انگ انگ اپنا اسی رت میں مہکتا دیکھوں

پھول کی طرح مرے جسم کا ہر لب کھل جائے
پنکھڑی، پنکھڑی ان ہونٹوں کا سایہ دیکھوں

ادا جعفری اور عرفانہ عزیز کی طرح پروین شاکر کے یہاں بھی خیال۔ ثرات۔ احساسات اور جذبوں کی اہمیت ہے۔

سچا شاعر اپنی روح احساس کا حق نہیں مارتا۔ دھیما پن اور شائستگی پروین شاکر کی اپنی شخصیت کے مستقل اوصاف تھے اور شاعری میں ان کا لہجہ بھی انہیں اوصاف سے مملو ہے، جو پُر تاثیر بھی ہے اس لیے کہ انہوں نے اپنے تجربات و مشاہدات کو اپنے ذاتی جذبہ واحساس کی پوری سچائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

پروین شاکر کے ہاں زندگی کرنے کا عمل غزل کے حوالے سے جاری ہے اور ان کی غزل درد۔ حزن۔ گرمی اور شدت رکھنے کے باوجود ملائمت و محبت کی آئینہ دار ہے اور یہی وہ خصوصیات ہیں جو زندہ شاعری کے لیے ایک معیار ہے۔

غزالہ خاکوانی کا شعری سفر چند دہائیوں پر محیط ہے، لیکن اس کا منفرد انداز بیان جداگانہ انداز فکر اور اپنی ہمعصر شاعرات سے مختلف ادبی و فنی اظہار خیال اس کی انفرادی پہچان ہے۔ وہ منہ زور جذبوں اور امڈتے احساسات کی شاعرہ ہے۔ اس کے کلام میں بے چہرگی کو دور کرنے کی خواہش تخلیقی جذبہ بن کر شاعری کا بنیادی موضوع بن گیا ہے۔

غزالہ خاکوانی کی شاعری کا بنیادی لہجہ احتجاج کا لہجہ ہے۔ ''خود آشنائی'' (مطبوعہ = 1989ء)۔ اس کا دوسرا مجموعہ کلام ہے جبکہ پہلی شعری تصنیف ''مرے پر نہ باندھو'' ہے ''خود آشنائی'' میں ناروا معاشرتی رویوں کے خلاف احتجاج کا رنگ واضح دکھائی دیتا ہے۔ جبکہ اس کا شعری مجموعہ ''مرے پر نہ باندھو'' انتہائی شاعرانہ اور بامعنی انداز میں اس کے لہجے کو جیسے مجسم کرتا دکھائی دیتا ہے۔ لگتا ہے کہ اس کی شاعری اور شخصیت مکمل طور سے اس عنوان میں سمٹ آئی ہے۔ عصر حاضر کے معاشرتی امتیازی رویوں کی موجودگی میں نئی نسل کی اس شاعرہ کے روپ میں اس عورت کی آواز بھی شامل ہے۔ جس کا استحصال کیا گیا ہے۔ غزالہ خاکوانی کی شاعری ان رویوں کی عکاس ہے جو صدیوں کے معاشرتی عمل کے ذریعے عہد بہ عہد منتقل ہوتے چلے آرہے ہیں۔ جدید عورت ان رویوں کے خلاف احتجاج کر رہی ہے۔

اوراس احتجاج میں غزالہ خاکوانی کی صدائے احتجاج کی بازگشت بھی شامل ہے۔

جیلانی کامرآن کے لفظوں میں ''ہمارے عہد کے دبے ہوئے رویوں کی موجودگی میں اس عمر کی شاعرہ کے پردے میں اس عورت کی آواز بھی شامل ہے جسے آزادی سے محروم رکھا گیا ہے۔ اور جس کے لیے زندگی کا کوئی مفہوم بھی نہیں ہے۔ ایک خاص بات قابل ذکر ہے کہ آج تک اردو شاعری میں صرف مرد کی زبان سے زندگی کو بلاوا بھیجا تھا۔ غزالہ خاکونی میں شاید زندگی کو پہلی بار عورت کی انا اپنی جانب بلاتے نظر آتی ہے تاکہ اپنے وجود کی شناخت پاسکے۔ آزادی کی ایسی تڑپ اور خواہش خواتین کے شعری مجموعو میں بہت کم دکھائی دی ہے۔ ان نظموں میں خواب کی سی کیفیت بھی ہے اور لوریوں کی فضا بھی ہے۔ ان نظموں میں پیار ہے محبت کی مٹھاس ہے اور ایک طرح کی دردمندی ہے جس کے بغیر انسان کا وجود مکمل نہیں ہوتا۔

تمہارے بدن کی حدّت
مری روح کی یخ بستگی کا علاج
مری روح پھر سے ٹھٹھرنے لگی
مری ہی رگوں میں یہ جمنے لگی
تم اک بار لوٹ آؤ
جاناں!

حصار یار چاہیے
(خود آشنائی)

غزالہ خاکوانی بنیادی طور پر نظم کی شاعرہ ہے لیکن وہ غزل بھی کہتی اور خوب کہتی ہے۔ غزالہ خاکوانی کے طرز احساس سے ہمیں اپنے عہد کی عورت کو

پہچاننے میں بھی مدد ملے گی۔

یہ ترے نرم سے لہجے کی مہک
میرے جذبوں کو ہوا دیتی ہے

ایندھن تھی تمنا کا سدا جلتی رہی میں
خواہش کا رہا دیپ ہواؤں کے بھنور میں

پاکستانی نظم کی روایت کو آگے بڑھانے والی شاعرات کا قابل تعریف حصہ رہا ہے۔ جن شاعرات نے صنف نازک کے محسوسات اور مسائل کو بہتر انداز میں پیش کیا ہے۔ ان میں فاطمہ حسن ایک نمایاں نام ہے۔

فاطمہ حسن 25جنوری 1953ء میں پیدا ہوئیں اور موصوفہ 1965ء اور 1970ء کی دہائی میں منظر عام پر آنے والی شاعرات میں انفرادی شخصیت اور منفرد لہجہ کی مالک ہیں۔ بلکہ یوں کہنا بھی غیر مناسب نہیں ہوگا کہ ایک جیسی بہت سی آوازوں کے ہجوم میں اپنی آواز کو مختلف اور منفرد بنانا فاطمہ حسن کی ایک اہم خوبی ہے۔ فاطمہ حسن نے اپنے احساسات خود تلاش کیے ہیں اور انہیں اظہار کی ایک نئی صورت دی "بہتے ہوئے پھول" لفظوں اور خوابوں کے موسموں سے عبارت ہے۔ "بہتے ہوئے پھول" ان کا اولین شعری مجموعہ ہے۔ فاطمہ حسن نے نثری نظموں کے علاوہ مختصر نظمیں بھی لکھیں اور غزلیں بھی جن کا آہنگ اور صوتی خوبیاں اچھی شاعری کے پیمانے پر پوری اترتی ہیں تاہم فاطمہ حسن کا بنیادی مزاج نثری شاعری ہی کے لیے موزوں نظر آتا ہے۔

تتلیوں کی طرح تمہارے تعاقب میں
اُڑنے والی آنکھیں
اب سمندر میں ڈوب جانا چاہتی ہیں
(تعاقب)

تم کہاں تک میرا ساتھ دو گے
اگر ہو سکے تو یہیں روک لو
میں بہت تھک گئی ہوں
(سفر ایک شام)

فاطمہ حسن کی شاعری درمیانی کیفیت سے ابھرتی ہے، نظموں کی فضا میں نہ چلچلاتی دھوپ ہے نہ مکر چاندنی۔ وہ گہرے رنگوں کی شاعری نہیں ایک دھیما سا دُکھ ہے۔ جو فاطمہ حسن کی پہچان ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں ''جدید دور میں بعض شاعرات نے باطن کے نازک ترین ارتعاشات کو پر سکون انداز تکلم عطا کیا ہے۔ جن میں تنہائی اور کم آمیز رفاقتوں سے اٹھنے والی ہلکی ہلکی آنچ بھی ہے اور سینہ سوزی بھی۔ وہ سرشاری اور مکمل پن بھی ہے جو باہمی یگانگت سے نمو پاتا ہے۔ مثلاً ان کا یہ انداز ملاحظہ ہو۔

ایک خط ایسا لکھوں
جس کو پڑھتے ہوئے
زندگی بیت جائے
سوچتی ہوں کہ میں

اپنی آنکھیں اسے
کس طرح بھیج دوں

(وہ چاہتا ہے)

نثری نظم سے تعلق رکھنے کے باوجود فاطمہ حسن نے اپنی غزلوں اور نظموں کو نہ پرچم بنایا ہے نہ دوپٹے کی طرح اوڑھا ہے۔ فاطمہ حسن کے ہاں اس کی شاعری دکھ اور قوت ارادی کے تصادم اور اس کی جدلیات سے بھی پیدا ہوئی ہے۔ فاطمہ حسن کی شاعری کی بنیاد جدید بھی ہے اور رومانوی بھی۔

چاہت کے، ہجرتوں کے، نئے فاصلوں کے دکھ
کچھ روح میں اتر گئے کچھ جسم سہہ گئے

ہوا چلے گی تو خوشبو مری بھی پھیلے گی
میں چھوڑ آئی ہوں پیڑوں پہ اپنے ہات کے رنگ

اب تک فاطمہ حسن کے دو شعری مجموعے "بہتے ہوئے پھول" اور "دستک سے در کا فاصلہ" چھپ چکے ہیں۔ ان کی شاعری میں اپنی دھرتی کی باس پائی جاتی ہے اور اس سرزمین سے وابستگی کا اظہار بھی۔ فاطمہ حسن کی بیشتر نظمیں وطن کے حوالے سے ہیں اور یہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ فاطمہ حسن کو ہر محب وطن شہری کی طرح اپنے وطن سے جذباتی لگاؤ ہے۔

غزل اور نظم کے علاوہ فاطمہ حسن نے بہت ہی عمدہ ہائیکو بھی کہے ہیں۔ مثلاً وہ کہتی ہیں

جنگل کتنے کٹتے جاتے ہیں
گھر تو پھر بھی نہیں بن پاتے
آنگن بٹتے جاتے ہیں

فاطمہ حسن کو ہم نے ان کی نظموں اور غزلوں میں ایک حساس شاعرہ کے روپ میں دیکھتے ہیں لیکن وہ نعت بھی وجدانی کیفیت میں ڈوب کر کہتی ہیں۔ شاعرہ کی اس کیفیت کا اندازہ اس کے نعتیہ اشعار سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔

میں بکھیر دوں اسے حرف حرف
میں سمیٹ لوں اسے لفظ لفظ
میں عقیدتوں کی زبان لکھوں
میں محبتوں کی ثنا لکھوں

جدید اردو نظم کو جن ناموں نے اعتبار بخشا ہے، منصورہ احمد ان میں سے ایک ہیں۔ ان کی نظمیں ان کے اسٹائل کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ گہرائی کے ساتھ ساتھ تلازمات کا التزام ان کے قلم کے جوہر اپنی اپنی جگہ دمک رہے ہیں۔ ان کی نظم کی باطنی فضا واقعتاً بڑی شاعری کا پتہ دیتی ہے۔

جدید تر اردو شاعری کی پہچان منصورہ احمد کی لطیف و بلیغ نظموں کا اوّلین شعری مجموعہ ''طلوع'' کے نام سے طبع ہو چکا ہے جو منصورہ احمد کے تخلیقی سفر میں اہم سنگ میل قرار پاتا ہے لیکن بطور خاص منصورہ احمد کی نظموں کا ذکر کیا جائے تو ان میں مستقبل گونجتا ہوا سنائی دیتا ہے۔

منصورہ احمد ان شعراء و شاعرات میں سے ہیں جو ابتداء ہی سے اپنی الگ

پہچان قائم کر لیتے ہیں۔ وہ گزشتہ بیس برس سے شعر کہہ رہی ہیں ان کی غزلوں میں تہہ داری اور نظموں میں وسعت خیال پائی جاتی ہے۔ وہ باریک اور نازک جذبات کو بڑی کامیابی سے اپنی گرفت میں لیتی ہیں۔ اردو کی شعری روایت کے رچاؤ کے ساتھ منصورہ احمد نے اپنے لہجہ میں جدت اور ندرت کا مظاہرہ کیا ہے، ان کی شاعری میں فکر و فن یکجا ہیں۔

منصورہ احمد کو وزیراعظم اسلامی جمہوریہ پاکستان نے ''طلوع'' پر وزیراعظم ادبی انعام برائے سال 1997ء عطا کیا ہے۔ منصورہ احمد کی نظمیں موثر، حسین اور اس کے انفرادی اسلوب میں کامیاب ہوتی ہیں۔ یہ شاعرہ بہت تیزی لیکن توازن کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہیں۔ اردو نظم میں منصورہ احمد نے مسلسل کئی جاندار نظمیں لکھ کر اپنے انفرادی وجود کا بھرپور اعلان کر دیا ہے۔ ''رتجگے'' اور ''کتبہ'' اردو نظم کی گہرائی اور بلاغت کے لاثانی نمونے ہیں۔ ''کتبہ'' کی ایک ایک لائن انسانی زندگی کے المئے کا نوحہ ہے۔

کتنی صدیاں روتے تو اس قلزم کی اک بوند بنے گی
جس کے منجدھاروں میں اس لڑکی کا گھر تھا

کتنے بے پناہ مصرعے ہیں اسی طرح ''رتجگے'' کی آخری دو لائنیں دیکھیں۔

جاگتی آنکھ میں خواب ڈھلتے نہیں
برف کے پیڑ پر پھول کھلتے نہیں

اپنے اندر کتنا حسن کتنا کرب سمیٹے ہوئے ہیں۔ اس نظم ''اختتامی رتوں''،

''آنکھ میں رتجگے و دیے''، ''بے ابر ساعتیں''، ہجر کے ضابطے''، ''درد کا منشور''، ''دھجیوں سے بنی رات''، ''برف کے پیڑ'' اور ''کرچیوں سے بنی آنکھ'' وغیرہ کو دیکھئے یہ اردو شاعری کی نئی اور بلیغ اور ہمہ گیر دلکشی ہے۔

منصورہ احمد اپنی نظموں میں اپنے ماحول کے دکھ، درد کا اظہار موثر انداز میں کرتی ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ وہ اپنے غیر معمولی اظہار سے اپنے قاری اور سامع کو مرعوب نہیں کرنا چاہتی بلکہ اس غیر معمولی پن میں جو تازگی یا انبساط مضمر ہے۔

اس میں نہایت آہستگی سے شریک کر لیتی ہے۔ اس کی شاعری اچھی یا بڑی شاعری بننے کی صلاحیتیں رکھنے کا یقین دلاتی ہے۔ اور وہ نئی سوچوں اور نئے احساسات کو ترتیب دیتی ہے۔ منصورہ احمد نے جن موضوعات کا احاطہ کیا ہے اور ان کو نظم کی شکل میں ڈھالا ہے ان میں بجا طور پر شاعرہ کی گرفت بہت مظبوط محسوس ہوتی ہے۔ ''کتبہ'' اور ''رتجگے'' اردو نظم کی گہرائی اور بلاغت کے لاثانی نمونے ہیں اور شاعرہ کے حساس دل سے نکل کر تیروں کی طرح دلوں میں پیوست ہو جانے والی نظمیں ہیں جو اندر ہی اندر اترتی چلی جاتی ہیں۔

منصورہ احمد نے جتنی نظمیں بھی کہی ہیں وہ ہر لحاظ سے مکمل نظمیں ہیں۔ جیسے کہ ان کی دیگر نظموں میں ''مجھے رستہ نہیں ملتا''، ''میں مجرم ہوں''، ''ایک سوال'' بھی عمدہ اور موثر نظمیں ہیں۔

''مجھے راستہ نہیں ملتا''، ہماری سماجی زندگی کی بہترین عکاسی ہے جو منافقت، نفرت، تعصب سے آلودہ تر ہوتی جا رہی ہے۔

''میں مجرم ہوں''، بے اصول معاشرے میں کھڑی تنہا اور انا پرست لڑکی کی داستان ہے جو اصولوں قدروں اور سچائیوں کی صلیب اٹھائے ہوئے ہے۔ وہ کب تک اکیلے یہ صلیب اٹھائے کھڑی رہے گی، اس کا جواب کس کے پاس ہے۔

اسی طرح اس کی نظم ''ایک سوال'' ایسے جذبوں کی نظم ہے جن کا کوئی نام نہیں ہوتا۔

امتیاز علی خاںؔ کے لفظوں میں، ''کوئی آواز دیتا ہے'' میں آواز کو غیر مُرئی سے مُرئی بنانے میں منصورہ احمد نے جو کمال دکھایا ہے وہ اسی کا حصہ ہے۔ حریر و پرنیاں جیسی صداؤ'' اور آواز کے لمس اور آواز کے حسن کو ''فاختہ'' کے ڈھیر سے کومل پروں میں منتقل کردینا اور ہر لفظ میں گھنگرو باندھنا اور لہو میں دیوالیاں سجانا۔ یہ شاعری کا وہ طلسم ہے جسے اس دور میں منصورہ احمؔد جگا رہی ہے۔ اسی طرح ''یہ لمحہ بھی ابد ہے'' کی سی نظم شائد ہی کسی دوسری زبان میں کہی گئی ہو۔ ''بس اک تارا چمکتا'' میں شاعرہ نے بڑے سلیقہ سے عقیدے اور معاشرے اور پرانی قدروں کی جکڑ بندیوں سے رہائی پانے کی شدید خواہش کا جو دھیما دھیما اظہار ملتا ہے۔ اس نے متذکرہ نظم کو ایک ایسی سرگوشی بنا دیا ہے جس میں اَبدیت کی گونج ہے۔ علاوہ ازیں ''دو قدموں کے تلے پھیلی زمیں'' اور ''آنکھ بھر کا آسماں'' کو ہر انسان کا واحد ورثہ قرار دے کر منصورہ احمد نے ایک حقیقت کو واشگاف انداز میں مگر کتنی فنکاری سے بیان کر دیا ہے۔ علاوہ ازیں منصورہ احمد کی دونوں نظمیں بھی بلا کی ہیں۔

''چلو اب بادباں کھولیں'' اور ''کرچیوں کی ریت میں تنہائی'' اگانے والی شاعرہ نے نظم ''جلسۂ عام'' میں تو اس دور کی سیاست اور معاشرت اور تہذیب و ثقافت کی شعری تاریخ مرتب کر دی ہے۔ اس دور میں اس اعلیٰ پائے کی نظمیں بہت کم لکھی گئی ہیں۔

منصورہ احمؔد جس طرح جدید نظم پر حاوی ہے اسی طرح صنفِ غزل میں بھی زندہ رہنے والے شعر کہتی ہے۔

جب آنگن میں چاند اترے تو کس چاؤ سے مہندی گھولوں
پھر کورے ہاتھوں میں بھر لوں اک لمبے ہجر کی سوغاتیں

میں اپنی ہر ہر دھڑکن میں اس کی آہٹ کا گیت بنوں
کیوں آہن گر کی بستی میں ڈھونڈوں خوشبو کی باراتیں
اس سے کرنا گفتگو بس آتے جاتے موسموں کی
اور سرگرداں ہوا سے اپنے دل کی بات کہنا

گو کہ منصورہ احمد غزل کم کم کہتی ہیں لیکن یہ شاعرہ ان شعراء کی صف میں پوری خود اعتمادی کے ساتھ شامل ہو چکی ہے جو نظم اور غزل دونوں اصناف میں کامیابی سے تخلیق فن کر رہے ہیں۔

تاہم میرا خیال ہے کہ منصورہ احمد کا تخلیقی جوہر غزل کی نسبت نظم میں ہی بھرپور طور پر کھل کر سامنے آتا ہے۔

منصورہ احمد کی نظموں میں شاعرانہ حسن احساس کی شدت اور جو بلندی فکر نظر آتی ہے اس سے اس امر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ فن شعر و سخن میں کس قدر اپنا ایک اونچا مقام رکھتی ہے۔ عملی سطح پر وہ نظم کی ایک مشاق اور تیز ذہن شاعرہ کے طور پر ابھری ہے اور وہ صرف تخلیقی سچائی پر یقین رکھتی ہے۔

پاکستانی ادب کے جدید شعر و سخن میں نوشی گیلانی ایک جرأت مند اور باحوصلہ خاتون ہے۔ مارچ 1967ء کو بہاولپور میں نشاط مسعود گیلانی پیدا ہوئیں جو آجکل نوشی گیلانی کے نام سے اردو شاعری میں ممتاز اور منفرد مقام پر نظر آ رہی ہے۔ اس کی شخصیت کا خلوص اس کی باطنی سادگی اور فطری معصومیت اس کی ہر نئی شعری تخلیق اس معیار پر پوری اترتی دکھائی دیتی ہے چنانچہ نوشی گیلانی کا لہجہ بھی یقیناً جدا

اور مختلف ہے۔

محبتیں جب شمار کرنا تو سازشیں بھی شمار کرنا
جو میرے حصے میں آئی ہیں وہ اذیتیں بھی شمار کرنا

اس خوبصورت شعر کی تخلیق کار خوش فکر اور خوش گو، نوشی گیلانی سر تا جذبات کی حدت کو محسوس کرتی ہے اور پھر اپنے جذبات واحساسات کو خوبصورت لفظوں میں اجاگر کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

یہ کیسی دھند میں ہم تم سفر آغاز کر بیٹھے
تمہیں آنکھیں نہیں ملتیں ہمیں چہرہ نہیں ملتا

ہمیں نہ دیکھ زمانے کی گرد آنکھ سے
تجھے خبر نہیں ہم تجھ کو کتنا چاہتے ہیں

زمانے والوں سے چھپ کر رونے کے دن نہیں
اسے یہ کہنا اداس ہونے کے دن نہیں

ان اشعار کو پڑھنے کے بعد پروین شاکر نے یوں اظہار خیال کیا تھا، ''جب آپ ایسا حسن تخلیق کرنے لگیں تو بے نازی آپ کا Privilege بن جاتی ہے۔ نوشی گیلانی کی کچھ نظمیں البتہ پریشان کن ہیں۔ نوشی گیلانی کی ایک نظم ہے ''کشف'' بہت عرصہ پہلے جب میں نوشی کی عمر کی تھی اور ''خوشبو'' کی شاعری کر رہی تھی تو

میری بھی ایک نظم کا عنوان یہی تھا۔ اس عنوان سے نظم جب نوشی گیلانی نے لکھی تو اس کی صورت یہ ہوئی۔

مجھے محسوس ہوتا ہے
جہاں میں آنکھ جھپکوں گی
وہیں پر حادثہ ہو گا

کیا دہشت کا زمانہ اس age سے شروع ہونے لگا ہے۔ یہ ہم سب کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔ نوشی گیلانی کی نظموں میں ایک اور چیز جو آپ کو ڈسٹرب کرتی ہے وہ ہوا کا استعارہ ہے۔

امجد اسلام امجد کے لفظوں میں ''نوشی کی نظموں کا سب سے محبوب اور مرغوب استعارہ ''ہوا'' ہے۔ اس نے ان نظموں میں ''ہوا'' کے اتنے زیادہ تلازے استعمال کیے ہیں اور ایسی خوبی اور خوبصورتی سے انہیں برتا ہے کہ ''ہوا'' اس کی نظموں کا ایک باقاعدہ کردار بن گئی ہے''۔ مختلف نظموں سے کچھ لائنیں دیکھیے۔

ہوا کو لکھنا جو آگیا ہے
اب اس کی مرضی کہ وہ خزاں کو بہار لکھ دے
بہار کو انتظار لکھ دے

''اختیار''
محبتیں جب شمار کرنا

ہوا بے شکل ہے پھر بھی کئی شکلیں بناتی ہے
کئی منظر سجاتی ہے
ہوا کب ہاتھ آتی ہے

"ہوا کب ہاتھ آتی ہے"
محبتیں جب شمار کرنا

ہو ا کو خوشبو کو ساتھ رکھنا جو آگیا
اب اس کی مرضی
کہ وہ وفا کے تمام رنگوں، تمام جذبوں کو ساتھ رکھے
کہ روشنی کو شگفتہ خوشبو سے دور کر دے
ہوا کو خوشبو کو ساتھ رکھنا جو آگیا

"سمجھوتا"
محبتیں جب شمار کرنا

نوشی گیلانی نے بڑی خوبصورت نظمیں کہی ہیں لیکن اس کے شعری مجموعوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ نوشی کا مزاج غزل کا مزاج ہے۔ اس نے اپنی غزلوں میں تغزل کو بڑی بے ساختگی کے ساتھ قائم رکھا ہے۔

اندھیری رات میں جیسے چراغ جل اُٹھیں
یہ کیا طلسم تیرے اسم بے مثال میں تھا

امجد اسلام امجد لکھتے ہیں، "اس کی شاعری میں ہر ہر قدم پر آپ اس کی عمر کی آواز سن سکتے ہیں"۔ اس نے جذبوں کے کچے پن اور خواب و خواہش کی سوندھی بکھرتی ہوئی خوشبو کو قید کر لیا ہے، مگر اسے قید کرنے کی کوشش نہیں کی اور یوں یہ مہک اس کے کلام میں ہر جگہ پھیلتی اور پھوٹتی دکھائی دیتی ہے۔

صبحدم اس کا بدن تھا میری خوشبو کا سفر
کب گماں تھا وصل اتنا معتبر بن جائے گا

نوشی گیلانی کا پہلا شعری مجموعہ "محبتیں جب شمار کرنا" (مطبوعہ: فروری 1993ء) اردو کی عصری شاعری میں واقعی تازہ ہوا کے جھونکے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا یہ شعری مجموعہ لفظ و معنی کے باہمی رشتے کے پہچان کی سعی اور اس کی ندرت کا مظہر ہے۔ نوشی گیلانی اپنی دھڑکنوں سے منافقت نہیں کرتی۔ غزل میں وہ جن کومل احساسات کی ترجمانی کرتی ہے وہ نوشی گیلانی ہی کا حصہ ہے۔ نسوانی نفسیات کا خوبصورت رنگ اس کے کلام میں بکھرا دکھائی دیتا ہے۔

تنہائیوں کی شب میں ترے قرب کی مہک
اس میں برا بھی کیا ہے اگر چاہیے مجھے

بھلا کیا دیکھ کے آنگن میں سلگتی لڑکیاں جانیں
کہیں چُھپتے ہیں آنسو آنچلوں میں منہ چھپانے سے

"محبتیں جب شمار کرنا" کی ہر دلعزیزی کے باوجود نوشی گیلانی نے عجلت کا

مظاہرہ نہیں کیا، اور پانچ برس کے وقفے کے بعد اس کا دوسرا شعری مجموعہ ''اداس ہونے کے دن نہیں ہیں'' کے عنوان سے 1998ء میں طبع ہوا۔ دیکھنا یہ ہے کہ جس جذبے کی صداقت کو موضوع سخن بنایا ہے اس میں کتنی گہرائی اور گیرائی ہے۔ چنانچہ نوشی گیلانی کے اس تازہ مجموعہ سے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

میں تو محدود سے لمحوں میں ملی تھی اس سے
پھر بھیٔ وہ کتنی وضاحت سے مجھے سوچتا ہے

کسی کے لمس کا یہ معجزہ ہے
بدن سارا سنہرا ہو گیا ہے

بدن کی سرزمین پر تو حکمران اور ہے
مگر جو دل میں بس رہا ہے مہربان اور ہے

صبح کی ہوا تجھ کو وہ ملے تو کہہ دینا
شام کی منڈیروں پر ہم دئیے جلائیں گے

جب یقیں کی باہوں پرشک کے پانوں پڑ جائیں
چوڑیاں بکھرنے میں دیر کتنی لگتی ہے

نظم اور غزل کے علاوہ نوشی گیلانی کی نعت بھی منفرد ہے لیکن اس کی نعتیہ نظم میں رسمی انداز کی تعریف و منقبت کے اظہار کے بجائے سچے، کھرے اور پر

خلوص اندرونی کرب کا اظہار ملتا ہے۔ اس کی نعتیہ نظم ''خاتم المرسلین'' کا یہ حصہ ملاحظہ ہو۔

علم کے شہر کے تاجدار و امیں
خاتم المرسلینؐ
تیری رحمت کے سائے کے محتاج ہیں
آسمان و زمیں
خاتم المرسلینؐ
روشنی بھی تری ذات کا عکس ہے
حسن بھی تری بات کا عکس ہے
جس طرف آنکھ اٹھتی ہے تو ہے وہیں
حسن عرش بریں
خاتم المرسلینؐ

یاسمین حمیدؔ کا شمار ہمارے عہد کی ممتاز اور منفرد شاعرات میں ہوتا ہے۔ اب یاسمین حمیدؔ نے شاعری میں غزل کے علاوہ صنف نظم کو بھی اپنے شعری تجربات کے اظہار کا وسیلہ بنالیا ہے۔ گویا شاعری میں غزل گوئی یاسمین حمیدؔ کی پہلی محبت ہے اور نظم نگاری کی جانب وہ قدرے دیر سے متوجہ ہوئیں۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''پس آئینہ'' (مطبوعہ: باردوم 1994ء تھا۔

''حصار بے در و دیوار'' (مطبوعہ: 1995ء) دوسرا مجموعہ کلام ہے۔ جس میں غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی شامل ہیں۔ 1996ء میں ان کا تیسرا مجموعہ کلام ''آدھا دن آدھی رات'' کے عنوان سے طبع ہوا۔

یاسمین حمیدؔ کی نظموں میں شوخی بیان بھی ہے اور فنی پختگی بھی۔ ان کی

شاعری میں روایت اور جدیدت کا امتزاج پایا جاتا ہے اور ان کے کلام میں مشاہدات کی سچائی جذبوں کی رعنائی اور افکار کی گہرائی بھی ملتی ہے۔ یاسمین حمید کی نعتیہ نظم نئی جہت اور دلی جذبات لیے ہوئے ہے۔ چنانچہ جدید نظم نگار خواتین میں یاسمین حمید کی آواز اپنی شادابی توانائی اور حسن کاری کے سبب جاذب توجہ ثابت ہوئی ہے۔

یاسمین حمید اپنی ہمعصر شاعرات سے مختلف انداز میں سوچتی اور منفرد انداز میں اظہار کرتی ہے۔ اس کے لہجہ میں نرمی اور مٹھاس کے ساتھ ساتھ سادگی اور تاثر غزل کو اس کے حقیقی مزاج کی لطافت سے ہمکنار کردیتے ہیں۔

کھڑی میں آخری سیڑھی پر اُوپر دیکھتی ہوں
فلک کی آنکھ میں تازہ اشارے ڈھونڈتی ہوں

یاسمین حمید، اپنے احساسات و جذبات کے اظہار کے سلسلے میں لفظوں کے انتخاب میں دیگر شاعرات سے زیادہ محتاط نظر آتی ہے اور اس کے اشعار میں کہیں کہیں نیاپن نظر آتا ہے لیکن اس کی غزل کا انداز، روایت کے بے جا اثر سے پاک ہے اور شاعرہ کے کلام کی اثرانگیزی کا اعتراف کئے بغیر رہا نہیں جاسکتا۔

بہت ہی تیز ہے خنجر کسی کے لہجے کا — مرے سلے ہوئے ہونٹوں کو کھولنا چاہئے

ہمیں خبر تھی بچانے کا اُس میں یارا نہیں — سو ہم بھی ڈوب گئے اور اُسے پکارا نہیں

اُس کے شکستہ وار کا بھی رکھ لیا بھرم — یہ قرض ہم نے زخم کی صورت لوا کیا
لب کھلے چہرہ شفق آلودہ آنکھوں میں ہنسی — حسن کی ژولیدگی ہے کس قدر سلجھی ہوئی

گزشتہ چند برسوں میں جن اہل قلم خواتین نے اُردو شعر و ادب میں اپنا مقام بنایا ہے ان میں ثمینہ راجہ کا نام بھی شامل ہے' انہوں نے خود کو محض ایک اچھی شاعرہ ہی نہیں منوایا بلکہ ان کی ادارت میں نکلنے والے دو ادبی مجلوں ''آثار'' اور ''کتاب'' کو دیکھ کر ان کی ادارتی صلاحیتوں کا بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ اب تک ان کے چھ شعری مجموعے ''ہویدا''۔ ''شہر سبا''۔ ''اور وصال''۔ ''خوابنائے''۔ کے علاوہ ''باغ شب'' اور ''بازید'' بھی طبع ہو چکے ہیں۔

ثمینہ راجہ' غزل اور نظم دونوں اصناف میں شاعری کرتی ہیں وہ اپنے اسلوب کی پختگی' فکری تنوع اور لہجے کی تازگی کے باعث شعر و ادب میں منفرد اور نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ انہوں نے وادیء شعر میں بہت خوبصورت گلاب کھلائے ہیں' ان کی شاعری کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے سوچنے کا انداز دیگر شاعرات سے مختلف اور جدا بھی ہے وہ فعال نظر اور متحرک فکر والی شاعرہ ہیں۔ نظم ہو یا غزل یا نثری نظم شاعرہ کا رویہ لفظوں میں جان پیدا کرتا ہے اور ایک مکمل منظر میں اپنے اسرار منکشف کر دیتا ہے۔

؎ میں تمہارے عکس کی آرزو میں بس آئینہ ہی بنی رہی
کبھی تم نہ سامنے آ سکے کبھی مجھ پہ گرد پڑی رہی

وہ عجیب شام تھی آج تک مرے دل میں اس کا ملال ہے
مری طرح جو تری منتظر ترے راستے میں کھڑی رہی

ہوئی اس سے جب میری بات بھی تھی شریکِ درد وہ ذات بھی
تو نجانے کون سی چیز کی مری زندگی میں کمی رہی

میرے لہو کی چاٹ لگی ہے تجھے مگر
میں کتنی غم زدہ ہوں بدن کو تراش کر

ان کے مجموعہ ہائے شعری کے مطالبہ سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ثمینہ راجہ نے اپنے شعری مشاہدے۔ شعری تجربے اور شعری کیفیات کی بھرپور ترجمانی کر دی ہے۔

ثمینہ راجہ نے جو کچھ محسوس کیا وہی کچھ کہا' ان کے کلام کا بڑا وصف اس کی دلپذیری ہے' جدت فکر اور جدت اسلوب لیکن انہوں نے اپنا شعری سفر اپنے سہارے طے کیا ہے' دوسروں کے بنائے۔ سکھائے اور دیئے ہوئے اسالیب سے انہوں نے کچھ نہیں لیا ہے یہی وجہ ہے کہ آج ہماری شاعری میں جو عدم اعتماد کی کیفیت ہے ان کے مجموعے اس کیفیت سے ہمیں دور رکھتے ہیں' یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ پہلے مجموعہ کے

بعد دوسرے مجموعہ تک پہنچتے پہنچتے بہت سے شاعروں کی سانس اکھڑ جاتی ہے لیکن ثمینہ راجہ کی شاعری کا ہر مرحلہ اعتماد کے ساتھ طے ہوا اور طے ہو رہا ہے غزلوں کے علاوہ ثمینہ راجہ کی نظموں میں بھی سوز و سرور کی سانجھ ملتی ہے' ان کی نظموں کے عنوانات اور مضامین میں ایک تاثر پایا جاتا ہے اور شاعرہ ذات اور کائنات کے حوالے سے خوفزدہ زندگی' حیرت و استعجاب سے بھرے شب و روز کی روداد بن گئی ہیں لیکن شاعرہ نے اپنے احساسات' جذبات اور مشاہدات کا اظہار جرأت مندی کے ساتھ کھل کر کیا ہے بعض نظموں میں ان کا لہجہ سخت ہے جس سے ان کے اظہار کی سچائی واضح ہوتی ہے اور جذبات کے اظہار میں شاعرہ کی گرفت بہت مضبوط ہے۔

دل کو پتھر سے جو ٹکرایا تو جلنے لگی آگ
تن پہ صحرا کو لپیٹا تو بھڑکنے لگی ریت

ترے سناٹے میں اس طرح سے گونجی مری بات
کہ مرے پاؤں کے نیچے سے سرکنے لگی ریت

کس کی آواز کا جادو تھا کہ بہنے لگی رات
کس کی آہٹ کا فسوں تھا کہ دھڑکنے لگی ریت

ثمینہ راجہ کی شاعری میں جذبہ ء محبت کے علاوہ تمام وہ جذبے اور احساسات بھی شامل ہیں جو عہد موجود کے انسان میں زندگی کے نامساعد حالات، معاشی، معاشرتی، سیاسی اور تہذیبی اقدار کی شکست و ریخت کا نتیجہ ہیں۔ مثلاً انھوں نے غزلوں میں ہمعصر شاعرات سے مختلف انداز میں سوچ کا اظہار کیا ہے۔

بس ایک بار ملاقات کا ہوا وعدہ
وہ دن اور آج کا دن نیند پھر نہیں آئی

ماتھے کی محراب پہ اب تک روشن ہے
اس کے ہونٹوں نے جو دیا جلایا تھا

تنہا سر انجمن کھڑی تھی
میں اپنے وصال سے بڑی تھی

طالب تھا کوئی مری نفی کا
اور شرط یہ موت سے کڑی تھی

؎ وہ خود کو خدا سمجھ رہا تھا
میں اپنے حضور میں کھڑی تھی

شہناز مزمل کا تخلیقی سفر اپنے منفرد شعری اسلوب کے ساتھ جاری ہے۔۔۔ اس کی خوبصورت آزاد نظموں میں ''رتجگوں کی مسافت ''۔ ''لاصلی کی سرزمین''۔ ''زرد موسم کا عذاب''۔ ''کربلا کے نام'' اور ''پگھلتی برف''۔ ایک حد تک علامتی ضرور ہیں لیکن ترسیل فکر کے تقاضوں پر پوری طرح منطبق ہیں۔ اس طرح ''موم کے سائبان''۔ ''احساس کی زنجیر''۔ ''حسرتوں کی قتل گاہ''اور ''خاموشی جان لیوا ہو گئی''۔ ایسی کامیاب اور سدابہار نظمیں ہیں جو شعور کی دہلیز پر نئے امکانات کی روشنی بکھیر رہی ہیں۔

ثاقب رزمی کے خیال میں۔ ''شہناز مزمل کی شاعری مسلسل تلاش اور جستجو کی شاعری ہے وہ اپنی نظم ''سرد سناٹا'' میں گہری خاموشی سے گھبرا کر اپنی سوچ میں ہلچل اور اپنے رگ و پے میں تیز سرسراہٹ کی آرزو کرتی ہیں۔

خدایا
برف سوچوں کو میری پگھلا
نیا سورج جلا کر
میری یخ بستہ سوچوں کو روانی دے
میرے افکار کو مربوط کر اور زندگانی دے

شہناز مزمل نے اپنے فنی سفر کا آغاز آزاد نظم سے کیا لیکن شہناز مزمل کے اسلوب اظہار کا صرف ایک رُخ پیش کرنا اور غزل سے ہٹ کر یہ ثابت کرنا کہ وہ محض نظم کی شاعرہ ہے کسی طور بھی درست نہیں وہ یقیناً آزاد نظم میں اپنی انفرادیت کا پرچم اٹھائے اور تخلیقی قوت سے کام لیتے ہوئے صفِ اول میں جگہ بنانے کی خاطر پر عزم دکھائی دیتی ہے لیکن ''جرأتِ اظہار'' (شعری مجموعہ) تک آتے آتے اس نے غزل کی وادی کو اپنا مسکن بنایا۔

''میرے خواب ادھورے ہیں'' شہناز مزمل کا تازہ شعری مجموعہ ہے اس کی غزلوں میں کہیں زیادہ وسعت کا احساس نظر آتا ہے۔

خود کو یکجا کر لینے کی کاوش میں
ریزہ ریزہ ہو کر روز بکھرتی ہوں

محض عورت کے دکھ' درد اور جذباتی پسپائیوں کو موضوع بنا کر اگر شاعری کی جائے تو اس کا حصار تنگ اور حلقہء اثر محدود ہو جاتا ہے۔ بلا شبہ ادا جعفری' کشور ناہید' پروین شاکر' ثمینہ راجہ اور پروین فنا سید نے اپنے موضوعات کو وسعت ہی نہیں دی ہے بلکہ اپنے اسالیب۔ لفظیات اور نظم کی تکنیکوں میں بھی روایت سے گریز کر کے اپنے اندر کی اپج اور ضمیر کی آواز پر اپنے تجربات کی بنیاد رکھی۔

ڈاکٹر رشید امجد کے لفظوں میں ''پروین فنا سید ایک واضح نظریاتی وابستگی کی شاعرہ ہیں''۔ انھوں نے شہر آشوب اور ذات آشوب کے امتزاج سے اپنی شاعری کا خمیر تیار کیا ہے۔ اس مجموعی آشوب کا تجربہ کیا جائے تو گھر۔ آنگن۔ عصری مسائل اور وطنیت کے کئی زاویے منعکس ہوتے ہیں۔ فرد کے آشوب سے اجتماعی آشوب تک بہت سے مسائل میں ان کے یہاں جو تضادات آئے ہیں ان کی نوعیت نفسیاتی بھی ہے اور سیاسی اور سماجی بھی۔ یہ انفرادی تنہائی اپنے عہد آشوب سے ہم آہنگ ہو کر اجتماعی تنہائی میں بدل جاتی ہے جو آج کے انسان کا مقدر ہے۔

دشت کے بے اماں سراؤں میں
ایک میں ایک میری تنہائی

یہ تنہائی شروع تو شخصی واردات سے ہوتی ہے لیکن پروین فنا سید نے اسے ایک بڑے سیاسی اور سماجی پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے جس میں عصری جبریت کا احساس نمایاں ہے۔

زرد سائبان سے

ڈھکا شہر

وقت کی جاگتی عدالت سے

اپنی آواز مانگتا ہے

پروین فنا سید کے پہلے شعری مجموعے "حرف وفا" سے "تمنا کا دوسرا قدم"۔ موضوعاتی مجموعے "لہو سرخرو ہے" اور "یقین" تک نظموں اور غزلوں دونوں اصناف رزم و بزم کی تصویریں موجود ہیں۔

ے چیخوں کہ چپ رہوں کہ پکاروں لہو لہو
اے شہر کیا ہوئی تیری مٹی کی آبرو

ے ہم نے سوچا تری آنکھیں تو اُٹھیں لب تو ہلیں
اس لئے ہم تیری محفل سے چلے آئے ہیں

صنف سخن میں تمام تر مخالفت کے باوجود غزل دوسری اصاف سخن پر برتری رکھتی ہے اور ایسا ہونا بھی چاہیے کیونکہ یہ اپنے طرز اسلوب۔ رنگارنگی اور ہمہ گیری کے باعث عوام و خواص کی پسندیدہ ترین صنف سخن ہے۔ پاکستان کے بیشتر شعراء اور شاعرات صنف غزل میں اپنے احساسات ۔ جذبات اور مشاہدات کا اظہار کر رہی ہیں۔

خوبصورت اور مؤثر لب و لہجہ کی معروف شاعرہ شاہدہ حسن نے بھی غزل کی اسی وسعت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مختلف مضامین نہایت لطیف انداز میں اپنے کلام میں بیان کئے ہیں۔

نزاکت خیال اور لطافت بیان جو کہ غزل کے بنیادی عناصر ہیں شاہدہ حسن نے ان محاسن کو خوب نبھایا ہے۔ شاہدہ حسن کا شعری مجموعہ ''ایک تارہ ہے سرہانے میرے'' کے عنوان سے طبع ہو چکا ہے جس میں نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ ان کے یہاں مختلف شعری کیفیات نظر آتی ہیں۔ شاہدہ حسن نہ صرف جدید یا جدید تر شعراء پر نظر رکھتی ہیں بلکہ وہ اُردو کے کلاسیکی سرمائے پر بھی گہری نظر رکھتی ہیں اور پھر مطالعے اور مشاہدے کے تال میل سے وہ ایسے ایسے پہلو دار شعر تخلیق کرنے میں کامیاب نظر آتی ہیں۔ جن میں جذبے کی گھلاوٹ۔ فکر کی شادابی۔ احساس کی گرمی۔ طرزِ ادا کی ندرت اور جدید حسیّت شیر و شکر کی طرح آمیز نظر آتے ہیں اور یہ امتزاج ان کے کلام کو ایک ایسی کیفیت کا حامل بنا دیتا ہے۔

جس کاذائقہ عہد موجود کی شاعری کی یکسانیت سے بالکل الگ ہے۔

شاہدہ حسن ہمارے دور کے ان چند نئے شاعروں میں سے ہیں جن کی لفظیات کا دائرہ خاصا وسیع ہے انھیں پرانی بات بھی نئے اسلوب میں کہنے پر قدرت حاصل ہے کئی قدیم علامتیں ان کے جذبے میں تحلیل ہو کر نئے مفاہیم اور جدید حسیّت کی آئینہ دار بن جاتی ہے

نخل سبز۔باد سموم۔آب جو۔زہراب۔نبیذ شب۔ مقتل شب۔ تنہا نفسی۔کشتِ غم۔ غبار رہگزر۔ سوار دشت۔ تصویر انتظار۔ وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جن سے ہماری کلاسیکی شاعری نے بھر پور استفادہ کیا ہے۔ شاہدہ حسن کے یہاں ان کے فنکارانہ برتاؤ اور تخلیقی استعمال کی چند مثالیں دیکھیے۔

وہ نخلِ سبز تھا، بادِ سموم سے تھا ہلاک
میں آبِ جو تھی، تو زہر اب ہو گئی میں بھی

چکھ رہی تھی میں نبیذ شب تنہا کا مزہ
پھر کبھی رات کا آنچل نہ ہوا نم مجھ سے

مقتلِ شب میں یہ تنہا نفسی کیا معنی
میری آنکھوں کے مقابل تو کئی لشکر تھے

سوارِ دشت کی آہٹ پسِ غبار رہی
تمام عمر میں تصویرِ انتظار رہی

شاہدہ حسن کے متعدد ایسے اشعار پیش کیے جا سکتے ہیں جن کا شمار اس عہد کے منتخب اشعار میں کیا جا سکتا ہے۔

بشریٰ فرخ ریڈیو اور ٹیلی وژن کی معروف فنکارہ ہے۔ اس کے کردار متحرک اور یادگار ہوتے ہیں وہ ہر انداز میں اچھی لگتی ہے۔ لیکن شاعروں اور ادیبوں کو اس وقت خوشگوار حیرت ہوئی جب ۲۰۰۰ء کی ابتداء میں بشریٰ فرخ کا مجموعہ "اک قیامت ہے لمحہ موجود" کے عنوان سے طبع ہو کر منظر عام پر آیا۔

خاطر غزنوی کے لفظوں میں "بشریٰ فرخ شاعری میں نوارد تو یقیناً ہیں لیکن محسوس ہوتا ہے کہ ان کے اندر ایک شاعرہ پہلے ہی موجود تھی لیکن اسے لب کشائی کا موقع نہیں دیا گیا تھا۔ وہ دوسروں کے لکھے ہوئے مکالمے بولتی رہی ہے لیکن اب اس شاعرہ نے اپنے خیالات اور جذبات کو شعری سانچوں میں ڈھالنا شروع کیا"۔

"قیامت"، تلخ حقیقت کا علامتی اظہار ہے جسے شعراء نے مختلف انداز میں بیان کیا ہے۔ اور یہ ایک زندہ حقیقت ہے۔ بشریٰ فرخ نے اپنے

احساسات کا اظہار دوسروں سے مختلف انداز میں کیا ہے۔

اک قیامت ہے لمحہء موجود
ہم پر آئے گی کیا قیامت اور

نذیر تبسم لکھتے ہیں۔ ''بشریٰ فرخ نے ذاتی جذبات واحساسات کے اظہار میں جس منفرد لہجے کو تخلیق آہنگ میں برتا ہے۔ وہ اپنی فطری صداقت کے تناظر میں بے مثل نہ بھی ہو توانا ضرور ہے''۔ اور یہ اسلوب بیان بشریٰ فرخ کو ادبی حلقوں میں یقیناً اعتبار بخشتا ہے۔

یوں دوستی کا زہر بدن میں اُتر گیا
اس ایک ہی نشے کے طلب گار' رہ گئے

بشریٰ فرخ شعروادب کے میدان میں نئی ہے لیکن غیر معروف نہیں ہے اس نے کالج کے دور سے شاعری کا آغاز کیا تھا۔ اس کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بالکل نوارد نہیں ہے۔ بشریٰ فرخ کے مضامین شعر روایتی بھی ہیں اور جدید بھی وہ اظہار خیال پر قدرت رکھتی ہے۔

ترے پہلو سے بشریٰ خوشبوئیں یوں اٹھتی رہی ہیں
گلستاں دل کا جیسے عود و عنبر ہو رہا ہے

اس تیرہ و تار فضا میں اسم محمدؐ سے اجالا ہوتا ہے اور ناہید سوچنے لگتی ہے کہ کاش میں اب نہ ہوتی، تب ہوتی اور پھر اپنے عہد کو عہد مصطفےٰ سے ملانے میں کوشاں ہو جاتی ہے''۔

آپ سے ہے محبتوں کو ثبات
ایسے میں آپؐ ہی کا روشن ہاتھ
میری انگلی کو تھام لیتا ہے
کتنی شفقت سے میرے کانوں میں
کوئی میرا ہی نام لیتا ہے
کرنیں رم جھم برسنے لگتی ہیں
منزلیں راستوں سے جھانکتی ہیں
حوصلے مور بن کے ناچتے ہیں
دوستی آپؐ سے ہے مدت کی
(بنجر دل سیراب کرو)

فرخ زہرا گیلانی، روایت پسند قبیلہ گیلانی سے تعلق رکھتی ہیں اور درس و تدریس کے شعبہ سے وابستہ ہیں، وہ فرض شناس استاد کی حیثیت سے تدریسی خدمات بطریق احسن انجام دے رہی ہیں۔ یہ ان کی ہمت اور جرأت ہے کہ تدریسی اور گھریلو مصروفیات اور خواتین پر معاشرتی قدغنوں کے باوصف شعلہ ء سخن کو بجھنے نہیں دیا اور اپنے احساسات کو شعری لفظوں کا پاکیزہ اور حریری جامہ پہنایا ہے۔ وہ بیدار ذہن اور مثبت سوچ کی مالک شاعرہ ہیں۔ ان کے ہاں روایت سے وابستگی اور جدید انداز میں بات کہنے کا ایک خوبصورت امتزاج پایا جاتا ہے۔

ان کی شاعری ذاتی جذبوں کی شدت کی ترجمان ہے ان کے اشعار ان کی اپنی ذات کے حوالے سے خوبصورت الفاظ کے سانچے میں ڈھل کر اپنی حدت اور شدت کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔

فرخ زہرا گیلانی کا شعری مجموعہ "کہر کے اس پار" کے عنوان سے طبع ہو چکا ہے "کہر کے اس پار" کی شاعری فرخ زہرا گیلانی کے مزاج کی آئینہ دار ہے اور شاعرہ کو فن شعر گوئی پر گرفت حاصل ہے' فرخ زہرا گیلانی کے لہجے میں نرماہٹ اور حلاوت کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری میں نسائی جذبات واحساسات کی شدت کا اظہار ملتا ہے۔

ان کی غزلوں میں احساسات کی دھڑکنیں محسوس ہوتی ہیں تو ان کی نظموں میں بھی ایک سوچتے ہوئے ذہن کی کار فرمائی ملتی ہے ان کے کلام میں جذباتِ عشق اور احساس حسن پایا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی مترنم۔ مدھم لے اور درد و غم کی ہلکی ہلکی آنچ سے ایک دمک پیدا کی ہے۔

شاعرہ کا یہ اسلوب بیان ان کے رنگِ سخن کا نمائندہ بھی ہے اور ان کے ذاتی وزمانی مشاہدات کا عکاس بھی "کہر کے اس پار" میں شاعرہ نے اپنے شعری مسلک کا بھر پور اظہار کیا ہے۔ ان کا شعری مسلک انسانیت کی حیات آفرین اقدار سے محبت ہے۔ ظلم۔ ناانصافی اور استحصال کے خلاف آواز ہے ان کے قلب و نظر میں شاعری کا جذبہ ایک ملکوتی و جبروتی و ردیف محسوس ہوتا ہے۔

عورت ہونے کے ناطے فرخ زہرا گیلانی نے عورت کی مجبوریوں اور دکھوں کو شدت سے محسوس کیا ہے۔ ان کے خیال میں عورت کے حوالے سے سماج میں منافقانہ رویے پائے جاتے ہیں۔ سماج عورت کو سوچنے سمجھنے اور محسوس کرنے کے بجائے اسے اپنی

زرخرید لونڈی سمجھتا ہے۔ چنانچہ فرخ زہرا گیلانی نے سماج کے رویہ اور تلخ حقائق کو دکھ کے ساتھ جس انتہا پہ جا کے محسوس کیا اور جس انداز سے اس کا اظہار کیا ہے وہ کچھ انہیں کا حصہ ہے جو ایک نئے امیج کے ساتھ سامنے آیا ہے۔

آنچل کو گر آگ لگائی شملہ بھی جل جائے گا
دیکھو بانہیں رُوٹھ نہ جائیں گجروں کو بدنام نہ کر

جن قدموں میں جنت ڈھونڈی ان میں گھنگھرو باندھ دیئے
اے غیرت کے رکھوالے تو رشتوں کو بدنام نہ کر

ایسا نہ ہو آیا ساون صحراؤں میں کھو جائے
ناگن کہہ کر اس کی پھیلی زلفوں کو بدنام نہ کر

کوچہ ء اظہار پہ فرخ جس تاجر کا قبضہ ہے
اس کو خوش کرنے کی خاطر لفظوں کو بدنام نہ کر

مرحب قاسمی سندھی زبان کے علاوہ اُردو زبان میں بھی تخلیقی اظہار کرتی ہے۔ "سوکھے پتے اور پانی"۔ مرحب قاسمی کی شاعری کا بھی تعارف ہے اور اس کی ذات کا بھی۔ اس مجموعے کی بیشتر نظمیں نثری نظمیں ہیں۔

مرحب قاسمی نئے دور کی عورت ہے جو آج کی پیچیدہ صورت حال سے پوری طرح دوچار ہے اور نہ صرف دوچار ہے بلکہ اس کا ادراک بھی رکھتی ہے اس

کی شاعری میں نئی سوچ۔ تازہ طرزِ احساس اور جدید لب ولہجہ دکھائی دیتا ہے لیکن وہ اپنے آپ کو محض خوابوں سے نہیں بہلا سکتی۔ اپنے لیے خود ساختہ رومانی فضا فرض نہیں کر سکتی۔ جب وہ خواب دیکھنے لگی ہے تو حقیقت کا عفریت اسے بانہوں میں جکڑ لیتا ہے۔ وہ تلملا اٹھتی ہے اور کہتی ہے۔

کیا دنیا میں کوئی نہیں جو اس عفریت کو مار دے
ہم کب تک لٹو رنگ خوابوں کو بیچتے رہیں گے
(خواب)

مرحب قاسمی کے ذہن میں مختلف سوچیں ہمک رہی ہیں حالات کی تلخی نے اس کے ذہن میں کئی سوالات اُٹھا رکھے ہیں یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری میں اپنے عہد کی آواز اور معاشرتی جبر کے خلاف دھیما دھیما احتجاج بھی پایا جاتا ہے جس کا اظہار وہ جداگانہ انداز میں کرتی ہے۔

ایک سوال مجھے ستاتا ہے
میرا قصور کیا ہے مرے رَب
میں کہ جس پہ گناہگاری کا لیبل لگا
کیا اطاعت گناہ ہے
تُو ہی بتا اے خُدا
(قصور)

یہ تشنگی کیا ہے
پھر اس تلاش کا منبع کدھر ہے
اور تخلیق کا مقصد کہاں ہے

(اندر کا راستہ)

ہم وہاں کیوں نہیں ہوتے جہاں ہماری ضرورت
ہوتی ہے

(اسٹاف روم)

فاطمہ حسن کے لفظوں میں۔ "یہ اور ایسے بہت سے سوال مرحب نے اپنی شاعری میں اٹھائے ہیں کیونکہ مرحب نے بنے بنائے مفروضوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔
انکار کا یہ راستہ بڑا مشکل راستہ ہے۔ خواہ زندگی کے رویوں میں ہو خواہ تخلیق کے اسلوب میں۔ مرحب نے بڑی جرأت سے یہ راستہ اختیار کیا ہے۔

ذہن سوچ میں غلطاں
نگاہ متلاشی
نہیں کوئی نہیں۔ کوئی نہیں
آگے سب راہیں بند
ہر طرف اندھیرے ہی اندھیرے
کوئی روشنی کی کرن۔۔ کوئی نہیں کوئی نہیں

(ہیولے)

جب مستقبل سے ہی اعتبار اُٹھ جائے تو راستہ بے حد کٹھن ہو جاتا ہے۔ حقائق کی تلخیوں نے مرحب کو ایک مستقل بے یقینی کی کیفیت سے دوچار رکھا ہے۔ جس کے اظہار کا انداز اس کی نظم کے ایک ٹکڑے میں ملاحظہ ہو۔

بند آنکھوں کے دریچوں پر
سپنے کتنے لمحے ہیں
تمنا منتظر راہ مسدود
سراب ہے کہ مقام قبولیت
کچھ نہ آئے سمجھ؟

مرحب قاسمی کی یہ بے یقینی جو اس کی اپنی ذات تک نہیں بلکہ وہ معاشرے کے جھوٹ اور ریاکاری کا پردہ بھی چاک کرتی ہے ''زندہ لاشیں''۔ ''فرض کا قرض''۔ ''صدیوں کی داستان''۔ وہ نظمیں ہیں جہاں مرحب قاسمی اس جگہ کھڑی نظر آتی ہے جہاں اس کی حساس آنکھیں اپنے گرد پھیلی ہوئی ریاکاریوں کو دیکھ رہی ہیں۔ مرحب قاسمی اس جھوٹ کو دیکھ رہی ہے جو لوگوں نے اپنے اُوپر اوڑھ رکھا ہے اُور بڑی سفاکی سے انہیں بیان کر دیتی ہے۔ ان تلخ حقائق کے اظہار کے لیے اس نے روائتی اسلوب سے انحراف کیا ہے۔

آمنہ بہار رونا کا شعری مجموعہ ''چناروں کی آگ'' کے عنوان سے چھپ چکا ہے اس میں شاعرہ کے اپنے نظریات۔ جذبات اور احساسات کا اظہار ملتا ہے۔ وہ طبقاتی نظام سے متنفر ہے۔ وہ معاشرے میں دوہرے رویّوں۔ ظلم اور استحصال کی بھی مخالف ہے۔

آمنہ بہار کے نزدیک زندگی کوشش۔ جدّ و جُہد اور عملِ پیہم کا نام ہے یہی

روئے اس کی نظموں کے موضوعات ہیں۔ ''آگ کا زیور'' اور اسی نوعیت کی دیگر نظموں میں اس نے خوبصورت اضافے کئے ہیں۔

آمنہ بہار کی مختصر نظمیں بھی اپنا ذائقہ رکھتی ہیں مثال کے طور پر اس کی یہ چند مختصر نظمیں ملاحظہ ہوں۔

دریا کے اس پار کھڑی ہے
اک البیلی نار
سوچ رہی ہے اپنے دل میں
کیسے اتروں پار

(اک البیلی نار)

آج تم نے دِ یا ہے مجھے مشورہ
آج مجھ کو ملی ہیں صلیبیں نئی
آج سورج سی لڑکی غروب ہو گئی
آج کی اہمیت صرف اتنی رہی

(آج کی اہمیت)

کبھی چُوڑی کی کھنک
اور کبھی خوابوں کی دھنک
اور کبھی ساون کی مہک

راستہ روکے، تو میں سوچتی ہوں
چاند نگری سے مجھے
تم نے پکارا شاید

(آواز کا پرتو)

چنانچہ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ آمنہ بہار رونا کی شاعری عصری تقاضوں کی نقیب ہے اس نے اس خوبصورتی۔ مہارت اور فنکارانہ دسترس کے ساتھ جدید تخلیقی رویّوں اور شعری علامتوں کو برتا ہے۔

اس کے کلام میں ایسے جذبوں کا اظہار ملتا ہے جو اس کے دل کی گہرائیوں سے اُبلتے ہیں۔ اس کی شاعری میں اگر چناروں کی آگ کے شعلے ہیں تو کشف زعفران کی زرخیزی بھی ہے۔ ڈل کا سکوت اور جہلم کی روانی بھی ہے۔

آمنہ بہار رونا کی غزل میں اگر میٹھی اور دلنشین رومانیت اُبھرتی ہے تو اس میں درد و کرب اور سوز بھی پایا جاتا ہے۔

عجیب زخم دل مرے گلاب کی طرح کھلے
مگر ہوائے درد و غم انہیں بھی نوچتی رہی

وہ میرا کربِ ذات تھا جو جسم و جاں کو کھا گیا
میں سبز شاخ کی طرح خزاں میں ٹوٹتی رہی

در انجم عارف نے ''درد آشنا'' کی نظموں میں ان موضوعات کو نظم کیا ہے

جو نصف صدی سے ہمارے لیے پھانس بنے ہوئے ہیں اس کی آواز درد مند اور حساس دل کی آواز ہے جو قاری کی نگاہوں سے ہو کر دل سے سوال کرتی ہے۔'' یہ ادراک نذیر قیصر کا ہے۔'' شیشے کا گھر''۔ ''مرد قلندر سے ایک سوال'''' بے چہرہ لوگ''۔ ''واپسی ''اور ''دکھیاری مورکھ ناری''سمیت اکثر نظموں میں ڈرِ انجم عارف کا لہجہ چونکاتا ہے۔

1994ء میں ''رتجگوں کا شہر'' کے عنوان سے اس کا دوسرا مجموعہ کلام چھپ کر منظر عام پر آیا۔

ڈرِ انجم عارف، انگریزی کی پروفیسر ہیں اور ساتھ ہی اُردو کی اچھی شاعرہ بھی ہیں، وہ دیگر اصنافِ سخن کے ساتھ ساتھ غزل پر بھی مضبوط گرفت رکھتی ہیں، جدید غزل گو شاعرات میں کامیاب غزل گو کی حیثیت سے وہ اپنی ایک پہچان رکھتی ہیں اگرچہ کچھ لوگوں کے خیال میں ڈرِ انجم عارف کے اشعار میں علامت اور استعارے کو بہت کم برتا گیا ہے مگر جہاں جہاں ایسا کیا گیا ہے شعروں کا حُسن کچھ زیادہ نکھرا ہے

درد لمحوں میں جو جینے کا سہارا بنتیں
ہم وہ خوشیاں تری محفل میں لُٹا آئے تھے

کب تلک ان پانیوں کے رحم پر چلتے رہیں
اے خُدا کشتی کا اپنی نا خدا کوئی تو ہو

ڈرِ انجم عارف کی غزل میں خارج اور باطن کی کیفیات کا بڑا اچھا امتزاج ملتا ہے لیکن اس کے باوجود ذات کا حوالہ بھی توانا تر ہوتا ہے مثلاً ان کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں

کون دے گا مرے جذبوں کا جواب
تم تو تصویر نما لگتے ہو

تم سے خوشبو کا تصور جاگا
پر تو موج صبا لگتے ہو

بشریٰ اعجاز نے گزشتہ برسوں میں پاکستانی ادب میں اپنی منفرد حیثیت منوالی ہے اس شاعرہ کا کلام خوبصورت اور آواز موءثر ہے۔ اور تیسری کوئی خصوصیت ہے تو اسے بلندیٔ خیال و نظر کہا جائے گا، اس کی شاعری اپنے اندر فکر و احساس کی مختلف النوع جہتیں لیئے ہوئے ہے۔

بقولِ طاہر اصغر۔ ''لا حاصل محبتیں ہر حقیقت کو مجاز دیکھنے کی آرزو، ان کہی کو کہنے کا عذاب۔ نا معلوم کی جستجو کے فن کا اعجاز ہے۔ دل کی خامشی، تخلیق کا کرب ہے اور خاموشی کا ہمکلام ہونا تخلیق کا ظہور ہے۔ بشریٰ اعجاز نے خامشی کا کرب سہا ہے۔''

بشریٰ اعجاز کے کلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے کرب، اضطراب، بے چینی اور بے یقینی سے شاعرہ کی مکمل آشنائی کا پتہ چلتا ہے۔

بشریٰ اعجاز کی شاعری میں صرف موضوعات کا تنوع ہی نہیں ہے بلکہ ایک تخلیقی بے ساختگی بھی ہے ایسی بے ساختگی جو حقیقی ہے۔

اس کی نظم میں موضوعات کی بو قلمونی ہے۔ انسانی زندگی کا قریب ہر جذبہ اس کے ہاں انعکاس پذیر ہوا ہے

تری آنکھوں کی نیلی پتلیوں میں
زندگی کی وسعتوں کا

نرم سا جو خواب رکھا تھا
اسے تعبیر کرنے میں
یہ آنکھیں
دُور کے لمبے سفر پر جا چکی ہیں
خبر کیا اب وہ پلٹیں یا نہ پلٹیں
خبر کیا
جب وہ لوٹیں
اس گھڑی بادل زمیں کا راستہ ہی بُھول بیٹھے ہوں
پرندے ہجر توں کا درد سینے سے لگائے
دُور افق کے پار کھو جائیں
خبر کیا
جب وہ لوٹیں
زندگی خود
واپسی کے راستے پر ہو۔

(میری آنکھوں میں)

نصیر احمد ناصر کے لفظوں میں۔ ''بشریٰ اعجاز کا تعلق اگرچہ آسودہ حال گھرانے سے ہے لیکن معاشرے کے پسماندہ طبقات کا دُکھ، درد انہیں اندر سے مسلسل کچوکے لگاتا رہتا ہے، بظاہر یہ بات عجیب لگتی ہے مگر بشریٰ اعجاز اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ صد افسوس سدھارتھ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے آسودہ گھرانے کی روایات اور قدامت پسندی سے ٹکرا کر نروان کے لیے جگہ تو نہ لے سکی مگر

کاغذ اور قلم سنبھال لیا کہ یہ مجھ جیسی بزدِل اور روایت پسند معاشرے کی لڑکی کے لیے نسبتاً آسان تھا سو میں نے یہ راستہ چُن لیا، لیکن بشریٰ کو شاید معلوم نہیں تھا کہ ایک حساس تخلیق کار کے لیے یہ راستہ جسے انہوں نے آسان سمجھا تھا دراصل نروان لینے سے زیادہ مشکل ہے۔ زندگی کی آسائشوں کے درمیان سچ اور آگہی کے ساتھ زندہ رہنے کی اذیت برداشت کرنا ان آسائشوں کو تیاگ کر مکتی پا جانے سے کہیں آگے کا مرحلہ ہے۔

بشریٰ اعجاز نے بھی بظاہر آسان راستے کا انتخاب کر کے اس آگے کے مرحلے کی اذیت کو اپنے اندر اُتار لیا ہے۔۔۔۔۔ بشریٰ اعجاز کی شاعری میں صرف موضوعات کا تنوع ہی نہیں ہے بلکہ ایک تخلیقی بے ساختگی بھی ہے۔ ایسی بے ساختگی جو حقیقی ہے۔۔۔۔۔۔۔ بشریٰ اعجاز نے محض جذباتی سطح پر لفظوں کے موزائک (MOSAIC) نہیں بنائے بلکہ انہیں گہری معنویت بھی دی ہے۔

شمشاد نازلی کا نام اُردو شاعرات میں امتیازی حیثیت سے اُبھر کر سامنے آیا ہے اس کی شعری تصنیف ''جوانی کی دہلیز پر'' (مطبوعہ =1988ء) کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ فطری جذبات کے اظہار میں الفاظ کے قدرتی رُوپ پر مصلحت کے بہروپ کا خول نہیں چڑھایا گیا ہے۔ شاید ادبی پنڈتوں کے نزدیک اس میں خیالات کی بلند پروازی اور فکری نکتہ آفرینی نہ ہو لیکن ہمارے نزدیک یہی امر اس کا حسن ہے کچی بالی عمریا میں پکی پکی باتیں بگھارنے کو فطری فن سے کیوں موسوم کیا جائے؟

ایک نوجوان لڑکی کے احساسات و جذبات کا اظہار تو کچھ ایسا ہی ہو سکتا ہے۔

قدم ہے جوانی کی دہلیز پر
یہ ماحول جذبات انگیز ہے

وہی میرا الھڑ بدن ہے مگر
لُہو کی روانی بڑی تیز ہے

بالخصوص شمشاد نازلی کی نظمیں ''موڑ پر''،''انتظار''، ''رہگذر''۔''خواب'' وغیرہ ایسی دِل زدہ عورت کی کہانی بیان کرتی ہیں اور دل زدگی کا لازمی نتیجہ دِل گدازی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے چنانچہ دل گدازی موصوفہ کی شعری تخلیقات کا بنیادی جذبہ بن گئی ہے۔

وہی موڑ ہے یہ کہ جس موڑ پر
حادثہ اِک ہُوا تھا
تجھے دیکھ کر
کرچیاں دل کی بکھری تھیں ہر سُو یہاں.....
ان کو چُننے کی خاطر بڑھاتی ہوں ہاتھ
اپنے لہو کی
بڑی تیز سُرخی سے پھر میں ترا نام لکھ کر
یہاں چھوڑ دیتی ہوں
اِس موڑ پر

موڑ پر
(جوانی کی دہلیز پر)

یہ کیسا پانی ہے جو ابھی گرم تھا' ابھی سرد پڑ گیا ہے
مگر یہ ٹھنڈک عجیب ہے، جس سے ہے طرح یوں
بدن جلا جا رہا ہے سارا
ہلوں ذرا بھی...... کہاں گوارا
نہیں ہے یارا...

انتظار
(جوانی کی دہلیز پر)

تب ترے نام کے حروف سے میں
ذہن کو شعر زار کرتی ہوں
فکر کو پُر بہار کرتی ہوں
نظم میں ذکر یار کرتی ہوں
اس کی لطیف گرمی میں ذات میری پگھلنے لگتی ہے
اک مزہ دے کے جلنے لگتی ہے

خواب
(جوانی کی دہلیز پر)

یہ ایسی نظمیں ہیں جن میں عہدِ موجود کی عورت کی سوچ۔ اس کا کرب۔ کسی بات پر اس کا ردِ عمل کہیں مخفی اور کہیں مظہر صورت میں ادا ہوتا ہے جس کی وجہ سے موضوعات میں تنوع اور تازگی پیدا ہو گئی ہے۔

شمشاد نازلی کی شعری کتاب ''جوانی کی دہلیز پر'' میں نسائی جذبات و احساسات کی شدّت کا جو اظہار ملتا ہے اس میں واقعی ایک فطری پن اور لہو میں تیرتی گرمی اور جذبے کی سرشاری پائی جاتی ہے۔ شاعرہ کی غزلوں میں تو یہ اسلوبِ بیان بہت دلچسپ۔ دلکش اور دلگداز ہے۔

غزل تو نازلی جذبات کی کہانی ہے
ضرور اس میں کوئی بات بیش و کم آئے

کہاں جمال یہ شبنم زدہ گلاب میں ہے
ہمارا جسم تو بھیگا ہُوا شراب میں ہے

اس پیار سے باہوں میں سمیٹا ہے کسی نے
اب ذات کی تنہائی کا احساس نہیں ہے

حالیہ برسوں میں کچھ ایسی شاعرات کے نام سامنے آئے ہیں جنھوں نے اپنے پہلے ہی مجموعہ کلام سے قارئین کی توجہ اپنی جانب مبذول کرلی ہے۔ ناصرہ زبیری بھی انہی شاعرات میں سے ایک ہیں ''شگون'' (مطبوعہ =1995ء) ناصرہ زبیری کا اوّلین شعری مجموعہ ہے جس میں نظمیں اور غزلیں شامل ہیں ان دونوں اصنافِ سخن میں شاعرہ نے اپنا لہجہ اور اپنا اسلوب تراشا ہے ان کی شاعری میں زندہ حقیقتوں کا احساس ملتا ہے

احمد فراز کے لفظوں میں۔ ''ناصرہ زبیری کے کلام کا غالب حصہ ایسا ہے جس نے مجھے چونکا دیا ہے۔ میرے خیال میں ناصرہ زبیری ایک ایسی شاعرہ ہیں جن

کے فن میں نہ صرف سوچ کی تازگی بلکہ اظہار کی پختگی بھی پائی جاتی ہے۔"
ناصرہ زبیری کی نظموں کے موضوعات میں تنوع ہے چنانچہ اس تنوع میں اس کے باطن کی ترجمانی بھی ہے اور خارج کی عکاسی بھی ۔زبیری کی طویل نظموں کے علاوہ چھوٹی اور مختصر نظموں میں بھی زندگی کے مختصر رنگ نظر آتے ہیں جن میں جذبات کی مختلف کیفیات سامنے آتی ہیں۔

پوری ہمدردی ہے مجھ کو
اجنبی لڑکی
ترے تاریک مستقبل کے ساتھ
اس لئے کہ آج کل
تُو اُس کی آنکھوں سے اُمڈتی روشنی کی زد میں ہے

(تجربہ)

کوئی بتائے
میں کس جگہ ہوں
غموں کی بارش کے ساتھ بہہ کے
گزر کے پتھر کی وادیوں سے
سمُندروں کی اندھیری تہ میں بکھر گئی ہُوں
میں زندگی کے قریب ہُوں یا کُھدی زمیں میں اُتر گئی ہُوں
میں جی رہی ہوں کہ مر گئی ہُوں

ناصرہ زیدی جدید تر اُردو شاعری کے افق پر ان چند ناموں میں سے ایک نام ہے جن کے یہاں شعری محسوسات اور فکری رَو ایک دوسرے سے جُدا نہیں ہو پاتیں ان کے محسوسات سے فکر اور فکر سے شاعری ٹپکتی ہے۔

ناصرہ زیدی کی شاعری میں نہ صرف موضوعات کا تنوع ہے بلکہ عہد کے شعور کا عکس اور حقائق بھی ملتے ہیں۔ ناصرہ کی غزل میں ذہانت اور حساسیت کا خوبصورت امتزاج پایا جاتا ہے۔

تمہارے قُرب کا ساون برس چُکا لیکن
بدن میں یاد کے رنگوں کی لہر چھوڑ گیا

شبنم شکیل کے لفظوں میں۔ ''ناصرہ نے اپنی ہمعصر شاعرات کے برعکس پہلے مجموعے میں بھی اس معمولی سطح کے رومانوی انداز کو نہیں اپنایا جس سے چھٹائی لکھنے والیوں کے لیے تقریباً، ناممکن ہوتا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس کے باوجود اس کا کلام بہت تازگی اور بہت جدّت لیے ہوئے ہے۔''

لپٹے ہیں جسم و روح سے اسرار سینکڑوں
کیسے بس ایک رات میں تم پر دُلہن کُھلے

تمہارے قُرب کے پُھولوں کا پہلا لمس لیے
ہوا میں آئی نویلی بہار کی خوشبُو

ابھی ستم کی اداؤں سے ہاتھ مت کھینچو
کہ میرے ضبط کا پیالہ ابھی نہیں چھلکا

اگا گئی مرے اندرجو فصل تنہائی
وہ رات یاد ہے اب تک مجھے دسمبر کی

پاکستانی غزل کے افق پر فروزاں دوسری شاعرات میں محمودہ غازیہ کا نام بھی شامل ہے محمودہ غازیہ ایسی شاعرہ ہے جس نے روحِ عصر کے تمام تر امکانی موضوعات کا منفرد لب و لہجہ اور چونکا دینے والے اسلوب کے ساتھ احاطہ کیا ہے۔

محمودہ غازیہ کی نظمیں بطورِ خاص متوجہ کرتی ہیں۔''اکائی کی موت''۔''مٹی میں آگ ہے''۔''جاگتی آنکھوں کے خواب''۔''لمحوں کی خوشبو''۔''پرستش''۔''گونگی لڑکیوں کا گیت''اور''جرائیل کی تلاش'' کے علاوہ اس کی مختصر نظمیں بھی بڑی جاندار ہیں جن میں محمودہ غازیہ کا گہرا شعور و ادراک جھانک رہا ہے۔

آؤ
شبنم سے بھیگے لان پر
اجنبی دوستوں کی طرح کچھ کہیں
دو پرندوں کو اک ساتھ اُڑتا ہُوا دیکھ کر
دیر تک چُپ رہیں

گلاب کی ان مہکتی
کیاریوں میں
ہوا ہے
کہ
بچھو

گلاب کی سرسراتی کیاریاں
(اکائی کی موت)

ظہیر الدین احمد کے لفظوں میں۔ "جدید اُردو شاعری کے کینوس پر محمودہ
ازیہ اپنے ذاتی تجربے کے بل بوتے پر اپنی آواز دوسروں سے الگ رکھے ہوئے ہیں
س نے کسی ایک تخلیقی ماخذ پر انحصار کرنے کے بجائے تنوع کو اپنا مقصد بنایا
ہے۔ محمودہ غازیہ کے ہاں جو تازگی اور نیا پن ملتا ہے اس سے ایک نیا طرزِ احساس کھل
امنے آتا ہے۔

محمودہ غازیہ کے شعری مجموعہ "اکائی کی موت" (مطبوعہ = بار
ل 1987ء) دراصل نظموں ہی کا مجموعہ ہے مگر اس میں چند غزلیں بھی شامل ہیں۔
غزلیں یوں تو جدید و قدیم روایت کا خوبصورت امتزاج ہے مگر ایسے اشعار جن میں
ائی احساسات کا لمس ہے خاص طور پر بہت دلکش۔ کومل اور تغزل سے بھرپور ہیں
ر خوش آئند احساس ہوتا ہے کہ محمودہ غازیہ کا تخلیقی سفر آگے بڑھ رہا ہے۔

کوئی تو ہو جو مجھے رنگ رنگ پھیلا دے
وہ آنکھ بند کرے اور میں دکھائی دوں

خود تو وہ زیادہ خواب دیکھے گا مرے
مجھ کو لیکن عمر بھر کے رتجگے دے جائے گا

ہاتھ پیلے کر کے اور دھو میں مچانے کے لیئے
لڑکیاں بے تاب ہیں اس پار جانے کے لیئے

محمودہ غازیہ، نظم اور غزل کے علاوہ نعت بھی کہتی ہے۔ اس کی نعتوں میں عجز۔ انکساری کے ساتھ ساتھ مدحتِ رسولؐ کا والہانہ انداز بھی ملتا ہے۔

سینے پہ میرے جہل مسلّط ہے یا نبیؐ
کر دیجیے میرے قلب کو بیدار یا رسولؐ
کیسے لکھوں کہ لفظ بھی سچے نہیں میرے
کیسے کہوں کہ نطق ہے ناچار یا رسولؐ
ایک عجز ہے کہ جس کے بھروسہ پہ غازیہ
لکھنے چلی ہے نعت کے اشعار یا رسولؐ

نثری نظم اس دور کا تقاضا ہے کیونکہ جس پیچیدہ صورتحال میں ہم سانس لے رہے ہیں اور جن تلخ حقائق سے ہم دوچار ہیں ان کا سچا اور بھرپور اظہار نثری نظم میں ہی ہو سکتا ہے

پاکستان میں نثری نظم لکھنے والی جدید شاعرات کی کھیپ میں عذرا عباس کا نام نمایاں ہے 1996ء میں اس کی نثری نظموں کا مجموعہ ''میں لائنیں کھینچتی ہوں'' کے نام سے طبع ہوا جبکہ اس سے قبل عذرا عباس کی تین کتابیں ''نیند کی مسافتیں''۔ ''میں

پر رکھے ہاتھ ''اور'' میرا آنچل'' شائع ہو چکی ہیں ان تینوں کتابوں اور اس چوتھی کتاب (میں لائنیں کھینچتی ہوں) میں بھی عورت نمایاں ہے اور ایک ہی رُوپ میں ہے۔

''میں لائنیں کھینچتی ہوں'' کی نظموں میں ایک ایسی عورت سامنے کھڑی ہے جس نے زندگی کو صرف ایک ہی زاویئے سے دیکھا ہے۔ اس عورت کا صرف ایک ہی رشتہ ہے جسم اور جنس کا رشتہ۔ خواہش۔ ظلم۔ کرب و طرب۔ حرمان و مایوسی۔ یہ سب اسی رُخ سے دکھانے کی کوشش کی ہے۔ عنوانات مختلف ضرور ہیں مگر موضوع ایک ہی ہے۔

بعض نظمیں ایسی بھی ہیں جو بڑے امکانات لیئے ہوئے ہیں اور وہ بھی شاید اس لیئے کہ ان نظموں میں عذرا عباس نے بات علامتوں میں کی ہے۔

عذرا عباس کو لفظ و آہنگ کی دھجیوں کے بکھرنے کا ادراک بھی ہے اور قلق بھی۔ عذرا عباس کی نظم ''نیند کی مسافت ''عصر نو کا ایک خوبصورت استعارہ ہے جس میں عذرا عباس کی آواز لفظوں میں ڈھل کر نوحہ خوانی کرتی ہے۔

شاید کہ آسمان ہم پر مہربان نہ ہو
یہ دُکھ نہیں کہ ہمارے مکانوں کی کھڑکیوں کو
بند کرنے کا حکم دے دیا گیا ہے
مگر ہمیں سوچنا تو ہو گا، باہر نکلنے کے لیئے
آج ہمارے بچوں کو روٹی چاہئے۔

جن لوگوں کی وجہ سے نثری نظم کا اب تک نام زندہ ہے ان میں اکثریت شاعرات کی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اب تک نثری نظم کے جو قابل ذکر مجموعے طبع ہوئے ہیں وہ سب کے سب خواتین کے ہیں لیکن اس کے باوجود نثری نظم کی نزاعی

حیثیت ابھی تک برقرار ہے بلکہ نثری نظم کا سورج ابھی تک بادلوں کی اوٹ میں ہے ان شاعرات کے نزدیک شعری رجحانات میں ایک نمایاں رجحان نثری نظم کا کچھ زیادہ ہی چرچا اور چلن رہا ہے اور کچھ ایسی شاعرات ایوان سخن میں آئیں جنہوں نے صدف سخن کے میلانات کا رُخ موڑنے کی کوشش کی اور اپنے فنی منصب میں نمایاں کامیابی حاصل کی ان سب میں سارہ شگفتہ سر فہرست ہیں۔

سارہ شگفتہ نے جدید شاعری میں اپنے لہجے اور انداز بیان کی بدولت ایک بلند اور منفرد مقام بنالیا تھا اس کی نثری نظمیں جدید حسیّت کی غماز ہیں

سارہ شگفتہ ایک حساس تخلیق کار تھی۔ وہ انسانی کرب کی شاعرہ تھی اس کی نظمیں عورت کی مظلومیت کی ترجمان ہیں۔ معاشرے پر طنز کرتے ہوئے اس لہجے میں بڑی بے رحمی اور تلخی نظر آتی ہے۔

وہ جھوٹی محبّت جتانے والوں کے منافقانہ روّیوں کو سمجھ نہ پائی تھی حتیٰ کہ اسے اسی کے خون میں نہلایا گیا۔

سارہ شگفتہ کی نثری نظموں کا مجموعہ ''آنکھیں''۔ اس کی المناک موت کے بعد جنوری 1985ء میں طبع ہوا۔ جس سے نثری نظم کا بہت اعلیٰ معیار قائم ہوا

مبارک احمد لکھتے ہیں۔ ''اس ارفع سطح کی شاعری مغرب میں بھی نہیں ہو رہی یہ شاعری ہر چند کہ بیشتر موجودہ جدید تر شعری روایت کی صورت میں مربوط نہیں لیکن اثر انگیزی میں اپنا جواب نہیں رکھتی اور اعلےٰ سطح کی مربوط شاعری کو بھی کہیں پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔''

اس مجموعہ میں شامل بیشتر طویل نظمیں۔ ایک طویل نظم ''پتھروں کا بیان'' سے چند لائنیں ملاحظہ ہوں

نمک حرام دل
سڑکیں میرے جسم کے سنگ میل گنیں
چراغ تھک جائیں گے
پگڈنڈیاں دُور دُور تک پھیلی ہیں ....
لوگ کہنے لگے اے خُدا
میں نے کہا میری سُنو
میرے لہو کے چھینٹے جو پڑے پتّھر پہ
نئے الزام تراشے گئے
مٹّی سے گرتے گرتے میں ذرہ ذرہ بچّی

اسی طرح ایک دوسری طویل نظم کا عنوان ہے ''کاٹنے پر کوئی موسم نہیں آتا'' لیکن پوری کی پوری نظم پیش کرنے کا یہ محل نہیں ہے البتہ اس نظم کی بھی چند لائنیں بطورِ نمونہ ملاحظہ ہوں۔

آنکھوں کی مہندی رچاؤ
نہیں تو تمہارے بچّے بے کفن رہ جائیں گے
میں نے لباس فروخت کر دیا ہے
کل تمہارے پاس دوپٹے نہ ہوں
تو سمجھ لینا میرے پاس پورا لباس نہ تھا
بدن کی گواہی پر مت رہنا
آنکھوں میں بس رہنا
قبر بن جانا

که آزادی کی خاک نہ ہونا بہتر......
یُوں ہم نے ایک غیرت مند ..... تراشا
سچ پوچھو تو پُھول کتنی اذیت میں ہے
کانٹے پر کوئی موسم نہیں آتا

سارہ شگفتہ نے اکثر نظمیں، نثری نظم کی فارم میں لکھیں۔ لیکن یہاں وہ تمام نظمیں یا ان کے اقتباسات پیش کرنا طوالت کا باعث بنے گا لہٰذا ''آنکھیں'' میں شامل کچھ نظموں کے عنوانات پیش کرنے پر اکتفا کرنا پڑے گا۔

مثلاً چند نظموں کے عنوانات ملاحظہ ہوں۔ ''چراغ جب میرا کمرہ ناپتا ہے''۔ ''دو گھونٹ پیاس اور۔۔۔۔۔'''' مجھے پتھر کی آنکھ سے دیکھا''، ''سائے کی خاموشی''، ''بدن سے پوری آنکھ ہے میری''، ''رنگ چور''، ''سنگِ میل پہروں چلتا ہے''، ''قرض ''اور''ڈال کتنے رنگ بوئے گی''

قمر جلیل کے لفظوں میں۔ ''سارہ شگفتہ کی شاعری کی رسائی ان حقیقتوں تک ہوتی ہے جہاں تک ہمارے نثری نظم لکھنے والوں کی رسائی کبھی نہیں ہوئی۔ وہ اعلےٰ ترین ذہنی اور شعری صلاحیتوں کی مالک تھی۔ انسانی نفس کے ادراک میں جو قدرت اسے حاصل ہے وہ ہم میں سے کسی کو حاصل نہیں۔''

محبتّوں اور حلاوتوں کے نرم و نازک۔ لطیف جذبات اور احساسات جو کچھ شرمیلے اور ان کہے ہیں نوشابہ نرگس ان لفظوں کو خوبصورت آہنگ دے کر شاعرانہ سلیقے سے پیش کرنے کا فن جانتی ہے اور آزاد نظمیں زیادہ لکھتی ہے اس کے نزدیک آزاد نظم اظہار کا مؤثر اور مضبوط ذریعہ ہے

آدھی رات کا چندا جب آنگن میں اُترے
آنکھیں موند کے
سو جانے کا ناٹک کرنا
تم کو سوتا جان کے چندا
مدھر ملن کی میٹھی یادیں
پیار کے سپنے
تکئے کے نیچے رکھ دے گا

''طفل تسلی''

وہ لڑکی مجھے آج پھر
راستے میں ملی
کچھ پریشان تھی
میں نے پوچھا
کیوں کیا ہُوا؟
خواب ٹوٹا کوئی
یا ستارہ گرا فکر کے آسماں سے

''پرچھائیں''

نوشابہ نرگس نے مختصر نظموں کے علاوہ طویل نظمیں بھی لکھی ہیں مثلاً ''نقشِ قدم پاک''۔ ''ایک دن کا نشاں''۔ ''سوکھا ساون''۔ ''جشنِ تنہائی'' وغیرہ

سدا بہار خوابوں کی شاعرہ نوشابہ نرگس کے "بے صدا حرف" (مطبوعہ = بار اول 1985ء) کے جذباتی تموّج کی تخلیقی رَو، داد ہے اور خوب ہے کہ اشعار ذات کا استعارہ بن گئے۔

پُھول کی پتی پر اُس کا نام لِکھ کر چُومنا
شبنمی قطروں میں بھی اس کا سراپا دیکھنا

نوشابہ نرگس کی غزلوں میں کچھ ان کہی باتوں اور غیر محسوس سرگوشیوں کا تذکرہ ملتا ہے اور جب ان کا اظہار کرتی ہے تو اس کی آنکھوں کا عکس پہلے سے بھی زیادہ گہرا ہو جاتا ہے۔

نظم نگاری نئے طرزِ احساس۔ جدید دانش اور نئے شعری رویّوں کے حوالے سے انتہائی مشکل اور پیچیدہ فن ہے۔ عام طور پر دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ جدت کے شوق میں شاعر نہ صرف نفسِ مضمون گم کر دیتے ہیں بلکہ بے مقصدیت اور ابہام کا بھی شکار ہو جاتے ہیں۔ اور یہ عمل بحیثیت صنفِ نظم کو نقصان پہنچانے کے مترادف ہے۔

لیکن عذرا وحید کا دوسرا شعری مجموعہ "پانی میں سورج" (مطبوعہ بار اول = 1982ء) جو صرف نظموں پر مشتمل ہے۔ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوتی ہے کہ عذرا وحید نے نہ صرف فنِ شعر میں ترقی کی ہے بلکہ معنوی تہہ داری اور علامت نگاری کی ذمہ داری کو بھی نہایت خوش اسلوبی سے نبھایا ہے، اس کی نظمیں آشوبِ عصر اور آشوبِ آگہی کی ترجمانی کرتی ہیں۔

عذرا وحید کی نظموں کا ماحول اس کی غزلوں کے ماحول سے خاصا مختلف ہے اور اس کی شخصیت کی بعض اور جہات سامنے لاتا ہے۔

یہ اوراک عرش صدیقی کا ہے۔۔۔۔ عذرا نظم فرد کی باطنی زندگی کی ایک سے زیادہ جہات کو پیش کرتی ہے۔ اسلوب ایسا ہے کہ ذہین قاری نظم کی تاثیر سے متاثر ہو کر اس مشاہدے اور تجربے میں شریک ہو جاتا ہے جو نظم کا موضوع ہے۔

میں نے کھیتوں کی سُوکھی رگوں کو دیا
اپنی شہ رگ کا تازہ گلابی لہو
اُن کی اُنگلی میں پہنائی تھی
اپنے ہونٹوں کی سُرخی کی انگشتری
اُن کے ماتھے کی جھیلوں میں بوئے کنول
اپنی خوش رنگ خواہش کے، اُمید کے

تم نے اُمید کے سارے پھولوں کی کیاری کو نفرت کے خنجر سے پتھر کیا
تم نے کیا کر دیا
تم نے کیا کر دیا

تم نے کیا کر دیا
پانی میں سورج

اظہر جاوید کے لفظوں میں۔ ''عذرا وحید کی نظموں میں عورت کسی چیز، کسی شخص اور کسی عمل کی نشاندھی نہیں کرتی۔ یہ عورت ہراساں ہے، خوف ہراس کے حصار میں مقید ہے۔

اک عورت نے نام لکھا اک مٹی پر
کالے پانی کی زور آور لہر اُٹھی
دُور تلک وہ نام گیا اور اس کی روشن ریکھائیں
دیر تلک آئینہ بنی چمکا کیں موجوں کے اُوپر
موجوں کے کالے جُٹے پر

(تنکا)

پانی میں سورج

''پانی میں سورج''، میں شامل نظمیں مثلاً ''بند کواڑوں پر دستک''۔ ''شمع سوزاں''، ''بے کسی کی سزا''، ''سورج کی موت''، ''انتظار'' اور دیگر نظمیں خاصی متاثر کن ہیں۔

اس کا گھریلو نام نفیس جہاں وحید ہے لیکن ادبی حلقوں میں عذرا وحید کے نام سے جانی پہچانی جاتی ہے۔ اس کا تعلق ملتان سے ہے موصوفہ ۲۹ / اگست ۱۹۴۴ء کو پیدا ہوئی۔ ''لہر لہر'' (1989ء) اور ''سراب کے پھول'' اس کی غزلوں کے مجموعے طبع ہو چکے ہیں۔ عذرا وحید نے اپنی غزلوں میں پامال مضامین کو بھی نئی معنویت عطا کی ہے وہ اس حساس دَور کی بہت حساس شاعرہ ہیں اس کی غزل اس عہدِ بے ہنر میں بھی احساس کی رعنائی رکھتی ہے۔ اس کی غزل کا مزاج عزم و استقلال سے استوار ہوا ہے جہاں افسردگی اور غم کا گزر بہت کم ہو سکا ہے۔ وہ زندگی کی الم زدگی کا شدید احساس ضرور رکھتی ہے لیکن اس کی مفتوح نہیں ہے۔ غزل میں ایک عورت کی حیثیت سے وہ مرد کی ساتھی بنتی ہے اس کی جاگیر ہرگز نہیں بنتی۔

ایک ہی جھونکا ہوا کا توڑ دے پھر جوڑ دے
میرے اس کے درمیاں ، اک ریت کی دیوار ہے

خودہی چاٹا کیئے زخموں کو کہ چارا تھا یہی
داد جس سے بھی طلب کی وہ ستمگر ٹھہرا

عذرا وحید، نظم اور غزل کے علاوہ نعت بھی لکھتی ہے اس نے نعت میں اپنے احساسات اور جذبات کا اظہار یوں کیا ہے۔

تُو چمکتا آفتاب انسان کی تعبیر کا ۔۔۔ لمحۂ پائندہ تُو ہر خواب کی تعبیر کا
سچ کو حرفِ ابدیت کا پیرہن تُو نے دیا ۔۔۔ آدمی کو زندگی کرنے کا فن تُو نے دیا

سارہ شگفتہ نے نثری نظم کا جو معیار قائم کیا ہے نجمہ منصور نے نہ صرف اسے برقرار رکھا ہے بلکہ اس میں خوبصورت اضافے کرنے کی بھی کامیاب کوشش کی ہے۔ نجمہ منصور کی نثری نظموں کا مجموعہ ''سپنے اور آنکھیں''طبع ہو چکا ہے۔

نجمہ منصور نے اپنی ایک مختصر نظم ''پابہ زنجیر'' میں محبوب کی صورت میں کرب کے ایک لمحے کی آنے اور گزرنے والی کیفیت کو بیان کیا ہے۔ نظم کی تمام سطریں اس لمحے کے نتیجے میں شاعرہ کو جو یادیں دے گئی ہیں ان میں انتظار کا کربِ بے پایاں ہے گویا وہ ایک لمحہ پھیل کر شاعرہ کی زندگی پر محیط ہو گیا ہے اسی طرح ''آگہی کے عذاب'' اور ''آزادی'' میں بھی شاعرہ کے ہاں کرب کی شدید کیفیت محسوس کی جا سکتی ہیں۔ ایک اور نظم جس میں آزادی سے بھی بڑھ کر تمنا اور حسرت کا کرب پایا جاتا ہے نجمہ منصور کی وہ نظم ''پہاڑ کے اس پار'' ہے نجمہ منصور کے ہاں کرب کی جو شدّت ملتی

ہے اس کا ایک رنگ اس کی نظم ''حصار'' میں ملاحظہ ہو۔

اس کے پیار نے
میرے بدن کے ارد گرد
اک حصار سا بنا رکھا ہے
میں جب بھی اسے توڑنے کی کوشش کرتی ہوں
میرے ہاتھ شل ہو جاتے ہیں
اور میں نڈھال سی ہو کر
اس کے امر بیل بازوؤں میں
گرجاتی ہوں

کرب کی یہ شدت ان کی دیگر نظموں ''بہار چہرہ'' ۔''چپ کی دیوار''۔ ''فریب مسلسل''۔ ''برسات کی نم آلود ہواؤں میں''۔''بوجھ''۔''کیا صدا بھی واپس آتی ہے'' کے علاوہ ''تبدیلی'' اور مسکرا دیتی ہوں''۔ جیسی نظموں میں محسوس کی جا سکتی ہے۔

فاخرہ بتول، شاعرات کی بھیڑ میں کبھی نہ گم ہونے والی شاعرہ ہے۔ وہ نئی نسل کی شاعرات میں اپنے لب ولہجہ کی وجہ سے انفرادیت رکھتی ہے۔ ''چاند نے بادل اوڑھ لیا''، جواں سال شاعرہ فاخرہ بتول کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے ''پلکیں بھیگی بھیگی سی'' کے عنوان سے اس کا شعری مجموعہ طبع ہو چکا ہے۔

فاخرہ بتول کے موضوعات سراسر نسوانی ہیں یہ نسوانیت اور معصومیت کئی نظموں میں جھلک جاتی ہے مثلاً ''گڑیا آج بھی زندہ ہے''۔ ''خاموش گواہ''۔ ''تلاش''۔ اس کی سب نہیں تو کچھ نظمیں ایسی ہیں کہ ان لفظیات میں بھی اور

موضوعات میں بھی جذبوں کی دھیمی آنچ محسوس ہوتی ہے۔ اس کی نظم ''فیصلہ'' کا یہ ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

چاول چُنتے چُنتے اس نے یکدم سوچا
برکھا سر پر آپہنچی ہے
اس موسم میں
بالی عمر کے کچے خواب ستانے لگتے ہیں

فاخرہ بتول، غزل کم کہتی ہے لیکن جتنا کچھ بھی کہتی ہے اچھا کہتی ہے۔ بیشتر غزلوں کی بحور مختصر اور سادہ ہیں۔

میں نے خوشبو کی حقیقت پوچھی
پُھول خاموش رہا دیر تلک

وہ ترا گلاب کو چُوم کر مجھے دیکھنا
نہیں تجھ کو یاد رہا مگر مجھے یاد ہے

لیکن فاخرہ بتول کا یہ شعر تو شاعرہ کے انا پرست ہونے کی عکاسی کرتا ہے۔

ضدی تھا وہ تو میں تھی بلا کی انّا پرست
آیا تھا جیتنے وہ مگر ہار کر گیا

فیروزہ عثاری۔ کا شعری مجموعہ ''وفا شناس'' کے عنوان سے طبع ہو چکا ہے۔ اس مجموعہ کی نظموں میں ''نوحۂ آرزو''۔ ''تاریخ و مؤرخ''۔ ''احساس'' اور ''آؤ ہم سب مل کر سوچیں''۔ اس کی دیگر نظمیں بھی بڑی عمدہ اور جاندار نظمیں ہیں۔ فیروزہ عثاری کی نظم ''نوحۂ آرزو'' ایک عمدہ تخلیق ہے مگر اس کی نظم ''آؤ ہم سب مل کر سوچیں''، میں یکجہتی اور انسان دوستی کا پیغام ملتا ہے، شاعرہ کے انداز بیان میں رعنائی، جذبوں کی سچائی اور فکر کی گہرائی بھی ہے۔

''وفا شناس'' کا حصۂ نظم فیروزہ عثاری کی خوبصورت نظموں سے مزین ہے تقریباً یہ تمام نظمیں سچے جذبات کے وفور اور شدّتِ اظہار کی دلآویزی کا مظہر ہیں۔

نظم اور غزل دونوں حوالوں سے فیروزہ عثاری نے اچھی تخلیقات پیش کی ہیں۔ یہ ایسی نئی آواز ہے جو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ فیروزہ عثاری کی شامل اشاعت غزلوں کے یہ اشعار دُہرانے پر بھی قندِ مکرر کا مزہ دیتے ہیں۔

دیکھنے میں اپنا تھا، ورنہ وہ تو سپنا تھا
اب نہیں اٹھائوں گی چاند گر پڑا پاؤں

ایک دن دلوں میں بھی جھانکنے کی ٹھانی ہے
داغ ، داغ چہرے ہیں آئینوں میں کیا پاؤں

بے طناب رشتے ہیں، رابطے ہیں بے معیار
کس کا ذہن وا دیکھوں کس کا دل کُھلا پاؤں

خواب چاہے جاگتی آنکھوں کا ہو یا سوتی آنکھوں کا خواب، خواب ہی ہوتا

ہے۔ زاہدہ صدیقی نے بھی بہت سے خواب دیکھے ہیں سہانے خواب بھی اور ڈراؤنے بھی تاہم وہ ایک سفر پر رواں دواں ہے جو امن و آشتی پر ختم ہوتا ہے۔ زاہدہ صدیقی کا لہجہ بڑا سیدھا اور براہ راست ہے وہ اپنے اردگرد پھیلے ہوئے دکھی انسانوں کے مسائل اور مشکلات کو اپنی نظموں کا موضوع بناتی ہے اور اس طرح وہ معاشرے کے تمام انسانوں کو اپنے ساتھ ملا کر ان کے دکھ، درد بانٹتی ہے ان کے شعری مجموعہ "دعاؤں کا سائبان" میں عورت کا ازلی وابدی روپ تخلیقی سطح پر جلوہ فگن نظر آتا ہے۔ "جاگتی آنکھوں کا خواب" بھی زاہدہ صدیقی کی نظموں کا مجموعہ ہے جس میں طویل مختصر نظمیں شامل ہیں۔

پاکستانی شاعرات کی نئی کھیپ میں صبیحہ صبا کا نام اجنبی نہیں ہے۔ اس کا پہلا شعری مجموعہ "لفظوں کا شہر" کے نام سے ۱۹۷۹ء میں طبع ہوا۔ اور اہل ذوق سے قبول عام کی سند پا چکا ہے جبکہ ۱۹۹۲ء میں "چشم ستارہ شمار" اور ۱۹۹۶ء میں "تیری صدا آئی" کے عنوانات سے طبع ہو چکے ہیں۔

صبیحہ صبا کی شاعری میں اس دور کی تہذیبی۔ معاشی۔ معاشرتی اور سیاسی مسائل الفاظ کی نغمگی اور جذبوں کے والہانہ اظہار کے ساتھ اس خوبی سے بیان ہوئے ہیں کہ ان پر یقیناً رشک ہوگا۔

رضیہ شمع کی غزل اور نظم میں عمدہ شاعری کے امکانات موجود ہیں مگر غزل کی طرف کچھ زیادہ توجہ ہے۔ جدید تحریکات ادب سے متاثر ہے اور وہ ایوان غزل میں نئے چراغ جلاتی ہے۔

یہ انتظار بہت ہی اُداس کرتا ہے
وصال نقش میرے جسم و جاں سے گزر
شب فراق سے کیوں میری شناسائی
مری طرح کبھی تو بھی امتحان سے گزر

خاتون شعراء کا اپنا ایک اسلوب اور اظہار خیال کا پیرایہ ہوتا ہے۔ پروفیسر ثروت

سلطانہ ثروت کا بھی اپنا منفرد اسلوب ہے۔ نظموں پر مشتمل ان کی کتاب "طاقوں میں پڑے خواب" کے عنوان سے طبع ہو چکی ہے۔

رشیدہ عیاں کا شمار معروف شاعرات میں ہوتا ہے 'امراؤ طارق لکھتے ہیں۔ "رشیدہ عیاں نے کئی برس پہلے شاعری کا آغاز کیا تھا اور جب سے اب تک ان کا شعری سفر جاری ہے اور جب تک تخلیق کار سفر میں رہتا ہے' تخلیق کا عمل بیش بہا اور تازہ بہ تازہ رہتا ہے چنانچہ رشیدہ عیاں اپنے منفرد لب و لہجے کی وجہ سے ادبی دنیا میں اپنی شناخت منوا چکی ہیں۔

رشیدہ عیاں کی اب تک جو کتابیں طبع ہو چکی ہیں۔ ان میں "حرف آئینہ"۔ "جائزہ"۔ "آئینوں کے چہرے"۔ "کرن کرن اجالا" کے علاوہ "عشق پر زور نہیں" کو ادبی علمی حلقوں میں خوب پذیرائی ملی۔

اُردو ادب کی تاریخ میں کسی بڑی شاعرہ کا نام نہیں ملتا۔ گذشتہ پچاس سال میں آٹھ دس نام روشن امکانات کی بشارت لے کر اُبھرے ہیں اور انہیں میں ایک عشرت آفرین کا ہے۔ ہندوستان میں میرابائی اور ایران میں طاہرہ قرۃ العین دو بڑے نام ہیں لیکن دونوں کی زندگی دردناک رہی ہے۔ یہ درد ہمارے صدیوں پرانے۔ فرسودہ معاشرے میں عورت کا مقدر رہے اور وہ اس کو یہ کہہ کر جھیلتی رہی ہے۔

اے جیون کے پیارے دُکھ

میرے اندر دیا جلانا

بُجھ مت جانا

اس دیئے کی روشنی میں اگر عشرت آفرین اپنی شاعری کو زندہ رکھ سکی تو روشن ترا مکانات سامنے ہیں۔ یہ اگر اس لئے ہے کہ ہمارے معاشرے میں عورت آزاد ہونے کے بعد بھی آزاد نہیں ہے۔ اس کے لئے اتنے مسائل اور حیات کی اتنی پیچیدگیاں رہیں کہ

کبھی کبھی سانس لینادشوار ہو جاتا ہے۔

اپنی آگ کو زندہ رکھنا کتنا مشکل ہے
پتھر بیچ آئینہ رکھنا کتنا مشکل ہے

اور ہمارے معاشرے میں عورت واقعی پتھر بیچ آئینہ ہے لیکن عشرت آفرین میں یہ حوصلہ بھی ہے۔

سنگ زنوں کی بستی میں
آئینہ چمکا رکھنا

ان کی شاعری کے شاعرانہ پیکر۔ تشبیہوں۔ استعارے اور احساس کی دولت سے مالا مال ہیں۔ مثلاً ان کا زیادہ آسان اور خوبصورت شعر ملاحظہ ہو۔

سُرخ رتوں کی آگ گھروں کو آنے تک
آنگن پیلے پتوں سے بھر جاتے ہیں

یہ آگ عشرت آفرین کا خواب بھی ہے۔ تمنا بھی اور شاعری بھی۔ وہ شاعری جو اس عہد کی آواز ہے اور مستقبل میں وہی آواز زندہ رہتی ہے جو اپنے عہد میں اپنا جواز حاصل کر لیتی ہے۔

یہ ادراک علی سردار جعفری کا ہے۔ عشرت آفرین کا شعری مجموعہ "کنج پیلے پھولوں کا" کے عنوان سے چھپ چکا ہے۔ عشرت آفرین کی غزلوں اور نظموں کے مطالعہ کے بعد بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شعری مجموعوں کی اشاعت میں یہ ایک عمدہ اضافہ ہے۔ اس مجموعہ میں شامل نظمیں اور غزلیں جدید حسیّت کی آئینہ دار ہیں انہیں پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ شاعرہ نے زندگی کو اپنے وقت کے تقاضوں۔ نت نئے مشاہدوں اور تجربوں کے ساتھ دیکھا اور برتا ہے۔

عشرت آفرین کے لئے حسن خوشبو ہے۔ پیرہن کی خوشبو۔ بدن کی خوشبو۔ عشرت آفرین نے خوشبو سے متعلق تلازمات کا بہت خوبصورت استعمال کیا ہے۔ مثلاً ان کے یہ شعر ملاحظہ ہوں۔

میں شاخ شاخ تری نکہتیں فزوں دیکھوں
میں طاق طاق تری روشنی سوا چاہوں

خوشبوئیں گونج رہی ہیں مجھ میں
آج پھولوں کی صدا رقص میں ہے

آنکھوں میں گلاب کی چبھن بھی
خوشبو سے اٹا ہوا بدن بھی

عشرت آفرین نے بصری تلازمات کو بھی رنگ اور روشنی کے بنیادی تلازمے سے ترتیب دیا ہے جسے کہیں وہ اجلے چہرے کہتی ہیں کہیں آنسوؤں کا عکس۔ کہیں رنگوں کی زبان اور کہیں سبز دہلیز۔ رنگ اور روشنی کے اس امتزاج کا اگر جائزہ لیجیے تو عشرت آفرین کے جذبے کی شدت کا احساس ہوگا ان کے بعض کم مشہور شعروں میں بھی یہ شدت محسوس ہوتی ہے۔

اجلے چہرے خوابوں والے
جیسے کنول تالابوں والے

وحشی زلفیں پاگل آنکھیں
مکھڑے زرد گلابوں والے

آنچل پہ ہے عکس آنسوؤں کا
رنگوں کی زبان میں سخن بھی

ان مثالوں سے عشرت آفرین کے یہاں جذبے کو حسوں کے مختلف تلازمات کے ذریعے پیش کرنے کی لطیف کوشش ظاہر ہوتی ہے۔

دورِ حاضر کی شاعرات میں گلِ رعنا کا نام بھی غیر معروف نہیں وہ غزل کے روائتی الفاظ اور انداز ہی کو اپناتی ہے یا دوسرے لفظوں میں مضمون کی ندرت اور نوعیت کے سبب وہ از خود' در آتے ہیں۔

سبز رُتوں میں آگ لگی ہے سانس کی لُو سے جُھلسے ہونٹ
یعنی میرے ان پھولوں میں بوئے نفس کی بات نہیں

پاکستان کی نئی نسل کی شاعرات میں شبہ طراز متعارف شخصیت کی مالکہ ہے موجودہ اصناف سخن غزل۔ نظم آزاد۔ ماہیا۔ نثری نظم اور ہائیکو میں خوب طبع آزمائی کرتی ہے جس کا جواب نہیں ان اصناف میں شبہ طراز کی شعری صداقتیں عیاں ہیں۔

شبہ طراز کے ماہیے ''تجدید نو'' کے علاوہ دیگر متقدر پرچوں میں بھی چھپتے رہتے ہیں اب اس نے ''جگنو ہنستے ہیں'' میں ماہیے شامل کر کے بطور ماہیا نگار بھی اپنی حیثیت منوائی ہے۔

گلدان سجا رکھوں
تم آؤ تو آنکھوں میں
مسکان سجا رکھوں

وہ رات تھی سردی کی
دن چڑھتا چلے جاتے
کیوں جانے کی جلدی کی

جھرنوں کی روانی ہے
تم جلد چلے آنا
اک بات سنانی ہے

پھولوں۔ جھرنوں۔ تتلیوں اور خوشبوؤں کی شاعری کر کے شبہ طراز
[جد]ید تر نسل کی نمائندہ شاعرہ کے طور پر سامنے آئی ہے۔ اس کے مزید کچھ ماہیے
[م]لاحظہ ہوں

میں تم کو سزا دیتی
تم پھول اگر ہوتے
کاپی میں چھپا لیتی

کیا چاندنی راتیں تھیں
پو پھٹنے تلک بس
کچھ پیار کی باتیں تھیں

شبہ طراز کے رومانی اور لسانی لہجے نے ہائیکو کو دلکش بنا دیا ہے اس حوالے سے شبہ طراز کے ہائیکو کے یہ رنگ ملاحظہ ہوں۔

اب تو کاجل بھری ان آنکھوں میں
شام ڈھلتی نہیں کہ رات آئے
نیند سپنوں سے ڈر گئی شاید

کھلنے لگے ہیں پھر سے شگوفے گلاب کے
سر گوشۂ بہار پہ گلشن نہال ہے
آنکھوں میں انتظار کاموسم ٹھہر گیا

پاکستان کی جدید تر شاعرات میں نسرین سروش کا اضافہ 1980ء کی دہائی میں ہوا وہ فکر وخیال میں بصیرت اور لفظ و بیان میں تازہ ذائقے اور ندرت کی قائل ہے اس کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اصنافِ سخن پر پوری گرفت رکھتی ہے طویل

نظموں کے علاوہ اس کی مختصر نظمیں بھی اپنا ایک تاثر رکھتی ہیں۔

انسان
ان گنت

خواہشوں کے سمندر میں
ڈوب کر
ڈپریشن کا
شکار ہو چکا ہے

(خواہشوں کا سمندر)

نسرین سروش کی نظم ''خوشیاں جو اسٹور ہو چکی ہیں'' میں شدتِ احساس کا اظہار ملتا ہے اس نظم میں ہمارے معاشرے کے پچاسی فیصد لوگوں کی حقیقی کہانی بیان کی گئی ہے۔

اُس نے سوچا
یہ کیسا شہر ہے ؟
کہ جہاں سارے لوگ
غم ذدہ اور پریشان ہیں
سوائے چند لوگوں کے
جو خوش نظر آرہے ہیں
پھر اُسے سنائی دیا
یہ وہ لو گ ہیں

جنہوں نے
تمام لوگوں کی خوشیاں
اسٹور کر لی ہیں
صرف اپنے لیئے اور
اپنی آئندہ نسلوں کے لیئے

نظموں کے علاوہ نسرین سروش کی غزلیں بھی جدید حسیّت کی ترجمان ہیں مجموعی طور پر نسرین سروش کی شاعری میں لہجے کی انفرایت اور زورِ بیانکی توانائی پائی جاتی ہے۔

کپکپاتے ہوئے ہونٹوں کی قسم
جی میں کیا کیا نہیں آیا ہو گا

وہ مسکرائے تو کیا کیا نہ رنگ لہرائے
ذرا سی دیر کو تھے سب گل و ثمر اپنے

نسرین یُوں ہی اس کے نشاں کھوجتے رہے
دشتِ جنوں کی خاک اُڑائی تمام رات

المیۂ کراچی کے پس منظر میں لکھی گئی نسیم سید کی نظم "ہائے وہ شہر دلآرا میرا" بھی ایک نوحہ ہے۔ یہ نظم کراچی کی تباہی اور یہاں پائے جانے والے وسوسوں۔ قتل وغارت کے رجحان کا مرثیہ ہے بلکہ یہ پوری نظم موجودہ حالات کا بڑا

دلدوز مرثیہ ہے۔ اس نظم کی چند لائنیں ملاحظہ ہوں۔

وہ جو اك شہر تھا
پُر شوق و پُر امید و یقیں
وہ جو مہتاب سے تعبیر کے خط کھینچتا تھا
اب وہی صبح تلک
درد کے بستر سے لگا
موت کی چاپ اندھیروں میں سُنا کرتا ہے
شب کو گہنایا ہُوا
صبح کو کجلایا ہُوا
ایک مٹیالی سی
مجبوری کی چادر اوڑھے
خستہ و غم ذدہ
بے حال و شہر جاناں
کسی اُمید کی ڈیوڑھی سے کمر ٹیکے ہوئے
کھوٹے سکّے لیئے خوابوں کے گنا کرتا ہے

(ہائے وہ شہر دلآرا میرا)

نسیم سید کی دیگر نظموں مثلاً ''عید'' اور ''ایشیا کی مزدور عورت'' میں بھی یے حقائق اُبھارے گئے ہیں جنہیں جذباتی اور احساساتی سطح پر صرف عورت ہی خوبی سمجھ سکتی ہے۔ نسیم سید کی اسی طرح کی ایک اور نظم ہے ''تم سے ممکن ہو تو پھر'' اس

نظم میں بھی عورت کو مختلف انداز سے محنت کر کے روزی کماتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ ''نرسنگ ہوم''۔ ''خزاں کا جشنِ عام''۔ ''ترکِ تعلق'' اور دیگر نظموں میں نسیم سید نے زندگی کے گھمبیر۔ سنجیدہ اور نہایت فکر انگیز مسائل کے علاوہ خالص نرم و نازک جذبات کی عکاسی بھی بڑے سلیقے سے کی ہے۔

نظموں کے علاوہ نسیم سید کی غزلیں بھی جدید حیت کی ترجمان ہیں ان کی غزلوں میں ہمارے معاشی و معاشرتی مسائل کو جس طرح استعاروں اور علامتوں میں بیان کیا گیا ہے اس سے ان کی تخلیقی استعداد کا خوبی اندازہ ہوتا ہے اور غزلوں میں بھی وہ فکری مسائل کے ساتھ نرم و نازک جذبات کی عکاسی عمدہ انداز سے کرتی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہر شخص میں مت خوئے وفا ڈھونڈ مرے دل
ہر سیپ میں موتی مرے پیارے نہیں ہوتے

جواب دُوں ترے لہجے میں دل یہ کہتا ہے
میں چُپ رہوں یہ تقاضہ میرے وقار کا ہے

فرحت زاہد کا تعلق پاکستان کی جدید ترین شاعرات میں ہوتا ہے۔ اس نے امریکہ میں سکونت اختیار کر لی ہے لیکن اپنی سرزمین اور اپنی تہذیب سے اس کا رشتہ ٹوٹا نہیں ہے۔

فرحت زاہد کو غزل اور نظم دونوں اصناف سخن پر دسترس حاصل ہے۔ اس کے شعری مجموعہ ''لڑکیاں ادھوری ہیں'' میں جدید عہد کی عورت کی سوچ نمایاں ہے جبکہ ایک اور خوبی یہ ہے کہ فرحت زاہد نے اپنے لہجے کی نرمی اور

لفظوں کے استعمال سے اپنی شاعری کو نئے رنگ دیئے ہیں اس کی نظم کے ٹکڑے سے اس کی نظم کاذائقہ ملاحظہ ہو۔

سوچ رہی ہوں
جیون کے اس کھیل میں جب بھی
وقت کی گاڑی آکر ٹھہرے
ہم یہ بازی جیت چکے ہوں
دُکھ کے موسم بیت چکے ہوں
(نظم۔دُکھ کے موسم بیت چکے ہوں)

فرحت زاہد نے رسمی اظہار سے الگ رہ کر سچائی کو اپنا ذریعہء اظہار بنایا ہے اور یہ دیکھئے کہ زندگی کو اپنے ساتھ لئے ہوئے اپنے آپ کو منوانے کا شوریدہ بے اختیار جذبہ حقیقت کی سنگلاخ زمین سے کس طرح چیخ کر نکلتا ہے۔

عورت ہوں مگر صورتِ کہسار کھڑی ہوں
اک سچ کے تحفظ کے لئے سب سے لڑی ہوں

پھر عورت کی پُر وقار آواز کہنے یا نسائی رم جھم کی ازلی قوت کیلئے یا سچائی کا اشاریہ کہیے یا باطن کی تب و تاب شوق کہیے۔

اس دشتِ بلا میں نہ سمجھ خود کو اکیلا
میں چوب کی صورت ترے خیمے میں گڑی ہوں

پروین طاہر نے اپنے مطالعے۔ تجربے اور مشاہدے سے صنف شاعری میں منفرد نظم گو کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کی ہے۔

وہ نہ صرف فنی اور تخلیقی سطح پر بلکہ حسیاتی سطح پر بھی نظم گوئی میں بڑے اعتماد سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ عہد موجود میں پروین طاہر کا جو تخلیقی اظہار صنفِ شاعری کے پیرائیہ اظہار کے طور پر سامنے آیا ہے اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ پروین طاہر کا ذخیرہ الفاظ کافی وسیع ہے سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ مناسب ترین الفاظ کے استعمال کا گر جانتی ہیں اور وہ لفظوں کے استعمال کا ادراک بھی رکھتی ہیں اور انہیں اپنی تخلیقی قوت کے اظہار کو شعری پیکر میں ڈھال دینے کے عمل پر عبور حاصل ہے۔

ان کی نظموں میں علامت۔ استعارے اور تشبیہہ کا رنگا رنگ روشن اور بیش بہا خزانہ ہے۔ ان کے شگفتہ لفظ لہجے میں شادابی اور نرماہٹ کا وصف رکھتے ہیں۔ ان کی نظموں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے سے مستعمل قدیم ساخت کے لہجوں کو پروین طاہر نے خوبصورتِ شاعرانہ مہارت سے اپنے مزاج میں جذب کر کے اظہار کی نئ قوتوں سے اپنی شاعری کو متعارف کرلیا ہے۔

ترى واديوں ميں  
اندھیروں کا پہرہ ہی رہتا ہے اکثر  
درخشاں منازل کو اُڑتا پرندہ  
سزا بے نشانی کی سہتا ہے اکثر  
یہ صدیاں اگلتی تھکاوٹ کے مسکن  
جہاں وسوسے چار سو بس گئے ہیں  
ڈری سہمی سہمی سی چلتی ہے دھڑکن

کسی بیتے یگ کی رو پہلی رتوں میں
گلابوں کے تختے مہکتے بھی ہوں گے
میری خواب راتوں کی تاریخ صبحوں میں
نیلے پرندے چہکتے بھی ہوں گے
گماں ہے کہ شاید وہ دن پھر سے آئیں
ترے جنگلوں کے
درختوں پہ گاتی پھریں فاختائیں
الوہی سروں میں مقدس سی تانیں
لگائیں ہوائیں
مناظر سبھی نور میں ڈوب جائیں

(طلوع کی دیوی)

۱۹۶۵ء سے شاعری کا آغاز کرنے والی مسرت جہاں خٹک نے خٹک قبیلے اور پشتون عوامی سماج کے ماحول میں آنکھ کھولی ہے۔اس کی مادری زبان پشتو ہے لیکن وہ اُردو میں شاعری کرتی ہے۔ مسرت جہاں خٹک نے "ملالہ" (مطبوعہ :باراول۔ ۱۹۹۳ء) میں اپنے جذبات اور تجربات کا اظہار کیا ہے۔اور پہلا تاثر ہی اتنا بھرپور ہے کہ اس کی شاعری کا ذائقہ دیر تک رہے گا۔ طویل نظموں کے علاوہ اس کی مختصر نظمیں بھی ایک تاثر رکھتی ہیں۔

میرے خدا
ان گلاب چہروں کو کبھی خاک نہ کرنا
جو صفحہء ہستی پر کھلتے ہیں
اور ساری دنیا کو مہکائے رکھتے ہیں

"دُعا" (ملالہ)

مسرت جہاں خٹک نے اُردو غزل کی روایت کا دامن نہیں چھوڑا'اس کے باوجود اس کے کلام میں نیا پن اور بانکپن موجود ہے۔ مسرت جہاں کی غزل روایت سے وابستہ رہ کر بھی جدید اور منفرد ہے۔

پھول ٹہنی سے ابھی ہاتھ میں آیا ہی نہ تھا
سُن لیا میں نے کہ خوشبو نے ترا نام لیا

لمحہ لمحہ چھین کر مجھ سے ملے گا تجھ کو کیا
کیوں نہ تیرے نام کر دُوں زندگی یہ انتساب

ڈاکٹر سلیم اختر کے لفظوں میں "نئی شاعرہ رخشندہ نوید کا مجموعہ کلام "پھر وصال کیسے ہو" دیکھا تو اسے نفسیاتی لحاظ سے بہت کار آمد پایا۔ عورت اپنے جسم' چہرے اور شباب کے بارے میں کتنی حساس ہوتی ہے۔ اس کی وضاحت کی ضرورت نہ ہونی چاہیے کہ عورت ہر دم نرگسی آئینہ میں بنتی سنورتی رہتی ہے۔ دیکھا جائے تو رخشندہ نوید کی شاعری کا بھی یہی بنیادی موضوع ہے'اس نے اپنی شاعری کو بڑی کامیابی سے نرگسی آئینہ مین تبدیل کر دیا ہے۔

چہرہ چہرہ کھلے گلاب کو رہنے دو
مالک کچھ دن اور شباب کو رہنے دو

ادب بھی رکھ ملحوظ آداب کو رہنے دو
اپنے میرے بیچ حجاب کو رہنے دو

رات کے ساتھ بات گئی رخشندہ جی
ایسے جھوٹے سچے خواب کو رہنے دو

اردو شاعری میں صنف غزل اپنی خوبصورتی اور دردل کشی کی وجہ سے بہت مقبول ہے۔ نوجوان نسل کا رجحان بھی غزل کی طرف کچھ زیادہ ہے۔ کاملہ انجم کا می کا شمار بھی پاکستان کی انہی شاعرات میں ہوتا ہے۔ کاملہ انجم نے غزل کو ہی ذریعہ اظہار بنایا ہے لیکن روایت اور جدت کی آمیزش سے خوبصورت غزل تخلیق کرتی ہے۔

کھلا نہ حال کسی پہ اداس چہروں کا
دلوں کے بھید ہیں گہرے سمندروں کی طرح

نظر چرا کے گزرنے پہ بھی اسیر ہوئے
بلا کا حسن تیری چشم بیقرارمیں تھا

سیدہ عارفہ بصیر، کا تعلق چند برس قبل شاعری منظر پر آنے والی شاعرات کا تازہ دم کھیپ میں ہوتا ہے۔ یہ عہد حاضر کے آشوب اور زمینی قرب کی شاعرہ ہے۔ اس کا دوسرا تازہ مجموعہ کلام ''لمحہ لمحہ'' کے عنوان سے طبع ہو چکا ہے۔ جب کہ اس کا پہلا شعری مجموعہ ''موجہ نور'' اس سے قبل طبع ہوا تھا۔

شاعری کے میدان میں شمسہ کنول کی آمد سے شاعرات کی فہرست میں ایک اچھی شاعرہ کا اضافہ ہوا۔ اس کی شعری تصنیف طبع ہو چکی ہے جس کا عنوان ہے ''دھوپ کی زد میں پہلا چاند''، جسمیں نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی، شمسہ کنول کی شاعری کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کس قدر حساس ہے اور اپنے احساسات کو

کھرے پن کے ساتھ پیش کرنے کا سلیقہ رکھتی ہے۔ اس کی نظموں کے مختلف عنوانات ہیں جو توجہ طلب ہیں۔ ''کس سے پوچھوں''، ''ایک انجان اجنبی چہرہ''، ''خواہش''، ''تم سے جب نہیں ملتے''، ''سرخ گلاب''، ''دل دھڑکے گا'' اور دیگر کئی خوبصورت نظمیں بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ شمسہ کنول کی نظموں میں درد، سوز اور بے چینی کی فضا کے علاوہ کئی نظموں میں نرماہٹ اور کومتاپائی جاتی ہے۔ اس کی غزل بھی عمدہ ہے۔ اس کی غزل اس کی آواز کی طرح سماعتوں اور بصارتوں میں رس گھولتی ہے۔

میں ادھوری غزل سہی شمسہ
کاش مجھ پر بھی سوچتا کوئی

احمد عقیل روبی کے مطابق، ''شمسہ کنول کی شاعری میں ایک ایسی عورت کا دل دھڑکتا ہے جو ہجر و فراق کے سنگھاسن پر بیٹھی دل کی گزرگاہ پر دور تک امیدوں اور آرزوؤں کے خواب خاموشی سے دیکھتی رہی اور پھر انہیں تخلیقی آنچ دے کر شعروں میں ڈھال دیا۔

اك آئینه سا شخص كه اترا تھا روح میں
شمسه وه عكس دیدئه حیراں لے گیا

شمسہ کنول اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کچھ اس انداز سے بھی کرتی ہے۔

بند آنکھوں سے بنایا تھا امیدوں کو دلہن
خواب ٹوٹے تو سرے راہ جنازے دیکھے

شہر والوں نے بہت دیکھیں کنول کی خوشیاں
کس نے رخسار پر بکھرے ہوئے غازے دیکھے

بالعموم شاعرات اپنی تخلیقی جبلت کے اظہار کے لیے غزل کا انتخاب کرتی ہیں، لیکن گلنار آفریں ایسی شاعرہ ہے جس کا غزل کے مقابلے میں نظم کی طرف کچھ زیادہ رجحان ہے چنانچہ ''تشنہ غم'' مکمل طور پر نظموں پر مشتمل ہے۔ گلنار آفریں نے عصری صورتحال کے حوالے سے بڑی تیز و تند نظمیں لکھی ہیں۔

کراچی کے دگرگوں حالات کے تناظر میں گلنار آفریں کی منظومات ''امید کا پرچم'' اور ''میری آواز سنو'' میں وطن کی سیاسی صورتحال اور سیاسی کیفیات کے ساتھ ساتھ شہر کراچی کے حالات اور اجتماعی زندگی کے ٹوٹے ہوئے خوابوں کی کرچیاں ناانصافیوں کے انسانیت کُش کریہہ مناظر اور ان کے خلاف احتجاج ملتا ہے۔

گلنار آفریں کی غزل میں بھی کچھ ایسی ہی کیفیات پائی جاتی ہیں۔ چند شعر دیکھیں۔

خلوص آمیز جذبوں کی زبان مانی نہیں جاتی
دلوں کی بات چہروں سے پہچانی نہیں جاتی

غموں کا بحر بھی لوگو کہیں پایاب ہوتا ہے
سفینہ ڈوب بھی جائے تو طغیانی نہیں جاتی

اب ہم بھی چاہتے ہیں شہرِجاں آباد ہو جائے
مگر گلنار شہرِجاں کی ویرانی نہیں جاتی

ڈاکٹر رخشندہ پروین، جدید تر اردو شاعری میں ایک منفرد اور اہم نام ہے۔ اس کی نظموں کا پہلا مجموعہ ''مجھے محبت سے ڈر لگتا ہے'' (مطبوعہ = اپریل 1996ء) کی نظموں کے حوالے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعرہ نے سوزنِ فکر سے خیالات کی دھجیوں کو بڑے سلیقے، منفرد اور خوبصورت انداز سے سیا ہے۔

قمر جمیل کے لفظوں میں، ''رخشندہ پروین کی شاعری نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ اس لیے کے اس شعری مجموعہ میں مجھے ایک نظم ایسی بھی ملی جو میں نے آج تک اردو ہی کیا کسی مشرقی اور مغربی شاعری کے مجموعہ میں نہیں دیکھی تھی۔ اور سچ بات تو یہ ہے کہ ہم جیسے شاعر تو ایسی نظم لکھ بھی نہیں سکتے، عجیب نظم ہے''۔

رات بھر
یہ سوچتی رہی
سوچ سوچ
کر
روتی رہی
میرا اور دشمنوں کا
خدا ایک ہے

خدا
(مجھے محبت سے ڈر لگتا ہے)

رخشندہ پروین نے اپنی سوچ فکر اور خیال و نظر کے دریچوں سے شاعری کو نئی پگڈنڈی سے روشناس کیا ہے۔ ''مجھے محبت سے ڈر لگتا ہے'' کی نظموں میں زندگی کے نازک اور لطیف احساسات کی ٹوٹ پھوٹ اور جذبات کے ریزہ ریزہ ہو جانے تک کی کیفیت کا اظہار جس شاعرانہ خوبصورتی سے کیا گیا ہے وہ رخشندہ پروین ہی کا حصہ ہے اور اس سے نثری نظم کی معنویت، وسعت، فکر انگیزی، اور مقبولیت اور رجحان کے امکانات بہت واضح ہو گئے ہیں۔

ڈاکٹر رخشندہ پروین نے اپنی چھوٹی مختصر اور طویل نظموں مثلاً ''کاش ایسا ہوتا''، ''پروین شاکر کے لیے نظم''، ''سزا''، ''رویہ''، ''کتبہ''، ''دعا''، ''پذیرائی''، ''صرف آج مگر''، ''آگ اور روشنی'' وغیرہ نظموں میں بھی مضامین کی وسیع فکری قلبی واردات کو شاعرانہ چابکدستی سے لفظوں کی ڈوری میں پرویا ہے۔

دُرِ نجف زیبی کے شعری مجموعہ ''ہم اور تم'' میں گیت' قطعات اور نظموں کے علاوہ غزلیں بھی شامل ہیں وہ غزل میں روایت اور تجربات سے نکلنے کی کوشش کر رہی ہے اس کے اندازِ بیان میں شوخی کا عنصر بھی موجود ہے۔

درِ نجف زیبی نے زندگی کے تجربات و مشاہدات کو بڑے عمدہ اور دلکش انداز میں پیش کیا ہے اس کی نظم سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہجر اور تنہائی کی کیفیت میں گم ہو کر شعر تخلیق کرتی ہے اور اس کی شاعری انسانی کیفیات کی مظہر ہے اور معاشرتی کیفیت کے بیان مین بھی رجائیت نمایاں ہے۔

ماورا عنایت کی نثری نظموں کا مجموعہ ''دسمبر کی رات'' کے عنوان سے طبع ہو چکا ہے۔ ماورا عنایت کی نظمیں اس کے جذبات و احساسات کی آئینہ دار ہیں۔ وہ جو سوچتی ہے اس کا اظہار کر گزرتی ہے۔ وہ اپنی زندگی کو بھی ''دسمبر کی سرد رات'' کا نام دیتی ہے۔ اس کی مختصر سی نظم ملاحظہ ہو۔

میری زندگی دسمبر کی رات ہے
وقت سے پہلے سرے سے آخری سرے تک
گھپ اندھیرا' کالا سناٹا
برف میں ٹھٹھری عورت
رات میں تنہا جاگ رہی ہے

یہ انسانی جبلت ہے کہ وہ جانے والوں کا غم کرتا ہے لیکن رویے مختلف ہوتے ہیں۔ ماروا عنایت بھی جانے والوں کا غم کرتی ہے۔ مگر واویلا نہیں مچاتی' وہ غم کرتی ہے مگر خاموشی کے ساتھ۔

تم بھی چلے گئے
لیکن میرے اندر
اپنا نام و پتہ چھوڑ گئے
میرے خواب تیرے خط ہیں
ان کو تیرے نام کیسے بھیجوں؟

ماورا عنایت کی چھوٹی چھوٹی نظمیں' بھرپور تاثر رکھتی ہیں۔ اس کی نظموں میں آہنگ ملتا ہے۔ ماورا عنایت کی نظموں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ زندگی کی سچائیاں بیان کرتی ہے لیکن وہ نظمیں لکھتے وقت شدید اندرونی کرب سے گزرتی ہے

کیسی پیاس
تشنگی تنہائی

که خود کو پیار بھرے خط
لکھنے کو جی چاہتا ہے

یاسمین حبیب' کا شمار نئی نسل کی اذیت پسند شاعرات میں ہوتا ہے۔ وہ جلتے ہوئے جسم وجاں سے رنگ وبوباس' روشنی اور حدت لے کر لفظوں میں بھرتی ہے۔ وہ انتہائی مبہم اور الجھاؤ والی باتیں بھی اتنی بے ساختگی اور اعتماد کے ساتھ کرتی ہے کہ بے اختیار اسے داد دینے کو دل چاہتا ہے۔ اس کے مجموعہ کلام ''آسیب سے پرچھائیں تک'' (مطبوعہ=بار اوّل ۱۹۹۶ء) میں کئی ایسی نظمیں شامل ہیں جنہیں بار بار پڑھنے سے بھی اکتاہٹ نہیں ہوتی' اس کے قطعات بھی اپنا ایک ذائقہ رکھتے ہیں۔
شہزاد احمد کے مطابق، ''یاسمین حبیب کی شاعری ایک محبت کرنے والی عورت کے ایسے روپ کو پیش کرتی ہے جو ہماری روایتی لوک شاعری سے خاصا ملتا جلتا ہے۔ اس میں محبت کا اظہار عورت کی طرف سے ہوتا ہے۔

جو رات وصل کی گزری تمہارے پہلو میں
اس ایک شب کا ابھی تک خمار باقی ہے

خیال بھی نہیں آتا کہ نیند کیا شے ہے
یہ رتجگوں کا عجب سلسلہ ہے میرے لئے

ذرا اپنے بدن کو چھو کے دیکھو
کوئی تحلیل تم میں ہوگیا ہے

تم لپٹ جائو بدن سے مرے چندن بن کے
اور میں یاد کو خوشبو میں بسا کر رکھوں

امجد اسلام امجد کی رائے یہ ہے کہ یاسمین حبیب کی شاعری میں ''ہرجائی مرد'' ایسے متنوع اور بھرپور انداز میں سامنے آیا ہے جس کی مثال اردو شاعری میں سوائے پروین شاکر کے اور کہیں اس طرح سے نظر نہیں آتی،

ترا وجود مری ذات کا حوالہ ہے
بدن کو ہاتھ لگاؤں تو تیرا ہاتھ لگے

مری زندگانی ہے تو اگر تو قیام میرے بدن میں کر
ترے لمس سے ہو شکن شکن مرے تن پہ جو بھی لباس ہے

حمیدہ شاہین کی شعری تصنیف ''دستک'' کے نام سے طبع ہو چکی ہے اس کے شعر روایت سے منسلک ہوتے ہوئے بھی جدت کے حامل ہیں اور یہ جدت نئے دور کے طرز احساس سے پیدا ہوئی ہے۔ حمیدہ شاہین کی غزلوں میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جہاں وہ عورت کی تخصیص سے بالاتر ایک فرد کی طرح اپنے تاثرات و مشاہدات بیان کرتی ہے۔

اک عرصہ ہوا مجھ سے اس کا یہ رویہ ہے
جیسے میں کوئی اس کا مفتوحہ علاقہ ہوں

ایسے خوبصورت شعر کہنے والی یہ نئی آواز اُردو غزل کے گلشنِ ہزار رنگ میں نئی مہک کا اضافہ ہے۔

"خوابوں کے جزیرے" کی بے باک شاعرہ مہر نگار کے شعری جذبات۔۔۔۔ زندگی کے بارے میں رومانی نقطہ ء نظر کے عکاس ہیں' وہ اپنی سوچ کا اظہار بر ملا کرتی ہے۔ اس کے لفظ بولتے ہیں۔

میں اک چھوٹی لڑکی ہوں
مگر پھر بھی
میں جرأت کرتی ہوں
کہ
میرے اندر کی روح اک عورت
ہی کی تو ہے
کیا تو جیون
میرے نام کرے گا

مہر نگار کے شعری مجموعہ میں "دن بہار کے"۔ "جنم دن"۔ "پیار کی دیوانی"۔ "ممتا"۔ وغیرہ ان کی وہ نظمیں ہیں جہاں فن اور جذبہ دونوں عروج پر ہیں لیکن اس کی نظم "اندھی بہری گونگی"۔ اس کی ساری نظموں سے بڑھ کر گہری اور سنجیدہ نظم ہے۔ اس میں مشاہدہ اور جذبہ پھولوں کے ہار کے طرح گندھے ہوئے خوشبو بکھیر تے ہیں۔

رئیس امروہی کے لفظوں میں ''مہر نگار نے اپنے تخیل و تاثر کو چند الفاظ میں محدود مقید کر کے بیان کیا ہے یہی اس کے کلام کی خصوصیت ہے''۔

نسیمہ ھدیٰ کا شعری مجموعہ ''مژگاں'' طبع ہو چکا ہے۔ اس کی نظمیں۔ اپنا ایک تاثر رکھتی ہیں ان کا شمار عمدہ نظموں میں کیا جا سکتا ہے مثلاً ''خرابات''۔ ''گیت''۔ ''اضطراب'' جیسی نظموں کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ ''مژگاں'' میں نظموں کے مقابلے میں غزلوں کی تعداد زیادہ ہے جو غزل کی طرف اس کے غالب رحجان کی عکاسی کرتی ہے اور اس کی غزلوں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نظم کے مقابلے میں وہ غزل زیادہ بہتر کہتی ہے اس کے کلام میں بالخصوص غزلوں میں ایسے اشعار ملتے ہیں جو صرف عورت ہی کہہ سکتی ہے یعنی ایسے جذبات عورت کے ہی ہو سکتے ہیں۔

اپنے عہد کی شاعرات میں ریحانہ روحی کا نام غیر معروف نہیں ہے۔ ان کی شاعری میں نزاکت بھی ہے اور نفاست بھی۔ معصوم خواہشات بھی ہیں اور تلخ حقیقتیں بھی۔ شاعرانہ حسن و صداقت بھی ہے اور منفرد تخیل بھی۔

عورت ہونے کے ناطے ریحانہ روحی نے عورت کی مجبوریوں اور دکھوں کو شدت سے محسوس کیا ہے۔ وہ اپنے دل میں ہجر اور تنہائی کا درد محسوس کرتی ہیں ان کی غزل ہو یا نظم اس میں ہجر اور تنہائی کا درد محسوس کرتی ہیں ان کی غزل ہو یا نظم اس میں ہجر اور تنہائی کے دکھ کا اظہار ملتا ہے۔

جسے وہ چاہتی ہیں اور اسے اپنانے کے لئے سچ کو جھوٹ میں بدلنے سے بھی گریز نہیں کرتیں کیونکہ محبت کی شریعت میں سب کچھ جائز سمجھا جاتا ہے۔'
مگر شاعرہ کا محبوب ناقدر شناس ہے وہ شاعرہ کے مخالفوں کی صف میں کھڑا ہو جاتا ہے تو وہ بے ساختہ کہہ اٹھتی ہیں۔

وہ جس کے حق میں جھوٹی گواہی بھی میں نے دی
روحی مرے خلاف شہادت اسی کی ہے

مگر محبوب کے تلخ رویے کے باوجود' محبت ان کی سب سے بڑی خواہش ہے ان کی محبت سچی اور مکمل ہے۔

ریحانہ روحی کی غزل کا درج ذیل مقطع توان کے خوابوں۔ خواہشوں۔ خیالوں اور محبتوں کا مظہر ہے۔

روحی تمام تلخ نوائی کے باوجود'
اک پل کو میرے دھیان سے جاتا نہیں ہے وہ

نظم کے حوالے سے دیکھا جائے تو اردو نظم میں' نظم گو شاعرات نے اپنی فکر اور اظہار میں تازگی کے خوب جوہر دکھائے ہیں۔ ریحانہ روحی کے کلام کو جب ہم اس تناظر میں دیکھتے ہیں یا اس کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ انہوں نے فکر کی کوئی نئی جہت نہیں دی لیکن اس کے باوجود اظہار کا سحر ان کے ہاں ملتا ہے جو ہمیں فوراً گرفت میں لے لیتا ہے۔

ریحانہ روحی کے ہاں ہمیں ان خاتون کے دل کی حسرت کا احساس ہوتا ہے جو خوابوں کے موسم سے گزر کر اس بنجر دھرتی تک پہنچ چکی ہے جہاں کوئی پھول اور کوئی خار نہیں 'اس کیفیت کو انھوں نے کئی نظموں میں پیش کیا ہے لیکن ان کی ہر نظم میں یہ کیفیت ایک نئے اور شگفتہ استعارہ کی صورت میں ابھرتی ہے۔

زبان و بیان کی تازگی اور شگفتگی کہیں بھی تکرار کا احساس پیدا نہیں ہونے دیتی۔ مثلاً ان کی نظم ''انتظار'' کو دیکھ لیجئے' یہ متاثر کن نظم ہے۔ ریحانہ روحی نے لفظوں کے توسط سے ایک ایسا درد انگیز منظر پیش کیا ہے جس میں ہجر۔ جدائی اور اکیلے پن کا کرب۔

یاس نراش کا احساس

آنے والے وقت کے کھنڈرات میں نظر آتا ہے اور قاری پر چھائیوں کے صحرا میں بھٹکنے لگتا ہے لیکن خوف یا ڈر نہیں لگتا۔ البتہ غم کے دھنک رنگ بکھرے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

ریحانہ روحی کا اولین شعری مجموعہ ''عشق زاد'' حال ہی میں طبع ہوا ہے۔

نثری نظم کہنے والی شاعرات کے میلے میں جب ہم رخشندہ کوکب کی نثری نظموں کو دیکھتے ہیں تو وہ نثری نظم کے معیار پر نہ صرف پوری اترتی ہے بلکہ وہ نثری نظم کی پہچان بھی ہے۔

اس کی شاعری جذبوں کی شاعری ہے۔ نرمل اور میٹھے جذبے نینوں کی راہ سے دل میں اُتر جانے والے جذبے اس کی ایک مختصر سی نظم ملاحظہ ہو۔

اک سپنا رات میں نے دیکھا ہے
خوبصورت تو ہے مگر میں ڈرتی ہوں
اگر اس سپنے کو میں نے زندگی بنالیا
تو کیا ہوگا
میں تو اک انسان ہوں
کوشش کے بعد بھی اک بات آخر رہ ہی جاتی ہے
جسے ہم قسمت کہتے ہیں
قسمت ہی اگر سب کچھ ہے
تو مجھے اپنا ہونا' نہ ہونا لگتا ہے

رخشندہ کوکب کی ایک دوسری خوبصورت نظم ہے جسے پڑھتے ہوئے قاری اس کی گرفت سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اس کا اندازہ اس کی ایک نظم کی مندرجہ سطروں سے لگایا جاسکتا ہے۔

کاش میں مندر میں سجی ایک مورتی ہوتی
اور تو مجھے خوش کرنے کے لئے
خوشبو بھرے پھولوں کے تھال
میرے قدموں میں لاکر ڈھیر کرتا
اور میں پتھر بنی
کسی اونچی جگہ نصب ہوتی

رخشندہ کوکب طویل نظمیں بھی لکھتی ہے اور مختصر بھی۔ لیکن اس کی

گرفت مضبوط ہوتی ہے۔ لفظوں کی نزاہٹ' کوملتااور معصومیت سے اس کی نظمیں اپنا بھر پور تاثر رکھتی ہیں۔

گیت بنیادی طور پر ہندی زبان کی ایک صنف ہے ''خواب آنگن''کی شاعرہ ڈاکٹر قمر آراء نے جب دل کی بات کا اظہار کیا تو مترنم جملوں کو میٹھے رسیلے گیتوں کا روپ مل گیا۔

''خواب آنگن' میں زندگی کے مختلف رنگوں اور نسوانی جذبوں کے اتار چڑھاؤ کا فنکارانہ اظہار ملتا ہے جس میں عورت کے دل کی آواز بھی ہے اور نسوانی جذبوں کی کوملتا بھی ہے اور سندرتا بھی۔

ڈاکٹر قمر آراء کی غزلیں اور نظمیں زندگی کی سچائیوں اور خوبصورتیوں کو تمام تر توانائیوں کے ساتھ پیش کرتی ہے۔

میں اپنی چاندنی راتوں میں رنگ کیسے بھروں
مجھے جگا کے سرِ شام سوگیا وہ شخص

واسطہ دے کے پھر محبت کا
پھر نیا زخم دے گیا جاناں

نائلہ روبی جدید تر شاعرات کے قافلہ کی مسافر ہے۔ اب تک اس کی جو چند نظمیں اور غزلیں اخبارات رسائل میں چھپ کر سامنے آئی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ نائلہ روبی رجائیت پسند شاعرہ ہے۔

ٹکراؤ زمانے سے تو کچھ بات ہے روبیؔ
مرنا تو محبت میں بڑا کام نہیں ہے

عطیہ بتول مینا نے شاعری میں غزل ہی کو پسند کیا ہے۔ پاکستان کی نئی نسل کی شاعرہ ہونے کے باوجود اس کی غزلیں عموماً فنی معائب سے پاک ہوتی ہیں۔ وہ اپنے احساسات اور جذبات کو شاعرانہ انداز سے اُجاگر کرنے کا فن جانتی ہے۔ زیادہ رواں اور سادہ ہے اس کے ہاں موسم کا استعارہ بار بار آتا ہے۔

نام کیاں دوں میں ایسے موسم کو
اب کے پودے پہ آئے خشک گلاب

کڑی دوپہر میں سایہ نہ تھا مگر تو تھا
وہ آگ اگلتا سا موسم بھی کیا سہانا تھا

جدید تر شاعرات کی فہرست میں یاسمین سیف کا نام شامل ہے۔ غزل اور نظم میں اس کی شعری صداقتیں عیاں ہیں۔ یاسمین سیف کے لفظ خوشبو بکھیرتے ہیں۔ وہ قلبی وارداتوں کو خلوص ووفا کے جذبوں سے معطر کئے ہوئے ہے۔

پاؤں ہی شکستہ تھے وگرنہ یاسمیں
وقت نے تو کاسنی پازیب پہنائی ہے

یاسمین سیف، حرفِ غزل میں استعاروں، کنایوں، تلمیحوں اور دیگر

شاعرانہ اسرار و رموز سے ہی واقف نہیں بلکہ حمد و نعت جیسی مشکل صنف سے بھی
بخوبی آگاہ ہے اور نعت کو نعت ہی کی بحر اور تخیل میں بیان کرتی ہے۔

خوں رنگ آندھیوں میں بھی تازہ گلاب دے
میری زمیں پہ آقا عذابوں کے جال ہیں
اب تو مدینہ مجھ کو بلالیں شہ زماں
جانے نصیب عمر میں کتنے ملال ہیں

دُرِ شہوار فیروز کا نام نئی کھیپ کی شاعرات میں کوئی غیر معروف نام نہیں
ہے اس کے الفاظ کا چناؤ اور جذبات نگاری ملاحظہ ہو

گلوں کی رُت کی نشانی کوئی تو باقی رہے
چمن میں ایک تو تازہ گلاب رہنے دو

یہ قطرہ قطرہ پگھلتی ہیں اور گھلتی ہیں
خدا نے غم کی تمازت میں لڑکیاں رکھ دیں

اسماء شاہ سلمٰی کے شعری مجموعہ ''محبتوں کے بعد'' (مطبوعہ بار اوّل
1997ء) کو ادبی حلقوں میں سراہا جارہا ہے۔ افتخار عارف کے مطابق ''اسماء شاہ
سلمٰی نے مغرب زدگی کی روش سے شعوری اجتناب کرتے ہوئے نسائیت کی مشرقی
روایت کی پاسداری کی ہے اور ان قدروں اور جذبوں کی مقدور بھر ترجمانی کی ہے
جو ہمارے بنیادی تشخص کا معتبر حوالہ ہے۔

کوئی باراتی نہ آیا ہاتھ میں مہندی لئے
دیکھتی ہی رہ گئی وہ شامیانے کی طرف

شاعر چونکہ شعور کا مرقع ہوتا ہے لہٰذا احساس کی شدت اس کی فطرت کا خاصا ہوتا ہے۔ معاشرے کا فرد ہونے کی حیثیت سے وہ اپنے مشاہدے کی گہرائی اور احساس کی گہرائی سے جذبے کی شدت کو پروان چڑھاتا ہے۔

سیما سراج نے کراچی کے دگر گوں حالات کے تناظر میں جو نظم کہی ہے اس کے لفظ لفظ سے شاعرہ کے جذبات واحساسات اور مشاہدات کی گہرائی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اس کی نظم "کراچی مت آنا" ملاحظہ ہو۔

کبھی میرے شہر میں
آنے کی خواہش بھی ہو تو
مت آنا
یہاں رات گئے نہیں
دن میں بھی درندے منڈ لاتے ہیں
دہشتوں کے سائے --- سر شام
گھروں کے درودیوار پر اتر آتے ہیں
یہاں آستینوں میں
سانپ پلتے ہیں
تشنہ خواب ریزہ ریزہ کنواری آنکھوں میں
مچلتے ہیں
کبھی نہ آنا کہ واپس نہ جاسکو گے

تمہاری ماں
دہلیز پر کھڑی ساری زندگی
تمہارا انتظار کرتی رہے گی
اسے معلوم بھی نہ ہوسکے گا
کہ کب
لاوارث مسخ شدہ لاشوں میں
تمہیں بھی دفنایا جاچکا ہے

اینلا خان اُردو شاعرات کے حلقے میں نوارد ہے لیکن اس کے کلام میں جان ہے اور اسے اپنے آپ پر اعتماد ہے شاید اسی لئے بڑے اعتماد سے اس نے ''ہد گلی کے کھلے کواڑ'' کے نام سے اپنا پہلا شعری مجموعہ چھپواڈالا ہے جس میں اینلا خان نے اپنی غزلوں نظموں اور آزاد نظموں کو یکجا کر دیا ہے۔
اینلا خان کے کلام میں نغمگی اور شعریت پائی جاتی ہے اس نے اپنے احساسات اور جذبات کو اشعار کا روپ دیا ہے۔ مثلاً وہ کہتی ہے

لاکھ رکھ دو تم کسی پہ اپنا سب کچھ وار کر
جن کو جانا ہو' چلے جاتے ہیں ٹھوکر مار کر

ہم رہ نوردِ شوق ہیں ہم کو نہیں غرض
لے کر چراغ ہاتھ میں آتا ہے کوئی کب

بہار النساء بہار منفرد لہجے اور خوبصورت جذبوں کی عکاس شاعرہ ہے۔ اُردو

میں ان کا شعری مجموعہ ''عکس بہار'' چھپ چکا ہے۔ جبکہ دوسرا مجموعہ کلام ''تمہارا نام لکھنا ہے'' زیر طبع ہے۔ ان کے کلام میں لطافت اور پاکیزگی کا احساس ہوتا ہے۔ غزل میں سادہ اسلوب اختیار کرتی ہیں۔

جدائی کی خلش پائی ملا مجھ کو وصال غم
انا کی جنگ جیتی بھی وفا کیسے نبھاؤں گی

غزل کے علاوہ بہار النساء بہار نظم بھی خوب کہتی ہیں ان کی نظموں کو پڑھ ان کی فنی گرفت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے

جو حسن ہے باکمال تیرا
جو رنگ ہے لازوال تیرا
یہ ماہ و انجم حسین موسم
چمن میں پھولوں کا رقص پیہم
ہو وجد میں جیسے سارا عالم
میں دیکھتی ہوں تو سوچتی ہوں
بہار کتنی ہی جاوداں ہو
ترے چمن میں اگر نہ آئے
تو کون اس کو بہار مانے

(یہ آسماں سے اترتی بارش)

رعنا ناہید رانا کی شاعری کا اسلوب روایتی ہے۔ بحور اور روایتی شاعری کی تکنیک پہ ان کی گرفت مظبوط ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انھوں نے غزلیں کم لکھی ہیں۔ ان کی غزلوں میں خیالات کی جدت نظر آتی ہے خاص طور پر چھوٹی بحر کی غزلوں میں ان کا ڈکشن بھی قدرے نیا ہے۔ ان کی ایک غزل کا مطلع ہے۔

وہ چاند چہرہ ہمیشہ نظر میں رکھا جائے
کوئی چراغ جلا کر نہ گھر میں رکھا جائے

رعنا کی غزلوں میں شاعرانہ صلاحیت یا فکر کا فقدان نہیں نظر آتا۔

ہم لوگ ضرورت ہی ضرورت ہیں بہرحال
مانگیں گے دعا بھی تو دعاختم نہ ہو گی

اتنا اچھا شعر کہنے والی شاعرہ سے بہت سی توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ پچھلے کچھ برسوں میں جن شاعرات نے نسائی جذبوں، محسوسات، مشاہدات، کیفیات اور قلب و نظر کو زبان عطا کی ہے ان شاعرات میں روزینہ قریشی ایک خوبصورت اضافہ ہے۔ روزینہ قریشی کی شاعری عصری سچائیوں اور انسانی رویوں کی شاعری ہے۔

ہم تو کھلی فضاؤں میں اک پل نہ رہ سکے
دی ارض نے رہائی تو قید سما ہوئے

نادیہ کومل، نوجوان شاعرہ ہیں۔ نادیہ کومل نے چھوٹی عمر میں زندگی کے تلخ وشیریں موسموں کا مشاہدہ کیا ہے۔ ان کے کلام میں زندگی کے گہرے شعور کی لہر دوڑتی نظر آتی ہے۔ قدرت نے انہیں بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں سے نوازا ہے، وہ قرینے سے سوچ سمجھ کر شعر کہتی ہیں۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''کوئی توبات ہے تجھ میں'' چھپ چکا ہے جس میں نادیہ کومل کی بہت ہی خوبصورت اور متاثر کن غزلیں اور نظمیں شامل ہیں ان کی شاعری کی مختلف جہتوں کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ وہ بہت جلد ادب میں نمایاں مقام حاصل کرلیں گی۔

تم نے تو کرلیا ہے کنارا سو خوش رہو
اہل و فاہوں خاک بسر تم کو اس سے کیا
تم اپنے قہقوں کی کھنک میں رہو مگن
روئیں کسی کے شام و سحر تم کو اس سے کیا
کتنوں کے ساتھ تم نے کیا ہے یہی سلوک
ہو جائیں ہم بھی شہر بدر تم کو اس سے کیا

پاکستان کی جدید تر شاعرات میں نیلما سرور نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ نیلما سرور کا تیسرا مجموعہ کلام ''تمہارا شہر کیسا ہے'' کے نام سے چھپ چکا ہے۔ اس سے قبل اس کی شاعری کے دو مجموعے ''جب تک آنکھیں زندہ ہیں'' اور ''جب نہر کنارے شام ڈھلی'' طبع ہو چکے ہیں۔

نیلما سرور کی شاعری اپنے اندر احساس کی گرم، سرد رتوں کے تمام ذائقے رکھتی ہے۔

رخسانہ نور، کی شاعری اپنے اندر امکانات کی ایک وسیع اور رنگارنگ دنیا

لیے ہوئے ہے۔ ''الہام'' کے عنوان سے اس کا شعری مجموعہ طبع ہو چکا ہے۔ وہ اپنے سماج میں رونما ہونے والے حالات اور واقعات سے اتنی شدت سے متاثر ہوئیں کہ الہام نہ ہونا بے معنی سا ہو کر رہ گیا۔

مظہر شہزاد خان کے لفظوں میں . . . . اور پھر یہی الہام رخسانہ نور کو حرفوں، تحریروں، فقروں اور باتوں سے معتبر بناتا ہے۔

شاعرانہ مشاہدے اور جذبے کی لو جتنی تیز ہو گی شاعر کا کلام اتنا ہی تیکھا اور پُر اثر ہو گا۔ رخسانہ نور کی نظموں کا تسلسل ایک عجیب سی گرہ کھولتی ہے۔ ہر نظم کسی حادثہ یا واقعات سے جڑی ہوئی ہے۔ اگر اس کی اپنی سالگرہ بھی ہے تو ایک واقعہ ہے۔ کسی معصوم لڑکی کے ساتھ زیادتی کی خبر بھی ایک حادثہ ہے اور رخسانہ نور ان حادثوں سے بری طرح مجروح ہو رہی ہے۔

ہر اك نا خدا کے اندر
اك درندہ بیٹھا ہے
جس کی چبھتی گندی آنکھیں
تن کو چھلنی .کرتی ہیں
اك وہ معصوم سی لڑکی
مجھ کو بے بس لگتی ہے
جس کی سوچوں کا روپ پل میں
عرش ہوا پھر فرش ہوا

شعری دنیا میں شہناز امید کی آمد ایک خوبصورت اضافہ ہے۔ شہناز امید کے کہنے کا اپنا ایک انداز ہے سادہ عام فہم لیکن شاعرانہ۔ اس کی غزلوں میں معصومیت

بھی ہے اور دلآویزی بھی۔ تڑپ بھی ہے اور گداز بھی ہے۔ امید بھی ہے ناامیدی بھی۔
اس کا رنگِ سخن ملاحظہ ہو۔

تھی پیار کی بات آ گئی بے ساختہ لب پر
ہر چند سُنا تھا کہ زبان سوچ کے کھولو

ماہ پارا صفدر، برصغیر پاک و ہند میں نیوز کاسٹر کے حوالے سے منفرد اور مضبوط شناخت رکھتی ہے وہ کئی سال پہلے پاکستان میں ریڈیو اور ٹیلیویژن پر خبریں سناتی ہوئی ناظرین اور سامعین کے کانوں میں سریلی اور میٹھی آواز کا رس گھولتی رہی ہے۔ اور اب گزشتہ کچھ برسوں سے لندن میں مقیم ہیں۔ اور وہاں بی بی سی لندن سے خبریں اور تبصرے پڑھتے ہوئے اپنی آواز کا جادو جگا رہی ہے۔ لیکن پردیس میں رہ کر بھی اپنی بے پناہ مصروفیات میں سے فکرِ شعر کے لیے کچھ لمحے نکال لیتی ہے۔ ماہ پارہ صفدر غزل اور تغزل کے بنیادی مطالبات کو پورا کرنے کی ہر ممکن سعی کرتی ہے۔
ماہ پارہ صفدر کی شاعری کا دائرہ اگرچہ محدود ہے اور اس کے سارے تجربے اس کی ذاتی دنیا سے وابستہ ہیں مگر ان کی سمتیں اور ان کے رخ خارجی دنیا ہی کی جانب کھلتے ہیں۔
ماہ پارہ صفدر کے چند شعر ملاحظہ ہوں، جس میں خیال و فکر جذبہ و احساس اور مطالعہ اور مشاہدہ کے خاصے بلیغ مناظر پائے جاتے ہیں۔

کاش تمہارے دل میں بھی اک ساتھ اتر جاتی
میری سوچ کے دریا سے جو اٹھی ہے آواز
جنگل جنگل پھیل رہی ہوتی ہے اک خوشبو

نرم ملائم جھیلوں میں جب اگتی ہے آواز
ڈوب کے ذات سمندر میں یہ آخر راز کھلا
سایہ ہے حرفوں کا مقتل، روشنی ہے آواز
اس سے میرا رشتہ سب رشتوں سے بڑھ کر ہے
میں جب تھک کے سو جاتی ہوں جا گتی ہے آواز

ماہ پارہ صفدر کی شاعری کا یہ لہجہ کم و بیش اس کی شاعری میں موجود ہے۔ اور اس کی شاعری میں محبت کی انگڑائیاں، فراق کی ٹیس، تجربے کی رونمائیاں، دکھ کے ہیولے اور جذبات کی صداقتیں موجزن ہیں۔

علاوہ ازیں اس کی آواز میں لہجے کی نرماہٹ اور حسن کی نزاکت بھی ہے بلکہ یوں کہنا بے جا نہ ہو گا کہ ماہ پارہ صفدر کے پیرایہ غزل میں زیست کی اجتماعی کیفیتیں نظر آتی ہیں کیونکہ وہ اپنے اندر کی آواز کو شعری سانچے میں ڈھالنے کا ہنر بھی جانتی ہے اور اسلوب بھی۔

خلیق تبسم کی شاعری کا بنیادی احساس ایک کیفیت ملال ہے جس میں اس کی نا آسودگیوں، خواہشوں اور انتشار کی ایک مہذب صورت سامنے آتی ہے، اس کے ملال کے گرد ایک کبھی نہ ختم ہونے والی خوشی کے انتظار کی جو کیفیت ہے وہ اس کے دکھ کو مزید گہرا کرتی ہے۔ اس بھری پری دنیا میں لوگوں کے منفی رویوں کی بدولت خلیق تبسم اپنے آپ کو تنہا، تنہا پاتی ہے اور تنہائی کا یہ احساس اسے اندر سے کچو کے لگاتا ہے تو وہ بے ساختہ کہہ اٹھتی ہے۔

شہر آنے لگے نظر تنہا
دشت آباد اور گھر تنہا

یوں کھڑے ہیں ہم ایک صحرا میں
دور جیسے کوئی شجر تنہا

خلیق تبسم کا یہ احساس اور اس کی شاعری کا یہ لہجہ کم و بیش اس کی تمام غزلوں میں موجود ہے۔ وہ بار بار تلخ تجربات سے گزرنے کے باوجود احترامِ آدمیت کے جذبہ کے تحت دوسروں کے منفی رویوں کو بھول کر بلکہ ان رویوں کو لمحاتی جھوٹ سمجھ کر دوسروں پر بھروسہ کر لیتی ہے۔

ہزاروں غم ملے ہیں زندگی میں
مگر ہم بھول جاتے ہیں خوشی میں

مرا دل آج ڈوبا جا رہا ہے
وہ جانے کیا کہہ گئے ہیں دل لگی میں

لیکن وہ لمحاتی چھاؤں میں کھڑی اپنی یادوں کے پھولوں کا گلدستہ بناتے بناتے اداس ہو جاتی ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ خلیق تبسم، شاعری اور خاموشی کے ایک ایسے مقام کے درمیان کھڑی ہے جہاں کا ہر دریچہ انتظار کے دشتِ ملال میں کھلتا ہے۔

کسی کا اب سہارا ڈھونڈئیے کیا
کہ دن تو کٹ رہے ہیں بے کسی میں

٭ حمیرا رحمان، ایک چونکا دینے والی آواز ہے۔ ویسے تو یہ آواز بیرونِ ملک

مقیم پاکستانی شاعرات کے مختصر حلقہ سے تعلق رکھتی ہے لیکن یہ صحیح معنوں میں پاکستان اور ہندوستان کی شعری روایت کی قابلِ اعتنا آواز ہے۔ حمیرا رحمان کے یہاں عورت کی بو چارگی کا احساس کچھ اس شدت سے سر اٹھاتا ہے کہ وہ ایک طرف ''دھنک'' اور ''سالِ نو'' جیسی نظمیں لکھتی ہے اور دوسری جانب مسافتوں کی سوچ میں غلطاں و پیچاں دکھائی دیتی ہے ''دھنک'' سراسر احتجاج ہے، معاشرتی سطح پر غیر مساوی سلوک کے خلاف احتجاج۔

حمیرا رحمان کے یہاں ذاتی حکائتیں، معاشرتی حقائق کا روپ دھارے ہوئے ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ ''اندمال'' کھردری حقیقتوں سے لبریز کربِ ذات کی شاعری ہے۔

شاعری کو آپ جذبہ کا اظہار کہیں یا جذبہ و فکر دونوں کا اظہار، اصل بات دیکھنے کی یہ ہوتی ہے کہ شاعر ان دونوں کے بارے میں اپنے شعور و ادراک کا اظہار کیا اور کیسے کرتا ہے۔ نورین طلعت عروبہ نے ایک شاعرہ کی حیثیت سے اپنے اس فرض سے کہیں بھی چشم پوشی نہیں کی۔

رسوائی نہ لے مول تو اس شخص کی خاطر
وہ اپنے قبیلے سے بغاوت نہ کرے گا

کچے گھڑے کا کچا سہارا نہ ڈھونڈیئے
اس نے کسی کو پار اترنے نہیں دیا

ایک صداقت پسند اور جراتِ اظہار کی حامل شاعرہ کی حیثیت سے پروفیسر ڈاکٹر سعدیہ نسیم نے کانٹوں کو بھی گلاب کی لطافت سے آشنا کر دیا ہے۔ کانٹوں میں

گلاب کے عنوان سے ان کا اولین شعری مجموعہ طبع ہو چکا ہے۔ احساسات اور جذبات کی حقیقت پسندانہ ترجمانی کرتے ہوئے سعدیہ نسیم نے اپنی شاعری کو حیات و کائنات کے اسرار اور موز پر اس طرح محیط کیا ہے کہ اس کا ربط عمل و حیات کی حدود سے بڑھ کر وجدان اور لاشعور سے قائم ہو جاتا ہے۔

بعض سخنور اپنی پہلی تخلیق سے پڑھنے والوں کا ایک ایسا حلقہ پیدا کر لیتے ہیں جو شاعری کے سفر سخن میں قدم بہ قدم شریک رہتا ہے اور ان کی لمحے لمحے کو نظر میں رکھتا ہے۔ غزلؔ جعفری جدید تر نسل کی ایک ایسی ہی شاعرہ ''میں غزل ہوں'' (مطبوعہ = بار اول جنوری 1995ء) اس کا اولین شعری مجموعہ ہے۔

نگہت یاسمین 14 نومبر 1960ء کو کراچی میں پیدا ہوئیں۔ اردو میں ایم اے کر چکی ہے۔ ادبی حلقوں میں غزل جعفریؔ کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔ محسن بھوپالی کے لفظوں میں ''غزل ہو یا نظم، قطعہ ہو یا نظمانہ، غزل جعفری نے ہر صنف سخن میں اپنا جداگانہ انداز برقرار رکھا ہے۔ اس نے زندگی کی تلخ اور شیریں حقیقتوں کو دیدہ ظاہر سے زیادہ چشم باطن سے دیکھا اور پرکھا ہے اور اپنے مشاہدے کو قلم بند کیا ہے۔ غزل جعفری کے کلام میں کہیں خاموشی آتش فشاں کی کیفیت ہے تو کہیں بے اختیار لاوے کی صورت اس نے اپنی تخلیق کردہ شعری پناہ گاہ میں اپنی ادھوری خواہشات اور نا آسودہ جذبات میں بھی آسودگی کا پہلو تلاش کر لیا ہے اور اس طرح ایک تخلیقی فنکار کا کردار ادا کیا ہے۔

غزل جعفری کے کلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے تخلیقی ہنر کے لیے اپنے ذہن کو اجنبی فضاؤں اور لایعنی افکار و خیالات میں نہیں بھٹکایا بلکہ اپنے گرد و پیش کے المیوں کو اپنی فنکارانہ بصیرت کا مرکز بنایا ہے۔ یہ کیفیت شاعرہ کے ایک مقطع میں یوں ظاہر ہوئی ہے،

ہم سے تو دل نے جو کہا شعروں میں لکھ دیا غزل
لطف بیان سادگی، دیدہ وروں سے پوچھئیے۔

غزل کا حسن اس کی ایمائیت میں ہوتا ہے، اس لیے زندگی کی بہت سی حقیقتوں کا بیان بھی اشعاروں استعاروں اور علامتوں کے ذریعے کرنا پڑتا ہے۔ غزل جعفری کی شعری تصنیف میں شامل نظموں سے زیادہ غزلوں میں اور غزلوں سے زیادہ نظموں میں معنویت موجوڈ ہے۔ اشارے، کنائے، تشبیہات اور استعارے بھی زیادہ مشکل نہیں ہیں۔ صاف اور سادہ بلکہ شفاف انداز میں بات کہی گئی ہے غزلوں میں چند توجہ طلب شعر ملاحظہ ہوں۔

میں پھر رہی ہوں سائے کے پیچھے یہ سوچ کر
شائد کہ اس طرح سے طبیعت بحال ہو

عمر بھر میں نے تراشے ہیں جو پتھر کے صنم
اُن سے تم پیار کا اظہار تو کر لینے دو۔

جو دے گیا مجھے مجبوریوں کی سوغاتیں
ستم ہے مجھ سے وہی اختیار مانگے ہے

ہاں اپنی شاعری پہ ہمیں ناز ہے غزل
کہنے کو اپنے خواب کئی چور ہوگئے

نقاش کاظمی کے مطابق۔ ''غزل جعفری کے کلام میں طرح طرح کے موضوعات ہیں لیکن ہر غزل نسائیت کی خوشبو سے رچی بسی ہے، جن میں رجائیت بھی ہے اور غنائیت بھی ہے۔ شبنم کا نرم خورویہ بھی ہے اور لہو کی تندو تیز رنگینی بھی۔

کندن سا جسم جھوٹی انا پر لٹا دیا
کانوں میں گونجتی رہیں شہنائیاں بہت

پھر اس کے بعد کوئی بھی اچھا نہیں لگا
دیکھا تھا ایک بار غضب کے سنگھار میں

بہت پیاسے تھے ہم بھی مدتوں سے
کچھ اس سے بھی شرارت ہو گئی تھی

میں ایک بار لٹی تھی تمہارے کہنے پر
وہ حادثہ تھا اسے حادثہ ہی رہنے دو

غزلوں کی طرح نظموں میں بھی غزل جعفری نے اپنے تندو تیز نشتر کو پھولوں کی پنکھڑیوں میں سجا بنا کر اپنا اظہار مدعا کیا ہے' ان نظموں میں بعض کے موضوعات بظاہر اچھوتے اور اجنبی ہیں لیکن وہ زندگی اور اس کے حقائق سے قریب تر ہیں۔ زیر نظر **موضوعات** اور عنوانات قابل توجہ ہیں ''پرچم''۔ ''خوشبو''۔ ''تقسیم''۔ ''شناخت'' اور ''**لہو کا خراج**''۔ ہر حساس شہری کی ترجمان بن گئی ہے لیکن ''دوپٹہ'' ''گواہی''۔ گراونڈ **فلور**'' اور خاص طور سے ''درجن'' نے ان تلخ حقیقتوں کو زبان دی ہے۔

''کانٹوں میں جگنو''۔ میمونہ روحی کی نثری نظموں کا مجموعہ ہے جو حال ہی میں

منصۂ شہود پر آیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ مجموعہ قابلِ توجہ ہے کہ اس میں ایک ایسی صنف سخن پر طبع آزمائی کی گئی ہے جو ادبی حلقوں میں متنازعہ ہے۔

افسر ساجد کے لفظوں میں۔ ''نثری نظم کو روایت پسند قاری یا ناقد صنف سخن تسلیم ہی نہیں کرتا' وہ نثر میں شعریت تو مانتا ہے لیکن نثری شاعری اس کے لیے قابل قبول نہیں۔

تاہم ادب کے ترقی پسند ناقدین اور قاری نثری نظم سے اغماض نہیں برتتے ان کے خیال میں (اور یہ ایک لبرل نقطہ نظر ہے) شاعری نثر میں بھی ہو سکتی ہے۔ وزن شاعری کی ایک شرط ضرور ہے۔

ایک ایسے ہی ناقد کے خیال میں اردو میں صنف غزل سے والہانہ لگاؤ ہی کسی ایسی دیگر صنف سخن کو برداشت کرنے کی اجازت نہیں دیتا جس میں غزل کی لفظیات۔ استعارات کے علاوہ اس کے دیگر لوازمات سے مکمل طور پر پہلو تہی کی گئی ہو۔

امر واقعہ یہ ہے کہ جذبہ۔ استعارہ۔ برجستگی، اظہار شعر گوئی کے اجزائے ترکیبی ہیں اس پر مستزاد آہنگ یہ عناصر اربعہ نثری نظم کا تخلیقی جواز ہیں۔

مصنفہ کے بقول۔ ''کانٹوں میں جگنو'' ایک تنہا ذات کا نامساعد حالات وواقعات میں زندگی بسر کرنے کی روداد کا سفرنامہ تو ہے مگر یہ امر بھی مسلمہ ہے کہ خارج کو داخل میں سمو کر ہی جذبات توانا ہوتے ہیں۔''

ڈاکٹر ریاض مجید کے لفظوں میں۔ ''کانٹوں نے جگنوؤں کو زخمی کر دیا ہے مگر پھر بھی ان بے یقین سیاہیوں میں حوصلے کی روشنی کا استعارہ بنے ہوئے ہیں۔''

اس پس منظر میں قاری کو اس کتاب میں ''سرگوشیوں'' اور ''خود کلامیوں'' پر مشتمل نثری منظومات میں شاعر کی ذات کے علاوہ زندگی کا پرتو بھی نظر آئے گا یہی شاعری کا منتہائے مقصود بھی ہے۔

میمونہ روحی کی شاعری کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

بے آئینہ ہواؤں میں اس کے اعتبار کا کوئی عکس نہیں تھا
اور نہ ہی پانی کی سرگوشیوں میں اس کے نام کا کوئی حرف
اب جب کہ مجھے تمہاری ضرورت ہے
تم مجھ سے کوسوں دور' منصب کی زنجیروں میں قید
اور میں یہاں۔۔۔!

یہ ٹکڑا اپنی جہت۔ اسلوب۔ زبان و بیان۔ لفظیات۔ حساسیت اور عصریت کے اعتبار سے نثری نظم کے ارتقاء اور خود انحصاری کی دلیل ہے۔

گزشتہ چند برسوں میں ادبی منظر پر اردو کی جو شاعرات نمایاں ہوئی ہیں ان میں یاسمین گل کا نام بھی شامل ہے۔ غزل کے ساتھ ساتھ جب وہ نظم کہتی ہیں تو اس میں بھی اس کے فکر و خیال کی اپج اور انفرادیت توجہ کھینچ لیتی ہے۔ ایک جدید شاعر بلکہ جدید شاعرہ کے ہاں اگر یہ خوبیاں بھرپور طور سے موجود ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مطلع ادب پر کچھ کر دکھانے کے لئے طلوع ہوئی ہے۔''

ان خیالات کا اظہار احمد ندیم قاسمی نے یاسمین گل کے شعری مجموعہ ''اعتراف'' کے پیش لفظ میں کیا''اعتراف''میں شامل نظمیں یاسمین گل کی غزلوں کی طرح خوبصورت

ہیں۔ ان کا اپنا ایک رنگ مختلف ذائقہ اور جداگانہ آہنگ ہے۔ "خوشبو کا سفر" "پچھتاوا"۔ "ابھی نہیں"۔ "کبھی جی چاہتا ہے۔" جیسی نظمیں موضوع اور تاثر کے اعتبار سے بے حد قابل قبول ہیں۔

یاسمین گل کی غزلیں بھی عمدہ، پر اثر اور پر لطف ہوتی ہیں چنانچہ اثر آفرینی کی بدولت اپنی مثال آپ ہیں۔

ہوں گی پھر وہ ستارہ سی آنکھیں عیاں
شام جب کچھ ذرا اور سنولائے گی

پاس تھا میرے تو بالکل عام سا لگتا تھا وہ
پر ہوا جیسے ہی وہ مجھ سے جدا، اچھا لگا

یہ میری آنکھ میں اک شخص جو سویا ہوا ہے
اسے سونے دو، ساری رات کا جاگا ہوا ہے

غزالہ نگار اور کزئی کا کلام وقتاً فوقتاً معیاری رسائل اور اخبارات کے ادبی صفحات میں چھپتا رہتا ہے۔ اس کا خوش آئند شعری سفر جاری ہے۔ اس کے ہاں فنی شعور اور صداقت اظہار موجود ہے۔ جذباتی اور داخلی رویوں کو خارجی زندگی کے سیاق و سباق میں شریک کر کے زندگی کا تجزیہ کرنے کا شعور حاصل ہوتا ہے۔ غزالہ نگار اور کزئی نے اسی شعور کی مدد سے حیات کے بدلتے ہوئے منظرنامے کو ایک شاعر کی طرح دیکھا ہے اس کی شاعری میں نسوانی جذبات اور محسوسات کا اظہار پایا جاتا ہے۔ اس کا رنگ

سخن ملاحظہ ہو۔

اب دھنک کے رنگ کو لڑکیاں ترستی ہیں
بادلوں نے آنچل بھی کس طرح بھگوئے تھے
اب وہ سارے موسم بھی گمشدہ خزانہ ہیں
پھول جب ہواؤں نے زُلف میں پروئے ہیں

ماہ طلعت زاہدی، نظم اور غزل دونوں میں طبع آزمائی کرتی ہیں۔ وہ شاعری میں جدت کی قائل ہیں۔ چنانچہ ان کے تخلیقی اظہار میں نئے نئے افکار و خیالات اور متنوع مضامین کی صورت میں موجود ہیں۔ زندگی کا شعور و آگہی عصری بصارت کے ساتھ ان کی نظموں میں ملتا ہے۔

ماہ طلعت زاہدی نوجوان شاعرات میں اپنے لب ولہجہ کی بدولت انفرادیت رکھتی ہیں۔

یہی وہ وقت ہے جب نور کا عرفان لازم ہے
اندھیرا ہی اندھیرا ہے میرے چاروں طرف،
ایک سیل تند ہے جس میں
بہا جاتا ہے ماضی اور آنے والے روز و شب، کہ جن کے ہاتھ میں
کیا جانے کتنے حادثے ہونگے
اندھیرے میں مرے کچھ خواب بھی ہیں جن کے آگے
مدتوں سے سر جھکائے میں کھڑی ہوں
ریاضت کی سزا میں جل رہی ہوں

پاکستانی شاعرات نے اپنی رومانی آرزو مندی ، ذہنی و نفسیاتی تطابق ، سپردگی اور یگانی جیسے موضوعات پر بھی بڑے خوبصورت انداز میں سخن فرسائی کی ہے۔ ان شاعرات کی فہرست میں ماہ طلعت زاہدی کا نام بھی شامل ہے۔

دل اجڑے موسم کی شاخوں پر
نئی نویلی کرن کا
ماتھا چوم کر پھر سے کھل اٹھا ہے
میں بھی کل کو بھول کر خوش ہوں
آج تو میرے نام ہوا ہے

(آج کا گیت)

کراچی کے دگرگوں حالات کے تناظر میں بھی ماہ طلعت زاہدی نے کراچی کے المیہ کو موضوع سخن بنایا ہے۔ ''لہو بہہ رہا ہے'' اور ''کراچی کے لیے دعا'' جیسی نظموں میں اپنے جذبات اور احساسات کا اظہار بہت ہی دردمندانہ انداز میں کیا ہے۔

کوئی فن بے عصر نہیں ہوتا، تخلیقی ذہن اور عصر میں بڑا گہرا رشتہ ہے۔ یہ رشتہ خارجی سطح پر ہوتا ہے کہیں اس کا مزاج داخلی ہوتا ہے۔ غزل میں عموماً اس کا اظہار داخلی ہوتا ہے۔ بشریٰ شمس کی شاعری ایسے ہی احساسات کا مرقع ہے۔

بشریٰ شمس بنیادی طور پر غزل کی شاعرہ ہے اور اسی صنف سخن میں اس کے جوہر کھلتے ہیں۔ اس کی غزلوں کا مجموعہ ''تنہا سورج'' 1991ء میں طبع ہو چکا ہے۔ لیکن پہلی شعری تصنیف ''ضیائے شمس'' کے نام سے 1973ء میں اور اس کے بعد

''سحر غازہ'' کے عنوان سے بھی مجموعہ کلام طبع ہوا ہے۔

سعیدہ ہاشمی' بے باک۔ سچی اور حسین ترین تخلیق کار ہے وہ اپنی تخلیقی توانائی کے اعتبار سے ہمعصروں میں ممتاز اور قابل لحاظ ہے۔وہ سادہ سادہ لفظوں میں شعر کہتی ہے لیکن شاعری میں اس کا والہانہ پن اور شعری وار فتگی اس کا وصف ہے اور اس کی شاعری اس کے اعتماد فن اور اس کی بھر پور تخلیقی صلاحیت پر گوارہ ہے۔

سعیدہ ہاشمی کے اشعار پڑھ کر ماننا پڑتا کہ فطرت نے اسے شاعرہ پیدا کیا ہے اور اس میں شعر گوئی کی فطری صلاحیت موجود ہے لیکن اس کی شاعری میں وہی سادگی اور خوبصورتی ہے جو اس کی اپنی ذات میں ہے۔

شعراء کی نئی نسل عصری مسائل سے آشنائی نہیں دو چار بھی ہے۔اس نسل کے ہاں زندگی کے مسائل اپنی داخلی واردات کے حوالے سے جو گہرے کرب کی کیفیت پائی جاتی ہے۔اس کا نئی نسل کی شاعری میں اور بطور خاص غزلوں میں بھر پور اظہار پایا جاتا ہے۔

سعیدہ ہاشمی کی کیفیت۔اس کے محسوسات۔اس کے جذبات کا اظہار بھی کچھ اسی نوعیت کا ہے۔

؎ اب بھگت لی ہیں سزائیں تو یہ حسرت جاگی
کاش مجھ کو بھی مرے جرم بتائے جاتے

؎ شہر بے مروت میں رسم بے وفائی ہے
یہ سبق نہ پڑھ لینا تم ادھر کے لوگوں سے

وہ تو کچھ حوصلہ اپنا تھا چٹانوں جیسا
دکھ تو ایسے تھے کہ شاید نہ بھلائے جاتے

خواہشوں کی پگڈنڈی دور دیس جاتی ہے
کیوں الگ نہ ہو جاتا اپنے گھر کے لوگوں سے

ایسے خوبصورت اشعار کہنے والی شاعرہ کے اشعار دیکھ کر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سعیدہ ہاشمی نہ صرف فنی اور تخلیقی سطح پر بلکہ حیاتی سطح پر بھی غزل گوئی میں بڑے بھروسہ کے ساتھ آگے قدم بڑھا رہی ہے۔

شگفتہ الطاف کا تعلق شاعرات کی تازہ دم کھیپ سے ہے۔ لیکن اس نے اپنی ریاضت مطالعے۔ کوشش اور بھرپور جدو جہد سے اپنی پہچان کرائی ہے۔ شگفتہ الطاف رسائل اور اخبارات میں کم کم چھپتی ہے۔ اس کی شاعری سیدھی سادی اور عام فہم ہوتی ہے وہ اینچ پیچ اور ابہام کی قائل نہیں ہے۔

جذبات اور احساسات کے اظہار کا نام شاعری ہے چنانچہ شگفتہ الطاف جو کچھ دیکھتی اور محسوس کرتی ہے اس سے اس کے جذبات میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے اور پھر وہ اپنے جذبات کا اظہار خوبصورت لفظوں میں کرتی ہے اور یہی محسوساتی شاعری ہے۔

شگفتہ الطاف کی تخلیقات میں اس کی اپنی آواز اور اپنا رنگ ہے۔ اس کی غزل کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ اس میں جذبات کی ہم آہنگی اور تسلسل پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی یہ خوبی بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ اس کی غزل میں نسوانی جذبے بولتے اور سیدھے سادے جذبات محبت کی انگڑائیاں لیتے محسوس ہوتے ہیں۔

ے رنجشوں کا فاصلہ مٹتا ہوا دیکھوں گی میں
وہ نہ دیکھے گا تو اس کو بار ہا دیکھوں گی میں

ے وہ ہے میری ذات کا انتھک سفر ایسا جسے
اپنی ساری عمر پر پھیلا ہوا دیکھوں گی میں

شگفتہ الطاف نے پرانی لفظیات جیسے تتلیاں۔ بچپنا۔ چاند۔ آئینہ کے استعمال کے لیے تازہ لہجہ اپنا کر بات نہایت آساں اور عام فہم پیرائے میں بیان کر دی ہے۔

ے آج اس کے ساتھ جاؤں گی پکڑنے تتلیاں
آج برسوں بعد اپنا بچپنا دیکھوں گی میں

ے کہہ رہا تھا وہ کہ میں بھی چاند جیسی ہو گئی
آج تو گھر جا کے پہلے آئینہ دیکھوں گی میں

پاکستان کی تازہ دم شاعرات میں طاہرہ عروج کا نام اور کلام نمایاں اہمیت رکھتا ہے'اس نوخیز شاعرہ کا پہلا شعری مجموعہ "کسے راس آیا گلابوں میں رہنا" کے عنوان سے چھپ کر منظر عام پر آچکا ہے۔

اس مجموعہ میں نظموں کی نسبت غزلیں زیادہ تعداد میں شامل ہیں۔ لیکن کتاب کے عنوان پر نظر پڑتی ہے تو فوراً ذہن میں رومانوی فضا کا تاثر ابھر کر سامنے آتا ہے۔

طاہرہ عروج نے عام اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو شاعرانہ قرینے اور نزاکت سے مضمون آفرینی سے ہمکنار کیا ہے لیکن بو جھل بو جھل تراکیب سے گریز کیا ہے جس سے اس

کی سخنوری پر خوشگوار اثر مرتب ہوا ہے۔ اس کی سادگی میں بانکپن پایا جاتا ہے۔ اس بانکپن سے اس کے ہاں سہل ممتنع کی بے حد پیاری پیاری مثالیں ملتی ہیں۔

بعد ترے میں بھری دنیا میں ایسے رہ گئی
ڈوبتے سورج کا منظر جس طرح تصویر میں

ہو کبھی میری ضرورت تو کسی بھی باغ میں
پھول، کلیوں، تتلیوں اور جگنوؤں سے پوچھنا

وحید ملک کا تعلق شاعرات کی تازہ کھیپ سے ہے وہ کم کہتی ہے لیکن اچھا کہتی ہے۔ اس کے ہاں حسن و شائستگی اور نرم جذبات ملتے ہیں۔ وحیدہ ملک کے مندرجہ ذیل اشعار میں اس کا رنگ سخن جھلک رہا ہے۔

سب کی آنکھوں کے آئینوں پہ نہ جا
حسن تیرا میری ہی نظر تک رہے

محبتوں میں ذرا فاصلے بھی رہنے دو
مجھے خلوص کی گرمی سے کیوں جلاتے ہو

صائمہ منصور کا پہلا شعری مجموعہ ''خیال کا موسم'' کے عنوان سے طبع ہو چکا ہے مصنفہ کے لفظوں میں۔ ''کبھی کبھی انسان کے اندر کی اداسی الفاظ کی صورت میں کاغذ پر بکھر جاتی ہے''۔ صائمہ منصور کی شعری تصنیف ''خیال کا موسم'' نسائی شاعری میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔ اس میں غزلوں کی نسبت نظموں کی تعداد

زیادہ ہے لیکن غزلیں ایک ''رنگ نو'' کے اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں تاہم شاعرہ نے نظموں میں بھی عورت پن کو اپنی شاعری میں سمونے کی کوشش کی ہے اور خواتین کی ان مشکلات اور دکھوں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے جس کا شکار اس معاشرے کے فرسودہ روایات کی وجہ سے ایک عورت کو ہونا پڑتا ہے، گھٹن زدہ زندگی روز مرتے ہوئے زندہ رہنے کی کوشش وغیرہ وغیرہ۔

صائمہ منصور کے کلام میں سادہ گوئی، خلوص مندی اور جمالیاتی لطافت بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کے ہاں شاعری جذبات و احساسات کے برجستہ اظہار کا ایک قدرتی وسیلہ ہے۔ انہیں اپنے ہونے کا مکمل شعور ہے۔ فلسفہ زیست کے بارے میں ان کا رویہ احتسابی ہے۔

خوبرو گلابوں میں زندگی کے خوابوں میں خوشبوئیں ہوتی ہیں
جز ترے تصور کے دور تک فضاؤں میں رنگ کون بھرتا ہے

صائمہ منصور کے ہاں غیر ضروری لفاظی کی بجائے سادگی اور اختصار نمایاں ہے۔

زندگی دیکھنا چاہا تجھے امید کے ساتھ
تو مگر یاس کا شاہکار نظر آتی ہے

جدید نسل کی اس شاعرہ کی شاعری کا مجموعی تاثر ایک انجان سا خوف، ایک انجمی کسک، ایک ناتمام خواہش ہے۔ شاعر کے احساس و شعور کے درمیان ایک مسلسل آویزش اس کے جہان شعر پر غالب نظر آتی ہے۔ اس منظرنامے کے مرکزی

کردار ''میں'' اور ''تم'' ہیں جن کے مابین تشخیص کبھی کبھی ''تو من شدی'' کے مصداق مشکل ہو جاتی ہے۔

امجد اسلام امجد کے لفظوں میں، ''صائمہ منصور (شعری مجموعہ) ''خیال کا موسم'' لے کر ہمارے ادبی منظر پر طلوع ہو رہی ہیں۔ اس موسم کے جو رنگ انہوں نے چنے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دھنک بہت دور تک جائے گی اور بہت دیر تک رہے گی''۔

بلا مبالغہ تخلیقی اعتبار سے سب نہیں تو کچھ شاعرات اردو شعر و ادب میں اپنا ایک مقام رکھتی ہیں اور نئی غزل میں کچھ شاعرات نے اپنی خوبصورت اور دلپذیر تشبیہوں اور استعاروں اور علامتوں سے اپنا تشخص قائم کیا ہے۔ وہ اپنے ممیز و ممتاز ہونے کی گواہی دیتا ہے۔ چنانچہ میں یہاں کچھ ان شاعرات کے نام اور نمونہ کے طور پر ان کے شعروں کا مختصر انتخاب پیش کر رہا ہوں۔ جس سے کسی حد تک پاکستان میں خواتین شاعرات کی تخلیق ہونے والی شاعری کا اندازہ ہو جائے گا۔ جس سے کسی حد تک پاکستان میں خواتین شاعرات کی تخلیق ہونے والی شاعری کا اندازہ ہو جائے گا۔ جس میں نسوانیت اور نسائی جذبات بھی پائے جاتے ہیں۔

جدائی کی کڑی گھڑیاں یہ ظالم ہجر کے موسم
خوشی کے چند لمحوں کی بھی قیمت مانگ لیتے ہیں

نورین طلعت عروبہ

وہ ایک خواب تھا اچھا لگا تھا آنکھوں کو
کہ آنکھ کھل بھی گئی پھر بھی میں تو سوتی رہی

شمیم اکرام الحق

پھر کوئی عہد مجھ سے لے لینا
پہلے چاہو مزید شدت سے
فرحت نواز

مجھ کو چھو، میرے شب و روز کو روشن کر دے
میرے آنگن میں بھی پل بھر کو ٹھہراب کے برس
ارشاد ارشی

ہنوز غنچہ دل بھی کھلا نہ تھا اپنا
عذاب جاں ہوئی تنقید نکتہ چینوں کی
صباحت صبا

اب تو سمیٹ لے مری ہستی کو وہ ثمنؔ
ہر لمحہ یہ وجود بکھرتا دکھائی دے
ریحانہ ثمن

بھنورے سے پیار کی خواہش بہت ہے
وجود اپنا ڈبونا چاہتی ہوں
سیدہ آمنہ بہار رونا

دل وہ نگاہ کی تاریکیاں لگیں چھٹنے
وہ آئے دل کے دریچوں سے چاندنی کی طرح
طاہرہ یاسمین

رگ رگ میں میری درد وہ اپنا سمو گیا
آیا نہیں پلٹ کے پھر اک بار جو گیا

فرزانہ واسطی

کالی تیز ہوا میں اُڑ گئے سارے عہد پرانے
اب کیا رنگ دکھائیں گے یہ آنے والے دن

اسمار راجہ

جدید تر تجرباتی دور میں ہمیں شاعرات کی تعداد کافی نظر آ رہی ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد کے مطابق، ''اب ہماری شاعرات مردوں کے شانہ بشانہ معاشرتی ترقی اور سفر میں رواں دواں ہیں، لیکن اپنی علیحدہ شخصیت کے احساس اور اظہار کے ساتھ۔
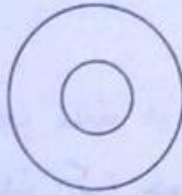
## (حصہ دوم)

# اُردُو ناول نگاری میں خواتین کا حصہ

علم و ادب کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ ناول کا نام فرانسیسی زبان کا لفظ ''نوویلا'' سے مشتق ہے جس کے معنی کہانی کے ہیں۔ سادہ لفظوں میں ناول ایک ایسی طویل کہانی ہے جو کسی زندگی کی داستان کو اس کے سارے تعلقات اور تنوعات کے ساتھ پیش کرتی ہے۔

ناول براہ راست انگریزی ادب سے ہی لیا گیا ہے۔ انگریزی ناول کے انداز میں ہی اس کو لکھا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ادب پر چھا گیا، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہمارے یہاں قصے، کہانیوں کا وجود نہ تھا یا داستان سرائی رائج نہ تھی۔ یہ کہنا واقعات سے انکار ہوگا البتہ ان قصوں کہانیوں اور ناولوں میں بہت بڑا فرق ہے، قصہ گوئی انسانیت کی ابتداء سے ملتی ہے جبکہ ناول مہذب انسانوں کی ایجاد ہے۔ ناول میں زندگی کے مختلف تجربات اور مناظر ہوتے ہیں، واقعات کا ایک سلسلہ ہوتا ہے، پلاٹ، کردار، مکالمہ، منظر نگاری اور فلسفہ زندگی کی ایک جھلک ہوتی ہے۔ ہر ناول ایک ذہنی سفر کا آغاز ہوتا ہے۔ ''ناول'' سے ہمارے جو بھی روابط رہے ہوں یہ طے ہے کہ ہم نے اسے تکمیلی صورت میں مغرب سے مستعار لیا تاہم ہمارے

ہاں کہانی سے ناول تک کا سفر اپنا ایک ارتقاء بھی رکھتا ہے کہ اس سفر میں سر شار کے ہاں کرداروں کی کثرت، منتشر واقعات کے باوجود پلاٹ کی صورت اور ڈپٹی نذیر احمد کے ہاں معاشرتی جھلکیاں درجہ بدرجہ ابھریں۔

انگریزی میں رچرڈسن اور فلیڈنگ .. ناول کے موجد کہے جا سکتے ہیں۔ ہمارے ہاں ڈپٹی نذیر احمد کی کہانیوں کو ناول کا اولین نمونہ کہا جا سکتا ہے، اگرچہ یہ مکمل نمونہ نہیں پھر بھی ہم آسانی سے ڈپٹی نذیر احمد سے پہلے کے قصے ان کے بعد کے قصوں سے الگ کر سکتے ہیں۔ بعد کے قصوں میں ناول کی چند خصوصیات ملتی ہیں۔ یہ نذیر احمد کا تصرف ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد اُردو کے پہلے باقاعدہ ناول نگار تھے۔ ''مراۃ العروس'' ان کا پہلا ناول تھا جو 1869ء میں چھپا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے متعدد ناول لکھے جن میں ''توبۃ النصوح'' اور ''فسانہ مبتلا'' فنی حیثیت سے دوسرے ناولوں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ نذیر احمد نے قدیم داستانوں اور افسانوں کی عام اور مشترک خصوصیت یعنی فوق الفطرت عناصر کی کارفرمائی سے اپنے ناولوں کو بالکل محفوظ رکھا اور یوں اردو کی قصہ نگاری پہلی بار واقعیت، فطرت، اور حقیقت نگاری سے ہم کنار ہوئی۔ اصل یہ ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے ناولوں میں جس حقیقت نگاری کو اپنایا وہ ان سے پہلے تو نایاب تھی ہی لیکن ان کے بعد بھی مدتوں نایاب رہی۔

ڈپٹی نذیر احمد کے یہ ناول طبع ہو چکے تھے کہ رتن ناتھ سر شار کا ''فسانہ آزاد'' 1879ء میں پہلے ''اودھ پنچ'' میں قسط وار اور اس کے بعد کتابی صورت میں طبع ہوا۔ غیر معمولی حجم بے اندازہ پھیلاؤ اور تکنیکی ارتقاء کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ''فسانہ آزاد'' ایک طویل قصہ ہے، اتنا طویل کہ مصنف اسے سنبھال نہیں سکا اور وہ غیر مربوط، غیر مسلسل اور ڈھیلا ڈھالا ہو کر رہ گیا ہے۔

لہٰذا یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ سر شار نے ناول نگاری کے اسلوب کو

آگے نہیں بڑھایابلکہ ایک طور سے پیچھے ہٹایا ہے، کیونکہ فسانہ آزاد کی تکنیک نذیر احمد کے ناولوں کی تکنیک سے آگے کی چیز نہیں ہے اور ''فسانہ آزاد'' جدید ناول کی بہ نسبت قدیم داستانوں سے زیادہ قریب ہے اسی بناء پر یہ خیال کیا گیا کے سرشار کی تخلیق دو طرزوں کے درمیان کی ایک کڑی ہے۔ اس میں اگر ایک جانب جدید ناول کے کچھ اوصاف پائے جاتے ہیں تو دوسری طرف ''طلسم ہوشربا'' اور ''بوستان خیال'' جیسی داستانوں کے عناصر بھی موجود ہیں۔

چنانچہ یہ کہنا کوئی غیر مناسب نہیں ہوگا کہ اردو ادب کی تاریخ میں ناول کی روایت بہت قدیم نہیں اس کے آغاز کا رشتہ ڈپٹی نذیر احمد اور بعد میں رتن ناتھ سرشار کے ناولوں سے جوڑا جاسکتا ہے یہ ناول اگرچہ اس کے جدید تقاضوں کو پورا نہیں کرتے لیکن بہر حال تقدم ان ناولوں کو حاصل ہے تاہم اردو ناول کے آغاز پر بحث کے لیے ہم ڈپٹی نذیر احمد کے مراۃالعروس (مطبوعہ 1869ء) کا انتخاب کریں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ 1999ء تک اس کی عمر تقریباً ایک سو تیس سال ہوئی اور کسی بھی صنف ادب کی زندگی میں تیرہ عشرے اس امر کی غمازی کرتے ہیں وہ بلوغت سے ضرور ہم کنار ہوئی ہوگی ہر ملک کے ناول کی مانند اردو ناول نے بھی اپنا آغاز خام انداز سے شروع کیا۔

بقول ڈاکٹر عبدالسلام اردو ناول ایسے شخص کے ہاتھوں وجود میں آیا جو فنی تقاضوں سے ناواقف اس اعتبار سے ڈپٹی نذیر احمد کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے تمثیلی تکنیک کے ذریعے ایک ایسی صنف ادب کی بنیاد رکھی جو فی زمانہ انتہائی اہمیت کی حامل ہے آج جب ہم عالمی ادب پر نظر ڈالتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ناول میں حیات و ممات کے فلسفیانہ مسائل اور عصری صداقتوں کا اظہار ہو رہا ہے نیز یہ کہ بہت سے علوم کا اس میں اجتماع ہو چکا ہے جس کی بناء پر ناول کا ہیئتی اسلوبیاتی تکنیکی اور موضوعاتی کینوس خاصا وسیع ہو چکا ہے اس اعتبار سے جب ہم ڈپٹی نذیر احمد کے دور

سے لے کر آج کے عہد تک نظر دوڑاتے ہیں تو یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد کا لگایا ہوا پودا ایک تناور درخت میں تبدیل ہو چکا ہے اس کے بعد ہندوستان بھر میں جس ناول کو شہرت ملی وہ مرزا محمد ہادی رسوا کا ناول امراؤ جان ادا ہے لیکن کل کی طرح آج بھی یہ سوال اپنی جگہ پر موجود ہے کہ یہ ناول کب لکھا گیا یہ کہنا مشکل ہے اور یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ناول مرزا رسوا کے دوسرے ناولوں سے پہلے یا بعد میں لکھا گیا تاہم ایک بات صاف ہے کہ فنی اعتبار سے امراؤ جان ادا نہایت مختلف ہے اس میں لکھنو کی تہذیب کی بلندی اور پستی دونوں ہیں اس میں 1857ء کا غدر ہے۔

فنی غیر جانبداری حقیقت نگاری اور نفسیاتی دروں بینی کا مکمل ترین نمونہ امراؤ جان ادا (غالباً 1899ء) میں نظر آتا ہے امراؤ جان ادا میں مرزا رسوا نے لکھنو کی پوری تہذیب اور معاشرت اور محلاتی رنگینیوں کا ذکر بھی کر دیا ہے فیض آباد کے متوسط گھرانے سے اغواء کر کے خانم کے نگار خانے میں دھکیلی گئی امیرن نہایت سرعت کے ساتھ قصے کے کینوس پر امراؤ جان ادا بن کر محیط ہو جاتی ہے چنانچہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ رسوا نے امراؤ جان ادا لکھ کر اردو ناول کو ایک قدم اور آگے بڑھانے میں اپنا موثر کردار انجام دیا وہ آج بھی اتنا مقبول ہے جتنا وہ اپنے عہد میں تھا۔

بقول ناقدین فن (پروفیسر عبدالسلام۔ ڈاکٹر احسن فاروقی۔ پروفیسر خورشید الاسلام) اپنے نکھرے ہوئے اسلوب اور ابتدائی ہیئت میں جو کہ روایت سے بھی ہم آہنگ تھی انہوں نے حقیقت پسندی کو اس سے ہم آمیز کیا۔

مجموعی طور پر امراؤ جان ادا ایسا ناول ہے جو اردو ادب میں پوری اہمیت کا حامل ہے۔ لیکن طبقہ نسواں میں ڈپٹی نذیر احمد کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی اور نذیر احمد کی آواز کو خلق کی آواز بنانے کے لیے خواتین بھی کمر بستہ ہو گئیں یہ امر واقعہ ہے کہ عورتوں نے مردوں کے بہت بعد میں اس میدان میں قدم رکھا اور ان کے لکھے ہوئے ایسے قصے جنہیں ناول کی ابتدائی شکل کہا جا سکتا ہے بیسویں صدی کے آغاز

سے پہلے نہیں ملتے۔

نذیر احمد کے ناول اگر تحریک نسواں اور تعلیم نسواں کا نقطہ آغاز ہیں تو رشیدۃ النساء کا ناول اصلاح النساء (سن تصنیف 1881ء) اس تحریک کا پہلا ثمر اور نثر میں نسوانی ادب کا نقطہ آغاز ہے۔ رشیدۃ النساء اردو زبان کی پہلی خاتون ناول نگار تھیں جنھوں نے نذیر احمد سے انحراف اور حقیقت پسندی کے باوجود نذیر احمد کے اسلوب اور آداب فن کو اختیار کیا ہے۔ اور یہ مماثلتیں صرف موضوعات قصہ کی ترتیب اور واقعات تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ کردار نگاری میں بھی اس کے اثرات موجود ہیں۔

اشرف النساء اور بسم اللہ بی وزیرن اور لاڈلی کے کردار بالترتیب اصغری۔اکبری۔ جمن اور نعیمہ کے مشابہ ہیں تو مردانہ کرداروں میں محمد اعظم محمد معظم میر محمد واعظ پر محمد عاقل محمد کامل اور نصوح کا عکس نظر آتا ہے البتہ اصلاح النساء میں بی وزیرن کا کردار مراۃ العروس کی جمن کٹنی کے مقابلے میں زیادہ فعال اور جاندار ہے اور آخر تک موجود رہتا ہے جبکہ جمن کٹنی اکبری کو ٹھگنے کے بعد غائب ہو جاتی ہے بی وزیرن ناول کا ایک منفی کردار ہے جو بھولی بھالی پردہ نشین خواتین کو ٹھگنے میں مہارت رکھتا ہے لیکن آخر میں سردار دلہن کی شرافت اور حسن سلوک کی بدولت اس میں تبدیلی بھی آتی ہے لیکن قلب ماہیت کی تکمیل نصوح کی طرح خواب کے بعد ہی ہوتی ہے اصلاح النساء میں بھی اصلاح کا یہی رجحان غالب ہے۔

یہ ناول انیسویں صدی عیسوی میں طبقہ نسواں کی زبان و بیان روزمرہ محاورے ضرب الامثال کہاوت رمز وکنایہ اور مخصوص لب و لہجہ کے مطالعے کے لیے بھی وافر مواد فراہم کرتا ہے اور اس کے ذریعے خواتین میں اصلاح پسندانہ رجحان کے آغاز کی بھی نشاندہی کی جا سکتی ہے اس لیے فکروفن کی کمزوری کے باوجود خواتین کے ادب میں اسے بنیادی حیثیت حاصل رہے گی۔

اصلاح النساء دو حصوں پر مشتمل ہے پہلا حصہ ۲۷۲ صفحات اور دوسرا حصہ ۷۳ صفحات پر پھیلا ہوا ہے اس ناول کا پہلا ایڈیشن تصنیف کے دس سال بعد ۱۸۹۱ء میں محمد سلیمان کی کوششوں کی بدولت مطبع قیصری پٹنہ سے شائع ہوا۔

خواتین کی ناول نگاری کے سلسلے کو آگے بڑھانے تعلیم نسواں کے فروغ اور طبقہ نسواں کے شعور کو بیدار کرنے میں کچھ دیگر خواتین نے بھی حصہ لیا ہے جن میں محمدی بیگم مدیرہ رسالہ تہذیب نسواں بھی ہیں جنھوں نے تین ناول صفیہ بیگم (مطبوعہ 1913ء) میں طبع ہوا۔

مسز عباس طیب جی نے بھی تین جلدوں میں ایک دلچسپ ناول باعنوان شوکت آرا لکھا تھا جو 1917ء میں طبع ہوا جبکہ صغریٰ ہمایوں مرزا کا ناول سرگزشت حاجرہ 1926ء میں طبع ہوا۔

عباس بیگم والدہ حجاب امتیاز علی کا ناول زہرا بیگم ۱۹۳۵ء میں طبع ہوا ان کے علاوہ آنسہ حسن بیگم کے ناول روشنک بیگم (1940ء) بیگم شاہنواز کا ناول حسن آراء ظفر جہاں بیگم کا اختری بیگم طیبہ بیگم کا انوری بیگم محترمہ سدید کا بیاض سحر اور ضیاء بانو کے تین ناول فغان اشرف فریب زندگی اور انجام زندگی کے عنوانات سے طبع ہو چکے ہیں۔

ان ناولوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ ناول راشد الخیری کے انداز میں لکھے گئے ہیں اور ان میں عورت کی دکھ بھری زندگی کو نہایت موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے ان ناولوں میں اگرچہ فنی کمزوری اور جھول موجود ہے تاہم خواتین کی زبان و بیان کے مطالعہ کے لیے اہم مواد ملتا ہے اور یہ ناول ابتدائی دور میں خواتین کے ذہنی و جذباتی رویوں کی نشاندہی بھی کرتے ہیں جن سے تحریک نسواں کے ارتقائی مدارج کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

خواتین اہل قلم کے حوالے سے میں موضوع کو آگے بڑھاتا ہوں کہ جب

عورتیں اس میدان میں آگئیں تو بھی ایک عرصے تک اپنا قلم اپنی ہم جنس خواتین کی اخلاقی تربیت کے لیے استعمال کیا اور ساتھ ہی یہ کوشش بھی کی کہ عام خواتین کے سلسلے میں ہمدردی کا رویہ اپنائیں اور ان کے نسوانی حقوق کی حفاظت کریں۔

اگر خواتین کے ناولوں پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالی جائے تو یہ اندازہ کرنے میں دشواری پیش نہیں آتی کہ ان ناولوں نے ہمارے افسانوی ادب اور ہماری معاشرتی زندگی کو بعض ایسی جہتیں دیں جنہیں صرف خواتین کے ناولوں کا امتیاز کہا جاسکتا ہے۔ فنی نقطہ نظر سے عورتوں کے لکھے ہوئے ان قصوں اور ناولوں کا قابل رشک امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے فن کی سادگی کو کہانی کا سب سے اہم معیار بنایا ہے جو یقیناً مقصد کا خلوص لیے ہوئے ہے اس طرح ناول نویسی کی تاریخ میں اس روایت کو غیر فانی مقام دیا ہے کہ کہانی کار اپنے مقصد کے معاملے میں مخلص ہو اور اس مقصد کو کہانی کے انداز میں بیان کرنے کی اہمیت کا احساس رکھتا ہو تو اس کی کہانی ہر سننے اور پڑھنے والے کے لیے دلکش اور دلنشین ہو جاتی ہے۔

عورت کو ام القصص کہا گیا ہے وہ خود قصہ ہے اور قصہ کا موضوع بھی قدرت نے اسے قصہ گوئی اور افسانہ طرازی کا ملکہ بھی عطا کیا ہے قصہ میں اسے تکنیک کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

جہاں تک کہانی کہنے اور اسے کہانی کی طرح کہنے کا تعلق ہے عورتوں کے قصے اور ناول اپنی مثال آپ ہیں اور یہ مثال قدیم اور جدید کے فرق کے بغیر عورتوں کے تقریباً سب ناولوں میں موجود ہے۔

بیسویں صدی کے تقریباً پچاس پچپن سال کے یہ قصے ناول نما قصے نیم ناول یا بعض صورتوں میں ناول ایک ایسے عہد کی زندگی کے خاکے ہیں جس میں ہندوستان (تقسیم سے قبل) کی معاشرتی اور اخلاقی زندگی پر مغرب آہستہ آہستہ اپنا اثر کر رہا ہے اور ہندوستانی تہذیب اور اس کی اقدار اپنے پرستاروں کی کوششوں کے باوجود اب

تک مغربیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے خطرے میں پھنسی ہوئی ہیں قدروں کے اس تصادم کا اثر ہندوستان کی معاشرتی زندگی میں قدم قدم پر نمایاں ہے لیکن ایک گروہ ایسے لوگوں کا ہے جنہیں اس کا احساس ہے کہ زمانہ بدل گیا ہے اور زمانے کی تبدیلی نے ہماری معاشرتی زندگی کے مطالبات میں بھی تبدیلی پیدا کی ہے اور انسان کو اپنی فطرت کے تقاضوں کی ہمنوائی کرتے ہوئے نئے زمانے کا ساتھ دینا چاہیے چنانچہ ناول نویس خواتین کے دور اول کے تقریباً سب ناولوں میں ہمیں زندگی کی ایسی تصویریں ملتی ہیں اس میں مشرق کا رچا ہوا تہذیبی رنگ بھی ہے اور مغربی تہذیب کا لایا ہوا شوق اور نظر فریب رنگ بھی۔

خواتین کے ابتدائی ناول مغربی معاشرے کا عکس اور مشرقی معاشرے کی بھرپور قدریں ہیں جو رجعت کے بجائے ترقی کی روایت بن کر ابھرتی ہیں اس دور کے ناول اس لحاظ سے بھی اہم ہیں کہ انہیں پڑھ کر اس معاشرے کی گوناگوں تصویریں آنکھوں کے سامنے آجاتی جبکہ دو معاشرتی نظاموں اور ان کے اخلاقی اقدار میں تصادم اور کش مکش کا بازار گرم تھا

پردے میں رہنے والی ان خواتین ناول نگاروں نے مختلف سماجی پہلوؤں کو پیش کرنے میں کسی طرح کی مبالغہ آرائی نہیں کی حالانکہ انہوں نے بہت محدود زندگی کی آئینہ داری کی پھر بھی اس زمانے میں یہ ایک نئی اور انوکھی بات تھی۔

تخلیق کار خواتین نے عورتوں اور مردوں کی زندگی کو خانوں میں تقسیم نہیں کیا بلکہ گھروں کے اندر ہونے والے استحصال کے خلاف قلم لے کر سامنے آئیں اور اپنی زندگی کو سنوارنے سے سجانے کی کوشش میں لگ گئیں اور زندگی کے بہتر علوم کو حاصل کرنے کی حمایت کی عبدالمغنی کے لفظوں میں میرابائی زیب النساء سے لے کر خواتین ہر دور میں کسی نہ کسی انداز اور تناسب سے اپنی فطرت اور حدود کے اندر رہتے ہوئے تہذیبی سرگرمیوں میں شریک رہیں۔

خواتین کے دور اول یا دور ثانی کے ناول خواہ فن کے بہت کامیاب نمونے نہ سہی لیکن زندگی اور معاشرت کے صحیح موثر اور حسین و جمیل مرقعے ضرور ہیں۔ مگر اس کے باوجود یہ بات قاری کے لیے کوفت کا باعث بھی ہے کہ زندگی کے یہ خوبصورت مرقعے فنی محاسن اور نزاکتوں سے قطعی عاری ہیں اسی دور کی اکثر ناول نویس خواتین کے ناولوں میں یہ معائب ضرور پائے جاتے ہیں۔

عورتوں کی ناول نگاری کا اگلا دور تخیل تصور حقیقت صداقت مقصد فن سادگی حسن بیان جذبائیت توازن غور و فکر کی گہرائی اور نفسیات کے غلبے کا دور ہے اور اس دور میں ناول نگار خواتین نے اپنی نظر میں وسعت پیدا کر کے کہانیوں کے پس منظر میں زیادہ پھیلاؤ پیدا کیا ہے چنانچہ رفتہ رفتہ اس دور کے ناولوں نے فنی حیثیت سے ایک ایسا رتبہ حاصل کیا ہے کہ ان کے کارنامے مرد ناول نگاروں کے لیے رشک کا باعث بنے ہیں۔

اس مرتبہ و مقام کے حوالے سے ایوان ادب میں ایک اہم خاتون نذر سجاد حیدر کا نام بھی نمایاں ہے جو شادی سے قبل نذر زہرا کے نام سے افسانے اور مضامین لکھتی تھیں لیکن شادی کے بعد نذر سجاد حیدر کے نام سے لکھنے لگیں موصوفہ تعلیم یافتہ روشن خیال اور ترقی پسند خاتون تھیں انہوں نے چھ ناول لکھتے ہیں۔

''حرماں نصیب''

''اختر النساء بیگم''

''آہ مظلوماں''

''نجمہ''

''جانباز اور ثریا''

ان کے یہ ناول اگر چہ آزادی سے قبل اعلیٰ متوسط طبقہ کی تہذیب اور
شرت افکار و اقدار اور مسائل کا آئینہ دار ہیں لیکن ان میں عورت کے دل کی
ڑکن بھی سنی جاسکتی ہے اور یہ ہر جگہ درد اور کرب سے کراہتی ہوئی نظر آتی ہے۔
نذر سجاد حیدر کے یہ ناول عصری زندگی کے پس منظر میں عورت کے
ئل اس کے حقیقی جذبات اور خوابوں کے آئینہ دار ہیں بیان کی شیرینی اور لطافت
جن کی دلچسپی میں اضافہ کر دیا ہے۔
نذر سجاد حیدر کے ناولوں کے ساتھ خواتین کی ناول نگاری اپنے ابتدائی دور
تکمیل کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ان کے ناولوں کی تعریف کرتے ہوئے مولانا
ق الخیری صاحب فرماتے ہیں۔

"اگر یہ بحث چھڑے کہ عورتوں میں کس نے سب
سے پہلے اپنی جنس کی مظلومیت اور بے چارگی پر آنسو بہائے اور
ان کے شرعی حقوق کے اصول کی انتھک عظیم المرتبت بلند پایہ
لکھنے والیوں میں اردو کی کون سی مصنفہ ہے جس کی ساٹھ برس کی
تحریروں میں کتنا ہی تلاش کیا جائے مشرقی شرافت کیخلاف کوئی
ایسا لفظ نہ نکلے گا جس سے نسوانی وقار مجروح ہو تو ان سوالوں
کے جواب میں صرف ایک نام لیا جاسکتا ہے اور وہ ہے نذر سجاد
حیدر کا"

لہذا اس دور کی حقیقت پسندانہ اور فنکارانہ روش کی پیش روی کا سہرا نذر
حیدر کے سر بندھتا ہے مگر کہانی کو زندگی کے حقائق کا مرکز اور کرداروں کے
اور رد عمل کی جولاں گاہ سمجھ کر یہ فریضہ ادا کرنے کا واضح تصور ان سے نسبتاً بعد

میں آنے والی ناول نگار خواتین کے ناولوں میں نمایاں ہے ایسی ناول نگار خواتین میں حجاب امتیاز علی صالحہ عابد حسین بیگم احمد علی عصمت چغتائی اے آر خاتون قرۃ العین حیدر اور فاطمہ مبین کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

عورتوں کی ناول نگاری کے اس اہم دور میں جن میلانات کا عکس ان کے ناولوں میں نمایاں دکھائی دیتا ہے ان کا ایک تصور حجاب امتیاز علی اور صالحہ عابد حسین کے علاوہ عصمت چغتائی کے ناولوں کے سرسری جائزے سے قائم کیا جا سکتا ہے۔ اور اس کے علاوہ یہ ناول عورتوں کی ناول نگاری کے دورِ جدید میں خواتین کے ذہنی و جذباتی رویّوں کی بھی نشاندہی کرتے ہیں جن سے تحریکِ نسواں کے ارتقائی مدارج کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

خواتین کی ناول نگاری کے دورِ جدید میں حجاب امتیاز علی اہم اور نمایاں نام ہے۔ ان کے ناول ایک نئے موڑ کی نشاندہی کرتے ہیں جو رومانیت سے تعلق رکھتا ہے۔ ناول نگاری میں رومانی دور کی سب سے مدھر اور مترنم آواز حجاب امتیاز علی کی ہے انہوں نے اصلاحِ نسواں کی تحریک سے آگے نکل کر اپنے قارئین کے لیے ایک ایسا طلسم کدہ تعمیر کیا جس کے تمام دریچے عشق و محبت کی جانب کھلتے ہیں۔

حجاب امتیاز علی کی کہانیوں میں یہ سارا ڈراما۔ امراء اور روساء کی نیم تاریک غلام گردشوں۔ وسیع دالانوں کی دوپہروں۔ خواب گاہوں اور پائیں باغ کی تاریک راتوں میں کھیلا جاتا ہے۔ اور آخر میں جنم لیتی ہے۔ رومانی غمناک کیفیت۔ یہاں مشرق کی آزاد خیال لڑکی قدیم رسوم و رواج اور خاندانی انا کے سامنے بے دست و پا ہے۔ اردو میں رومانی اور نفسیاتی ناول نگاری کی ابتداء حجاب امتیاز علی کے ناولوں "ظالم محبت"۔ "اندھیرا خواب" اور "میری نا تمام محبت" سے ہوئی ان کے ان ناولوں کے محرکات اگرچہ خارجی ہیں لیکن ان کا ردِ عمل رومانی اور جذباتی ہے یہ ناول اعلیٰ متوسط طبقہ کی معاشرتی زندگی کو پیش کرتے ہیں ان کا ماحول فضاء رنگین اور رومان پرور ہے اور

انداز بیان شاعرانہ ہے ان کے ناولوں کا بنیادی مسئلہ معاشرہ اس کی اقدار اور شادی بیاہ کے مسائل ہیں جس میں محبت کو ہمیشہ شکست ہوتی ہے اسی سے رومان کی غم انگیز فضاء پیدا ہوتی ہے۔

حجاب امتیاز علی کے ناولوں کی دنیا خاصی خود ساختہ اور طلسمی ہے، ان میں مسرت اور غم کی نوعیت بھی اتفاقی ہے، ان کے بیشتر کردار اگرچہ سادہ اور ٹائپ ہیں جن میں خواتین کی تین نسلوں کو پیش کیا ہے۔ نئی نسل جو خاصی مغرب زدہ ہے خود کو پچھلی نسل سے آزاد کرانا چاہتی ہے ان کے ناولوں کی روحی اور جیوتی دونوں ہی اس نئی نسل کی نمائندہ ہیں جو خاندانی روایات اور سماجی اقدار کی قیود سے آزاد کرا کر اپنی زندگی آپ جینے کی آرزو مند ہیں لیکن مشرقی روایات کے سامنے بے دست و پا ہیں حجاب کے یہ ناول رومانی ہونے کے باوجود تحریکِ نسواں کا حصہ ہیں۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خان کے لفظوں میں۔ "حجاب امتیاز علی، اس رومانس کی قائل ہیں جو فنتاسی سے جا ملتا ہے۔ اردو فنتاسی میں کرشن چندر۔ محمد خالد اختر اور ایس ایم جمیل واسطی کے بعد انہی کا نام آتا ہے، اپنے ناول "پاگل خانہ" میں وہ اپنے شروع کے ناول جیسے "ظالم محبت" وغیرہ سے مختلف نظر آتی ہے۔ "پاگل خانہ" سائنسی فنتاسی ہے جو ایٹمی جنگ کی ان تباہ کاریوں کا رخ دکھاتی ہے جس کا تعلق عالم انسانیت کو مکمل بربادی سے ہے اس ناول کا پلاٹ زیادہ جاندار نہیں۔ جگہ جگہ لمبی بحثوں اور ایکشن (ACTION) کی کمی سے ان کا اسلوب غیر دلچسپ ہو گیا ہے اور اس میں ٹھس پن بھی پیدا ہو گیا ہے لیکن سائنسی فنتاسی کی تخلیق کا اعزاز ان کو ضرور ملے گا۔

"ظالم محبت" حجاب امتیاز علی کا پہلا ناول ہے اس کی جو خصوصیت پڑھنے والے کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہے وہ اس کی انوکھی پر اسرار اور طلسمی فضا ہے جو پر کشش بھی ہے اور اس میں پڑھنے والے کو اپنے اندر پوری طرح گم اور جذب کرنے کی خصوصیت بھی ہے لیکن "ظالم محبت" سے بھی زیادہ "اندھیرا خواب" میں ناول نگار نے

اپنے محبوب کی پر اسرار۔ طلسمی۔ تخیلی اور شاعرانہ ماحول میں بھی انسانی حرکات کی گہری نفسیاتی تاویل و توجیہ کی ہے اور یہ ثابت کیا کہ انسانی عمل اور رد عمل محض جسمانی تغیرات کا نتیجہ نہیں ان کے پیچھے ذہنی الجھنیں اور پیچیدگیاں بھی ہیں یہ ذہنی الجھنیں بعض اوقات مجموعہ ہوتی ہیں ایسی یادوں کا جو ٹھوس اور افسردہ ہوتی ہیں اور دردناک لیکن شیریں بھی۔

حجاب امتیاز علی کے پاکستان میں تحریر کئے گئے ناولوں میں "پاگل خانہ" اور "احتیاط عشق" ہیں۔

اگر فنتاسی (FANTASY) پر مبنی ناولوں پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی جائے تو اس عہد تک آتے آتے مختلف النوع موضوعات اور ان کی جہات کا منظر نامہ بھی تشکیل پا جائے جو جدیدیت سے عبارت ہے اور جہاں ناول تجربات اور جدت کے ایسے موڑ کاٹتا ہے کہ پڑھنے والے کو حیرت ہوتی ہے۔

اردو میں فنتاسی پر مبنی ناولوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ اس سلسلے کی ایک اہم کڑی حجاب امتیاز علی کی سائنسی فنتاسی "پاگل خانہ" ہے جس میں ان کے ناول "ظالم محبت" والے معروف کردار تیسری عالمگیر جنگ کی تصوراتی و تخیلاتی تباہ کاریوں کے حزنیہ ماجرائی تشکیل کرتے ہیں۔ اب چونکہ دنیا ایٹمی جنگ کی ممکنہ تباہ کاریوں سے لرزہ براندام ہے اس لیے "پاگل خانہ" جیسے فنتاسی ناول کو ہم اس کی موضوعاتی اہمیت کے پیش نظر قطعاً نظر انداز نہیں کر سکتے۔

"پاگل خانہ" پریشان روح کا ایک سفر نامہ ہے۔ یہ ایک نسوانی روح کی کہانی ہے جو امن و آتشی کی خواہاں ہے۔ حجاب امتیاز علی کے ناولوں کی دنیا میں ان کے کرداروں کی دلپذیری ماحول کی طلسمی فضا۔ اسلوب کی شعریت اور زندگی سے متعلق فکری عناصر کا امتزاج ان کی انفرادیت ہے۔

ناول نگار خواتین میں صالحہ عابد حسین بھی اہم نام ہے۔ انہوں نے اپنے

موضوع کے اظہار میں موضوع اور فن دونوں کو پوری طرح سمونے کی کوشش کی ہے اور ہر ناول کے مجموعی تصور پر اس شخصیت کا پورا عکس نمایاں ہے۔

صالحہ عابد حسین کو ادبی ذوق ورثے میں ملا تھا۔ انہوں اگرچہ کم عمری میں ہی لکھنا شروع کر دیا تھا لیکن ان کا پہلا ناول "عذرا"۔ ۱۹۴۶ء میں منظر عام پر آیا تھا اس کے بعد ان کے دیگر ناول "آتش خاموش"۔ "قطرے سے گہر ہونے تک"۔ راہ عمل۔ "یادوں کے چراغ"۔ "اپنی اپنی صلیب"۔ "الجھتی ڈور"۔ "گوری سوئے سیج پر" کے علاوہ "ساتواں آنگن" طبع ہوئے۔

"عذرا" سے "ساتواں آنگن" تک صالحہ عابد حسین کا فن بتدریج ارتقائی منازل طے کرتا ہے۔ انہوں نے اگرچہ اے۔ آر۔ خاتون کے زیرِ اثر ناول نگاری کا آغاز کیا تھا اور کچھ مدت وہ پریم چند سے بھی متاثر رہی تھیں لیکن جلد ہی انہوں نے اپنی راہ خود تلاش کر لی ان کے ناولوں کا دائرۂ عمل اگرچہ زیادہ وسیع نہیں ہے لیکن جس زندگی کو انہوں نے اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے اس پر صالحہ عابد حسین کی گرفت خاصی مضبوط ہے جس کی معمولی سی معمولی جزئیات سے وہ واقف نظر آتی ہیں لیکن اس کی رو میں بہ نہیں جاتی ہیں۔

بلکہ ان کے یہاں جزئیات کے انتخاب اور فنکارانہ استعمال کا سلیقہ موجود ہے۔ اسی طرح معاشرتی زندگی کی تصویر کشی اور حقیقت نگاری کو انہوں نے اگر اپنے فن کی بنیاد بنایا ہے تو خارجی زندگی کے ساتھ داخلی زندگی کو بھی متوازن انداز سے اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے ان کے ناولوں میں اگرچہ اصلاحی اور اخلاقی پہلو بھی نمایاں ہے لیکن اس مقصد کے حصول اور انسانی اقدار کے فروغ کے لیے وہ کرداروں کے چہروں کو مسخ یا قصہ کو غیر فطری انداز میں کوئی نیا رخ نہیں دیتی ہیں بلکہ کرداروں کی فطرت میں پوشیدہ نرم گوشوں کو نمایاں کر دیتی ہیں مثال کے طور پر "عذرا"، ان کا پہلا ناول ہے۔

جس میں انہوں نے قصباتی زندگی سے تعلق رکھنے والے ایک متوسط طبقے کے خاندان اور اس کی معاشی پریشانیوں کو پیش کیا ہے اس ناول میں ایک کردار "عذرا" کی خالہ کا بھی ہے جو جلی کٹی سنانے کا کوئی موقع بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتی۔ "عذرا" شوخ و شریر اور آزاد طبع ہونے کے باوجود پابندیوں میں جکڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ "راہِ عمل" کی گیتا اور خالدہ "عذرا" کی ترقی یافتہ تصویر ہیں جو قومی اور سماجی تعمیر و تشکیل کے کاموں میں مصروف نظر آتی ہیں۔

"قطرے سے گہر ہونے تک" میں صالحہ عابد حسین نے ایک چھوٹے سے خاندان کی روزمرہ کی زندگی، ان کے چھوٹے چھوٹے مسائل اور چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور غم کو پیش کیا ہے۔ اس خاندان میں اگرچہ معاشی خوشحالی نہیں ہے لیکن مسائل کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ اور غموں کو برداشت کرنے کی جرات ضرور موجود ہے۔ "یادوں کے چراغ" میں مصنفہ نے ازدواجی رشتوں کے پس منظر میں عورت عورت اور مرد کے متضاد کرداروں کو پیش کیا ہے اور ناول "ابھی ڈور" اگر لڑکیوں کے مسائل اور الجھنوں سے عبارت ہے تو "اپنی اپنی صلیب" میں انہوں نے زندگی کی اس تلخ حقیقت اور تصور کو پیش کیا ہے کہ انسان اپنی خوشیاں تو دوسروں میں تقسیم کر سکتا ہے لیکن دکھوں کی صلیب اسے خود ہی اٹھانی پڑتی ہے۔

صالحہ عابد حسین نے اپنے ناولوں کے ذریعہ انسانی اور اخلاقی اقدار کو بھی تقویت پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ انسانیت پر، ان کا ایمان غیر متزلزل ہے، انکے بعض کردار اگرچہ مثالی ہیں لیکن ان میں زندگی کی حرارت اور توانائی موجود ہے، مرد کرداروں کے مقابلے میں ان کے یہاں خواتین کے کردار زیادہ فعال اور جاندار ہیں۔ ان کے ابتدائی دور کے ناولوں میں غم پسندی۔ جذبات کی شدت۔ تحلیلِ نفسی اور رقتِ قلب نے ان کی اثر آفرینی میں اضافہ کر دیا ہے۔ ان کے ناولوں کی زبان فطری ہے اور لہجہ کی شرافت۔ بیان میں شگفتگی اور ادبی لطافت کا عنصر ہر جگہ موجود ہے۔ ان

کے ناول موضوع اور مواد کے تنوع۔ کرداروں کی سلامت روی اور زبان و بیان کی لطافت و دلکشی کی وجہ سے ناول کی تاریخ کا حصہ رہیں گے۔

(حوالہ۔ ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی۔ اردو ناول کے فروغ میں خواتین کا حصہ۔ مشمولہ 'اردو ادب اور خواتین۔ اردو اکادمی دہلی)

رضیہ سجاد ظہیر نے باقاعدہ کالج میں تعلیم حاصل کی تھی اور کچھ عرصہ خود بھی استاد رہی تھیں وہ اجمیر کے معروف کالج کے پرنسپل رضا حسین کی بیٹی اور ترقی پسند تحریک کے رہنما سجاد ظہیر کی اہلیہ تھیں۔ ماحول اور رشتوں کے اس تعلق نے ان کی فکر و فن کو بھی متاثر کیا تھا یہی وجہ ہے کہ ان کے ناولوں کا ماحول و فضا۔ موضوع و مواد۔ کردار اور زندگی کے بارے میں ان کا نقطہ نگاہ دیگر خواتین ناول نگاروں سے قطعی مختلف نظر آتا ہے۔

رضیہ سجاد ظہیر کے چار ناول طبع ہوئے ہیں۔ "سر شام"۔ "کانٹے"۔ "سمن" اور "اللہ میگھ دے"۔ موصوفہ کے ناولوں میں اشتراکی نظریات کی گونج بھی سنائی دیتی ہے اور نئے سماج کی تعمیر و تشکیل کا جذبہ بھی ٹھاٹھیں مارتا ہوا نظر آتا ہے۔ رضیہ سجاد کا فن اگرچہ حقیقت اور رومانیت کے امتزاج سے عبارت ہے لیکن ان کے یہاں عورت ایک نئی قوت اور فکر کے ساتھ ابھر کر سامنے آتی ہے اس لیے اس کے مسائل بھی روایتی عورت سے مختلف ہیں جن کا مقابلہ بھی وہ نئے عزم و حوصلے اور نئے انداز سے کرتی ہے۔

رضیہ سجاد ظہیر نے ترقی پسند ہونے کے باجود انسانی رشتوں اور جذبات و خیالات کے اظہار میں ضبط و توازن سے کام لیا ہے اس لئے ان کے ناول سنجیدہ اور روشن خیال تعلیم یافتہ طبقہ ہی میں مقبول ہو سکے ہیں۔

محترمہ اے آر خاتون کے زیادہ معروف اور فاطمہ مبین کے نسبتاً کم معروف

ناول ثریا۔ "نگار" اور "ایرانی"، قدیم روایت اور نئے تجربے کے امتزاج کے کامیاب نمونے ہیں اور اس لحاظ سے پسندیدہ ہیں کہ ناولوں میں ناول نگار نے سیاست اور فلسفہ کی الجھنوں سے الگ رہ کر روزمرہ کی معاشرتی زندگی میں سیدھی سادی کہانیاں نکالی ہیں اور فنکاری کے کسی ادعا کے بغیر انہیں اس طرح ترتیب دیا ہے کہ ابتداء سے اختتام تک ان کی دلچسپی برقرار رہتی ہے اور انہیں پڑھ کر اب بھی ہمارے سامنے ایک پسندیدہ معاشرے اور ایک دلکش گھریلو زندگی کا وہی تصور آتا ہے جس کا خواب ابتدائی دور کی ناول نگار خواتین نے دیکھا تھا۔

محترمہ اے آر خاتون کے دو ناول "تصویر" اور "شمع" پہلی بار ۱۹۳۹ء میں دہلی (بھارت) سے چھپے تھے اور ۱۹۴۷ء کے بعد آئینہ ادب لاہور سے طبع ہوئے۔ زاں بعد ان کے تمام ناول آئینہ ادب لاہور سے ہی چھپتے رہے جن میں "افشاں"۔ "رومانہ"۔ "تاکھ" اور "چشمہ" (دو حصے) اور "ہالہ" جیسے عمدہ ناولوں سے اردو ادب میں بیش بہا اضافے کئے ہیں۔ ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی کے لفظوں میں

"لیکن اس بات کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ محترمہ اے آر خاتون کے ناولوں کے لیے ایسی فضا ہموار کرنے میں حجاب امتیاز علی کے ناول معاون ثابت ہوئے ہیں جس میں عورت پابند رہ کر بھی کسی قدر آزاد نظر آتی ہے یہی وجہ ہے یہ اردو کی خواتین ناول نگاروں میں جو مقبولیت اے آر خاتون کے ناول "شمع" اور "افشاں" کو حاصل ہوئی وہ کم ہی خواتین کے حصے میں آئی ہے۔۔۔۔ قصہ گوئی کا فطری انداز اگرچہ خواتین کی ملکیت ہے لیکن پلاٹ کی ایسی تشکیل اور واقعات کی ایسی ترتیب جو قاری کے تجسس و تحیر کو ابھار سکے فنکارانہ شعور کا ہی نتیجہ ہے۔ اے آر خاتون کے ہر ناول کا قصہ تقریباً یکساں ہوتا ہے جس میں ہیرو اور ہیروئن کی ملاقات محبت، ہیروئن کا اغوا، تلاش اور بازیافت وغیرہ ایسے واقعات ہیں جن کی تکرار سے ان کے ناولوں کا دائرہ محدود ہو جاتا ہے۔"

لیکن اس کے باوجود تکنیک کے لحاظ سے اے آر خاتون کے ناول اردو کے بہترین ناولوں میں سے ہیں اور ان ناولوں کی یہ بڑی خوبی ہے کہ کردار نگاری میں حقیقت پر گمان ہوتا ہے کسی بھی ناول میں، کسی بھی موقع پر الجھاؤ نہیں ہے پلاٹ میں تنوع ہے۔ ان کے ناولوں کی زبان سادہ۔ سلیس اور بامحاورہ اور بیان شگفتہ اور عمدہ ہے۔ مخصوص لب ولہجہ۔ ضرب الامثال۔ کہاوتوں۔ لطیفوں۔ مزاحیہ فقروں اور برمحل۔ برجستہ اشعار کے استعمال سے اس کی دلکشی اور اثر آفرینی میں اضافہ کر دیا ہے جہاں انھوں نے منظر کشی کی ہے۔ سیدھے سادہ لفظوں میں جس چیز کو بیان کیا ہے اس کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا اے آر خاتون کے ناول دہلی کی تہذیب و معاشرت اور زبان کے مطالعہ کے لیے خاصا مواد فراہم کرتے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد اردو ناول کو فروغ حاصل ہوا لیکن ہمارے ناول عمومی موضوع کسی نہ کسی طور احوال تقسیم وطن رہا ہے اور تقسیم ہند کے بعد تاسیس پاکستان کے ابتدائی برسوں میں ناول میں ہجرت کا تجربہ تخلیق کا روپ دھار تا رہا ہے۔ تاہم ناول نگاری میں موضوعات کا تنوع۔ اسلوب اور ہیئت میں بھی تجربات کا احساس ہوتا ہے ان پچاس برسوں میں بہت اچھے اور معیاری ناول تخلیق ہوئے جو تاریخی شعور فنی بالیدگی اور فکری صلاحت کے اعتبار سے اچھے ناول ہیں۔

خواتین ناول نگاروں میں حجاب امتیاز علی کا "پاگل خانہ"۔ قرۃالعین حیدر کا "میرے بھی صنم خانے"۔ خدیجہ مستور کا "آنگن"۔ نثار عزیز بٹ کا "نگری نگری پھرا مسافر"۔ اختر جمالی کا "پھول اور پارود"۔ جمیلہ ہاشمی کا "تلاشِ بہاراں"۔ بانو قدسیہ کا "راجہ گدھ"۔ رضیہ فصیح احمد کا "آبلہ پا"۔ رشیدہ رضویہ کا "گھر میرا راستے غم کے"۔ الطاف فاطمہ کا "چلتا مسافر"۔ مرحب قاسمی کا "کرچیوں میں عکس" اور ڈاکٹر فردوس جہاں قاضی کا "خوابوں کی بستی" قابلِ ذکر ناول ہیں۔ ان ناولوں میں ناول نگاروں نے تاریخی۔ سائنسی۔ نظریاتی۔ معاشی۔ سماجی۔ معاشرتی۔ تہذیبی اور فکری زندگی کو

ناول کا موضوع بنایا ہے۔ ان ناولوں میں فکری اعتبار سے صلاحیت اور طرزِ تحریر میں ادبی چاشنی موجود ہے۔ حجاب امتیاز علی۔ قرۃ العین حیدر۔ رشیدہ رضویہ اور فردوس حیدر سے لے کر خدیجہ مستور، عذرا اصغر اور رسیدہ حنا تک کئی نام آتے ہیں جنہوں نے قیامِ پاکستان کے بعد اس صنف ادب کو آگے بڑھایا اس کی رہبری کی اور اسے نئی منزلوں تک پہنچایا۔

اس جائزے میں اصولی طور پر تو قرۃ العین کا نام نہیں آنا چاہیے تھا کیونکہ وہ بھارت واپس چلی گئی تھیں لیکن ان کا ذکر اس لحاظ سے ناگزیر ہے کہ ہمعصر فکشن پر، ان کے خاصے گہرے اثرات ہیں اور دوسرے وہ پاکستان میں بارہ، تیرہ برس تک قیام پذیر رہی ہیں۔

اگرچہ "میرے بھی صنم خانے" نے بھی خاصی شہرت حاصل کی لیکن "آگ کا دریا" بلاشبہ اردو ناول نگاری میں ایک عظیم تجربہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ صدیاں ایک ایسے آفاقی سمندر کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ جس میں انسان کا عالم ادھر ڈوبے ادھر ڈوبے اُدھر نکلے ایسا ہوتا ہے کینوس اتنا وسیع ہے "آگ کا دریا" ایک بحر اں سمندر بن جاتا ہے جس میں مختلف فلسفوں کے دریا اور علوم کی ندیاں آکر گرتی ہیں اس لیے جب تک تہ میں نہ جاؤ موتی نہ ملے گا لیکن تہہ میں جانے والے شناور کتنے ؟

1950ء کی دہائی سے لے کر اب تک ناول کے افق پر ہمارے ہاں جو سب سے بڑی شخصیت طلوع ہوئی ہے وہ قرۃ العین حیدر ہیں۔ فکشن کی دنیا میں قرۃ العین حیدر کی انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے بیسویں صدی کے نصف اول کے ہندوستان کی معاشرت کا قصیدہ بھی لکھا ہے اور نوحہ بھی یہ دور "دو عظیم جنگوں۔ نو آبادیات کے عروج و زوال، مشرق کی تحرکاتِ آزادی۔ تقسیم ممالک اور تمدنی ترقیات کے سبب عصر حاضر کی تاریخِ عالم کا نازک ترین۔ پیچیدہ ترین اور اہم ترین دور رہا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد بیسویں صدی کے نصف ثانی میں انتشار انسانیت کا جو دور شروع ہوا

اور جس کا نقطہ آغاز دوسری جنگ عظیم کے اختتام کے سال 1945ء اور تقسیم ہند کے سال 1947ء کو قرار دیا جا سکتا ہے اس کی بہترین وسیع ترین۔ لطیف ترین اور مؤثر ترین عکاسی مشرقی ادبیات میں قرۃ العین حیدر کے فکشن میں ملتی ہے۔

جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا گیا عورتوں کے ناولوں پر مغربی ناول کے مطالعے اور اس کے فنی تاثرات کا عکس نمایاں ہوتا گیا یہاں تک کہ قرۃ العین حیدر کے ناول "میرے بھی صنم خانے" اور "سفینہ غم دل" پوری طرح اس اثر کے رنگ میں ڈوبے نظر آتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر نے متعدد ناول اور ناولٹ تحریر کئے ہیں۔ ان کا ادبی سفر کئی عشروں پر محیط ہے ان کے فن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے فن کو محدود نہیں کیا بلکہ "میرے بھی صنم خانے" سے لے کر "آگ کا دریا" تک انہوں نے ایک ذہنی سفر کیا ہے۔

تشکیل پاکستان کے بعد قرۃ العین حیدر کا پہلا ناول "میرے بھی صنم خانے 1947ء میں دوسرا ناول "سفینہ غم دل "1952ء میں طبع ہوا۔ قرۃ العین حیدر نے ان دونوں ناولوں میں مغرب زدہ امیروں کی دنیا کو اپنی کہانیوں کا پس منظر بنایا ہے اور ان دونوں ناولوں نے بلا شبہ جدت کا احساس دلایا یہ جدت محض اسلوب اور تکنیک کی سطح ہی پر نظر نہیں آتی تھی بلکہ ان کے موضوعات بھی نئے پن سے آراستہ تھے۔

ان کے پہلے ناول "میرے بھی صنم خانے" کو چھپتے ہی خاصی پذیرائی ملی اس ناول میں لکھنؤ کے ایک محدود طبقے کی زندگی پیش کی گئی ہے یہ زندگی مصنفہ کے رگ و ریشہ میں سمائی ہوئی ہے۔ اودھ کے تعلقہ دار سارے ہندوستان سے الگ تھلگ ایک جداگانہ طبقہ تھے یہ طبقہ قدیم وجدید کا عجیب سا امتزاج تھا۔ یہاں ہندو اور مسلمان کی تفریق نہیں تھی۔ تفریق تھی تو صرف تعلقہ دار اور غیر تعلقہ دار کی۔

سیاست میں یہ لوگ زیادہ تر کانگریسی تھے۔ ان کے دوسرے ناول "سفینہ غم

دل" میں خود سوانحی عنصر بہت زیادہ ہے یہ ان کی اور ان کے والد کی سوانح عمری بن کر رہ گئی ہے، اس میں صرف فسادات کا تذکرہ اہم ہے اس سے مصنفہ کے رجحان کا پتہ چلتا ہے اور ان کے سیاسی نظریات واضح ہوتے ہیں یہ ان کا کمزور ترین ناول ہے۔ تاہم اس کے باوجود، ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی کے لفظوں میں۔ قرۃالعین حیدر کے ان ناولوں میں تاریخ و فلسفہ۔ تہذیب و معاشرت۔ سیاسیات و معاشیات۔ فطرت و نفسیات۔ افکار و اقدار۔ جذبات و تصورات۔ مشرق و مغرب۔ فرد اور سماج سب ہی کی جلوہ گری نظر آتی ہے اس اعتبار سے ان کے ناولوں کا پس منظر اور کینوس خاصا وسیع ہے ان میں موضوع و مواد کے تنوع اور ہیئت اور تکنیک کے تجربے بھی موجود ہیں۔ قاری ان کے ناولوں میں پیش کردہ فلسفۂ زندگی تاریخ کے بارے میں ان کے نظریات اور ابہام کے شعوری پہلو سے تو اختلاف کر سکتا ہے لیکن عصری زندگی کے تناظر میں ان کی تاریخی حیثیت سے انکار ممکن نہیں ہے ان ناولوں کا یہ پہلو بھی ناقابل فراموش رہے گا جس نے ناول کو ہلکے پھلکے ادب کے زمرے سے نکال کر اسے سنجیدہ فکر اور فلسفیانہ خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنا دیا ہے جس کی وجہ اس کے ادبی وزن اور وقار میں اضافہ ہو گیا ہے۔ ان کے ناولوں کی زبان میں بھی تخلیق کا عنصر۔ حقیقت اور رومانیت کا امتزاج موجود ہے لیکن ان کے تخلیقی رویے خاصے پیچیدہ اور گنجلک ہیں وہ کسی بھی عہد، زمانے، طبقہ یا کسی بھی ملک کی تہذیب اور معاشرت کی عکاسی کریں ان کا مخصوص نقطۂ نظر ہر جگہ جلوہ فگن رہتا ہے۔

"آگ کا دریا" کی اشاعت اردو ناول کی دنیا کے لئے نیک فال تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا کینوس انتہائی وسیع ہے۔ ڈھائی ہزار سال کی تاریخ کو ناول میں کامیاب ماجرے کے ساتھ سمو دینا قرۃالعین حیدر کی ذہانت کا ثبوت ہے "آگ کا دریا" 1959ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ اس میں کہانی کا تعلق گوتم بدھ کے دور کے ایک سو سال بعد سے لے کر پاکستان کے قیام کے اولین عشرے سے ہے۔

قرۃ العین حیدر کی زیادہ تر شہرت ان کے ناول "آگ کا دریا" کی بدولت ہوئی یہ ناول خاصہ ہنگامہ خیز ثابت ہوا بعض لوگ اسے اردو کا عظیم ترین ناول مانتے ہیں۔
ورجینا وولف کے ناول آرلینڈو(ORLANDO) سے لیا ہے اس ناول میں انگلستان کی تہذیب کے بعض پہلوؤں اور اس کی بعض خصوصیات پر طنز کیا گیا ہے لیکن "آگ کا دریا" میں اس کے بر خلاف ہندوستانی تہذیب اور تمدن کی جاندار اور منفرد خصوصیات کو نماں کیا گیا ہے تاہم آگ کا دریا کیفیت و کمیت دونوں لحاظ سے اپنی ایک جداگانہ انفرادیت رکھتا ہے۔

چنانچہ فن کے لحاظ سے اس ناول کو مصنفہ کے پہلے دو ناولوں "میرے بھی صنم خانے" اور "سفینہ غم دل" کے مقابلے میں سنگ میل قرار دیا گیا اس کی وجہ اس کا وسیع کینوس ہے اس میں اتفاق سے تمام وسعتیں سما گئیں اس کا قصہ ڈھائی ہزار سال پر محیط ہے اور ماضی و حال کی سیاسی و معاشرتی تاریخ کا پھیلاؤ ناول کے دامن کو وسیع کرتا ہے۔

"آگ کا دریا" نے اپنی اشاعت کے ساتھ ہی جو ردعمل پیدا کیا وہ کم ناولوں کے حصے میں آتا ہے اس دور کے ناولوں میں عظیم ناول "آگ کا دریا" ہے یہ ہماری زبان میں ایک انوکھا لیکن کامیاب تجربہ ہے تاہم وہ عام پسند نہیں ہے اس میں مقامی رنگ اتنا گہرا ہے کہ اس سے واقفیت کے بغیر سارا لطف ادھورا رہ جاتا ہے لیکن قرۃ العین حیدر اپنے فرائض سے بوجوہ احسن عہدہ بر آ ہونے میں کامیاب ہیں اور "آگ کا دریا" کی تخلیق کے بعد بھی مصنفہ کی تخلیقی توانائی میں ضعف نہیں آیا انہوں نے ہمیشہ تازہ دم ہونے کا اثر دیتے ہوئے "آخر شب کے ہمسفر"۔ "رنگ چمن" اور چاندنی بیگم" جیسے ناول پیش کئے۔ ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی لکھتے ہیں۔
"قرۃ العین حیدر کا دوسرا ناول "آخر شب کے ہمسفر" (مطبوعہ 1979ء) کا موضوع 1942ء کی انڈر گراؤنڈ تحریک آزادی ہے۔ ناول "ماں" کا عکس نظر آتا ہے لیکن

ناول کا مطالعہ مجموعی اعتبار سے اس شبہ کو تقویت پہنچاتا ہے کہ کیا وہ اس تحریک اور اس کے عمل سے فی الواقف ہیں کیا وہ اپنے موضوع اور مواد پر پوری طرح قدرت رکھتی ہیں، البتہ دوران مطالعہ بار بار یہ تاثر ابھرتا ہے کہ جیسے ناول نگار یہ کہنا چاہتا ہے کہ وہ لوگ جو بڑھ بڑھ کر باتیں کرتے ہیں وہ کیسی ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ مذہب و اخلاق کے ٹھیکیداروں کی لڑکیاں کیسے تھیٹر کلب اور یورپ کی سڑکوں کی خاک چھانتی ہیں"۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خان کے لفظوں میں ۔ "قرۃ العین حیدر کے قلم میں توانائی ہے وہ ہمہ وقت کسی نہ کسی ریسرچ میں مصروف رہتی ہیں اور ان کو ناول کا موضوع بنا دیتی ہیں۔

"آخر شب کے ہمسفر" کے بعد انہوں نے "گردشِ رنگ چمن" اور "چاندنی بیگم" جیسے ناول پیش کئے۔

"گردشِ رنگ چمن" (مطبوعہ = 1987ء) کا موضوع بہت اہم ہے۔ یہ طویل ناول ہے اور اس کے پیچھے جو تحقیق کار فرما ہے وہ پڑھنے والوں کو حیرت زدہ کر دیتی ہے کہ کس طرح لوگ سانحہ در سانحہ کا شکار ہو کر اس سطح پر پہنچ جاتے ہیں کہ وہاں سے طوائفوں کا ادارہ اپنی جلوہ گری دکھاتا ہے اس ناول میں کہانی بین الاقوامی حدوں کو چھونے لگتی ہے۔ "گردشِ رنگ چمن" حقیقت میں ایک انکشافاتی (RE-VEALING) ناول ہے۔ اس میں جس کرب سے قرۃ العین حیدر، گزری ہوں گی وہ تو ظاہر ہی ہے لیکن اس ناول کی بڑائی یہ بھی ہے کہ مصنفہ اپنے کرب کو قارئین میں بھی تقسیم کر دیتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر کا ناول "چاندنی بیگم" (مطبوعہ =1990ء) بھی کم و بیش اسی تھیم (THEME) کا احاطہ کرتا ہے جو "گردشِ رنگ چمن" میں ہے لیکن یہاں ان کرداروں کی زندگی پیش کی گئی ہے جو وقت کی مہربانیوں سے بڑے لوگ یا معاشرے

کے معززین بن گئے ہیں قرۃ العین حیدر کو بڑے اور اعلیٰ طبقے کے افراد کے چھچھورپن کے بیان میں ملکہ حاصل ہے۔ "میرے بھی صنم خانے" سے لے کر آج تک کے ناولوں میں یہ کیفیت پائی جاتی ہے۔ نو دولتیے طبقے کی مکاریوں ۔ ساز شوں ۔ کمینگیوں اور ریاکاریوں اور کذب پسندی کی عکاسی میں بھی انہیں ملکہ حاصل ہے ان کے دونوں ناولوں چاندنی بیگم اور "گردشِ رنگِ چمن" میں تاریخ کا اپنا ایک علیحدہ ذائقہ ہے۔

فن ناول نگاری کے میدان میں "کارِ جہاں دراز ہے" (مطبوعہ = 1977ء) قرۃ العین حیدر کا ایک ذیشان تجربہ ہے جو اپنے آخری تجزیئے مین سوانحی ناول کا درجہ پاتا ہے اس کی اب تک دو جلدیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔

پہلی ضخیم جلد میں مصنفہ نے اپنے خاندان کی لگ بھگ تیرہ سو سالہ تاریخ رقم کی ہے۔ "کارِ جہاں دراز ہے" کا دوسرا حصہ ، مصنفہ کی خود نوشت سوانعمری کا درجہ رکھتا ہے۔ اس میں ان کے بہت سے عزیز و اقارب کے سوانحِ حیات بھی محفوظ ہو گئے ہیں۔ یہ حصہ تقسیم ہند کے بعد کے حالات سے تعلق رکھتا ہے اس ناول کا حصہ دوم 1979ء میں شائع ہوا۔

قرۃ العین حیدر کے ناول رومانی تخیل۔ نفسیاتی اور فلسفیانہ فکر ، پر خلوص مشاہدے اور فن کے نئے تجربات کا ایسا امتزاج ہے جس میں ناول اپنی جدید ترین فنی ہیئت مین ہمارے سامنے آتا ہے۔ یہاں حقیقت پسندی آہستہ آہستہ ماورائے حقیقت کی جانب قدم بڑھاتی ہوئی نظر آتی ہے ، لیکن عورتوں کے ناولوں کی یہی منزل ان کی آخری منزل تھیں۔

قرۃ العین حیدر کو یہ اعزاز حاصل رہے گا کہ انہوں نے شعور کی رو کی تکنیک کو کام میں لاکر اردو ناول کو نئی وسعتوں سے ہم کنار کیا ہے۔ "میرے بھی صنم خانے"۔ "سفینۂ غم دل" سے "آگ کا دریا" پھر آگ کا دریا سے "چائے کا باغ" تک قرۃ العین حیدر کے فن کا یہ سفر ہم عصر اردو ناول کو نئے امکانات اور نئے تجربات سے روشناس کرتا

ہے۔

"آگ کا دریا" کے بعد نثار عزیز بٹ کے ناولوں "نگری نگری پھرا مسافر"، "نے چراغے نے گلے" اور "کاروان وجود"، خدیجہ مستور نے "آنگن" رشیدہ رضویہ نے "لڑکی ایک دل کے ویرانے میں"، "اسی شمع کے آخری پروانے" کے علاوہ "گھر میرا راستے غم کے"۔ جمیلہ ہاشمی نے "دشتِ سوس" جیلانی بانو نے "ایوان غزل" اور ڈاکٹر فردوسِ جہاں قاضی نے "آگ کا دریا" کی تقلید میں "خوابوں کی بستی" تاریخیت کے فنی و تکنیکی اصولوں کو حسب ضرورت چھوٹے اور بڑے کینوس پر برتا ہے لیکن یہ ناول نویس خواتین جدت کی دیگر مختلف شاہراہوں پر نکل پڑیں ورنہ یہ ہو سکتا تھا کہ تاریخیت کا رجحان مزید مستحکم ہوتا۔

خدیجہ مستور۔ جمیلہ ہاشمی۔ نثار عزیز بٹ۔ رشیدہ رضویہ۔ قرۃ العین حیدر اور ڈاکٹر فردوس جہاں قاضی کی بہترین صلاحیتیں ناول کے موضوعاتی تنوع کے لیے استعمال ہوئیں چنانچہ خدیجہ مستور کا "آنگن"۔ جمیلہ ہاشمی کا "تلاشِ بہاراں"۔ نثار عزیز بٹ کا "نے چراغ نے گلے"۔ رشیدہ رضویہ کا "لڑکی ایک دل کے ویرانے میں" کے علاوہ ڈاکٹر فردوس جہاں قاضی کا "خوابوں کی بستی"، وغیرہ اچھی مثالیں ہیں اور ان کا شمار اہم ناولوں میں ہوتا ہے۔

قرۃ العین حیدر نے "آگ کا دریا" میں تاریخیت کے رجحان کا نئے انداز سے احیاء کیا۔ اس جہت نے دوسرے ناول نگاروں پر بھی اثرات مرتب کئے۔ حجاب امتیاز علی۔ عصمت چغتائی۔ اور قرۃ العین حیدر کے ناولوں نے نئے فن کو اپنانے۔ مشاہدے اور تخیل کو بیک وقت اپنا فنی رہنما بنانے اور انفرادی اور اجتماعی زندگی کے مسائل کو نفسیاتی اور تجزیاتی نظر سے دیکھنے کی جس روایت کو عام کیا اس کا عکس ہمیں بعض نئی ناول نگار خواتین کے یہاں ملتا ہے۔

محترمات عائشہ جمال کے ناول "گردِ سفر" اور الفت منہاس کے ناول "بے

بارہ "اور" یہ کیا۔" اس عکس اور پرتو کی دلچسپ مثالیں ہیں۔ عائشہ جمال کا ناول "گرد
سفر" ان چند ناولوں میں البتہ ایک ایسا ناول ہے جسے پڑھ کر پڑھنے والے پر اس لئے اثر
نداز ہوتا ہے کہ اس میں خلوص کے آثار ہیں۔ مصنفہ نے یہ ناول لکھ کر جیسے اپنے دل
ں پکار پر لبیک کہا ہے اور دل کی اس پکار کو اپنی صلاحیتوں کے مطابق اس طرح مرتب
یا ہے کہ اس میں فن کی طرف سے تغافل کے آثار نہیں ملتے۔ تاہم ایک چیز جو فنی
تجربات اور نفسیاتی رجحانات کے اس دور میں بھی قابل توجہ ہے، وہ یہ ہے کہ ہماری
بعض لکھنے والیوں نے ناول کی سب سے اہم صنف سمجھ کر اس کے صرف ان عناصر پر
ور دیا ہے جن سے کہانی میں دلچسپی اور کشش پیدا ہوتی ہے ان ناولوں میں پلاٹ کی
لچسپی کو اب بھی کہانی کے فن کا سب سے اہم اور اس لئے لازمی حصہ سمجھا گیا ہے۔

ناول نویسی دلجمعی محنت اور فنی پختگی کا تقاضا کرتی ہے لیکن کچھ خواتین اس
تھکا دینے والے کام سے قطعی نہیں گھبراتیں اور وہ کئی کئی ناول لکھ کر اس صنف ادب
میں گرانقدر اضافے کرتی رہتی ہیں ایسی ہی لکھاری خواتین میں نثار عزیز بٹ کا نام بھی
نمایاں نظر آتا ہے انہوں نے اب تک جو ناول لکھے ہیں ان کا شمار معیاری ادبی ناولوں
میں ہوتا ہے لہذا انہوں نے قارئین کا اپنا حلقہ پیدا کیا ہے۔

برصغیر کا بٹوارہ اتنا بڑا حادثہ تھا کہ اس نے ہمارا سب کچھ تہہ وبالا کر کے
رکھ دیا۔ انسان دوستی اخلاقی قدریں وسیع المشربی بہیمیت کے سیلاب میں خس
خاشاک کی طرح بہہ گئے بڑے بڑے اور بلند آہنگ وعدے کرنے والے تنگ نظر
ہندو یا مسلمان بن گئے تھے کوئی دل ایسا نہ تھا جو زخم خوردہ نہ تھا ہندوستانی ہی ظالم تھا اور
ہندوستانی ہی مظلوم افراتفری اور انتشار کے ایسے دور میں عموماً تخلیقی عمل وقتی
طور پر رک جاتا ہے لیکن جب دوبارہ تخلیقی عمل کا آغاز ہوتا ہے تو نہ صرف واقعات کا
سلسلہ بلکہ لکھنے والے کے تجربات مناظر اور انداز بھی مختلف ہوتا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد ابتدائی برسوں میں اردو ناول میں زیادہ تر فسادات اور

ہجرت کا تجربہ تخلیق کا روپ دھار تا رہا ہے ظہور پاکستان سے قبل قرۃ العین حیدر حاجرہ مسرور۔ خدیجہ مستور وغیرہ فکشن لکھ رہی تھیں تاسیس پاکستان کے بعد بھی انہوں نے لکھنا جاری رکھا۔

نثار عزیز بٹ کا پہلا ناول نگری نگری پھرا مسافر 1960ء میں طبع ہوا اس ناول کی فضا علمی ہے مذہب اور مابعد الطبیعاتی مسائل پر مباحث بھی ملتے ہیں ان کا دوسرا ناول نے چراغے نے گلے ۷۳ء میں چھپا اس ناول کا عہد پہلی جنگ عظیم سے قیام پاکستان تک پھیلا ہے اور سیاسی تبدیلیوں اور پاکستانی قومیت کے ارتقاء کے زاویہ نگاہ سے یہی دور اہم ہے اس دور کے ہندوستان کو نثار عزیز بٹ نے ایک تنور سے تشبیہ دی جس میں جگہ جگہ چولہے جل رہے ہوں اس ناول میں صوبہ سرحد میں ۱۹۱۹ء سے لیکر ۱۹۴۰ء تک کے ہندو مسلم معاشرے کو تمام سماجی تبدیلیوں کے ساتھ کمال حقیقت پسندی کے ساتھ تین نسلوں کے حوالے سے منعکس کیا ہے۔

اس ناول میں صوبہ سرحد کی تہذیب تاریخی اور سیاست کا بڑی حقیقت پسندی سے جائزہ لیا ہے اس میں تین پشتوں کی کہانی ہے یہ ناول تقسیم سے قبل پچیس برس کے ہندوستان میں آباد ہندو مسلمانوں کے جذباتی رویوں کو سمجھنے کی ایک کاوش ہے۔

کاروان وجود محترمہ نثار عزیز کا تیسرا ناول ہے جو ۱۹۸۱ء میں طبع ہوا کاروان وجود مصنفہ کے ذہن کے متعدد گوشے منور کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ یہ ایک ایسے انفرادی تخلیقی جوہر کا ظہور ہے جس نے ایک منفرد روحانی بلکہ جمالیاتی حس کی صورت گری کی ہے یہ ناول برصغیر کے تناظر میں آگے بڑھتا ہے اور فنی لحاظ سے لائق ستائش ناول ہے۔

نثار عزیز بٹ کے ان تینوں ناولوں میں کہیں نہ کہیں پاکستانی ایک موڑ کے طور پر ابھرتا ہے حال ہی میں ان کا چوتھا ناول ''دریا کے سنگ'' کے عنوان سے طبع ہوا

ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ ناول ان کے فنی سفر کو کونسی نئی جہت عطا کرتا ہے۔

فکشن لکھنے والی اہل قلم خواتین میں خدیجہ مستور کا نام اہم اور نمایاں بھی ہے اردو ناول کی دنیا میں مرحومہ خدیجہ ستور اسی مقام پر فائز ہیں جو انگریزی ناول کی دنیا میں جارج ایلیٹ کو حاصل ہے جارج ایلیٹ بھی جب انیسویں صدی میں اپنا پہلا ناول لیکر منظر عام پر آئیں تو قارئین پر ان کی دھاک بیٹھ گئی تھی خدیجہ مستور نے بھی جب 1962ء میں آنگن پیش کیا تو افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کے مقام میں توسیع تو ہوئی ساتھ ہی انہیں ایک ایسے دور میں اہم ناول نگار تسلیم کیا گیا جب بہت اچھے ناولوں کی گونج فضا میں رچی بسی ہوئی تھی جن میں ''میرے بھی صنم خانے''، ''سفینہ غم دل'' اور ''آگ کا دریا'' (قرۃ العین حیدر) ''نگری نگری پھرا مسافر'' (نثار عزیز بٹ) وغیرہ شامل ہیں، ''آنگن'' کی کامیابی کا شہرہ کرداروں کے قریبی مطالعہ زندگی سے گہری وابستگی اور اس کی فنکارانہ پیشکش کی وجہ سے ہے۔

خدیجہ مستور کے ''آنگن'' کی کہانی کا تعلق ہندوستان میں رہنے والے دو گھرانوں سے ہے جو سیاسی سوچ اور عمل کے اعتبار سے مسلم لیگ اور کانگریس میں بٹے ہوئے ہیں۔ ''آنگن'' کا شمار اردو ادب کے صفِ اول کے ناولوں میں ہوتا ہے۔ اس ناول میں تاریخ کے سیاسی حوالوں کے ساتھ زوال آمادہ تہذیب، برصغیر کا انحطاط پذیر معاشرہ اقتصادی نظام اور تہذیبی بساط پر متوسط طبقے کے مسلم گھرانوں کی اہمیت کی ترجمانی کی ہے، اس طرح خدیجہ مستور کا ''آنگن'' پاک و ہند کے ہر گھر کے آنگن کی علامت بن جاتا ہے۔

زبان اور اسلوب کے اعتبار سے بھی یہ ایک معیاری ناول ہے جو تقسیم ہند کی بربریت کو بے نقاب کرتا ہے۔ خدیجہ مستور نے آنگن میں دو خاندانوں کے جو کہ مسلم لیگ اور کانگریس کے الگ الگ حامی ہیں ایک دوسرے کے مدمقابل دکھایا ہے۔ ان کی موضوعاتی کامیابی یہ ہے کہ دونوں گھرانوں کے کرداروں کے درمیان آویزش

کے ساتھ ساتھ قیام پاکستان کی تحریک کو غیر پروپیگنڈیائی انداز سے آشکار کیا ہے اور اسے وہاں لا کر ختم کیا ہے جہاں آدرش کے ٹوٹنے اور اعلیٰ اقدار کی مٹی پلید ہوتے دکھایا گیا ہے۔ یہاں ایک گہری مایوسی اور سماجی، معاشی اور تہذیبی المیوں کی پرچھائیں صاف طور پر نظر آجاتی ہیں۔

خدیجہ مستور نے اسی موضوع کو قدرے پھیلا کر سیاسی و سماجی اقدار کی تصویر کشی اپنے دوسرے ناول ''زمین'' میں کی ہے۔ اس طرح فسادات، تقسیم وطن، مادیت پرستی، کے فروغ، اقتدار کی اتھل پتھل اور آدرشوں کی شکستگی کے جو موضوعات آزادی کے بعد کے ناولوں میں در آئے تھے وہ اب دوسرے موضوعات میں ڈھلنے لگے۔

خدیجہ مستور کا ''آنگن'' بنیادی طور پر ایک موضوعاتی اور اجتماعی ناول ہے جس میں ایک خاص دور کے ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور اقتصادی صورتحال اور قیام پاکستان اور اس کے متعلق مختلف نقطہ ہائے نظر کو پیش کیا گیا ہے۔

خدیجہ مستور نے مختلف اور متنوع کرداروں اور واقعات کے حوالے سے ایک پورے عہد کی تاریخ مرتب کر دی ہے۔

کوئی بھی ناول ہو اپنے معاشرے کی سچی تخلیق ہوتا ہے اگر کوئی ناول زندگی کا سچا شعور نہ دے وہ کچھ لوگوں کی پسند تو بن سکتا ہے جو رومانی مزاج کے حامل ہوں لیکن زندگی کو حقیقت سمجھنے والوں کے لیے دلچسپی کا باعث نہ ہوگا۔ ''آنگن'' میں خدیجہ مستور کا شعور بھی پُر مغز ہے۔ اور بالخصوص آنگن کی زبان میں اس عہد کے تمام لسانی رویے موجود ہیں۔

تقسیم اور اس کے بعد کے واقعات نے اردو ناول نگاروں کے فکر و فن کو بھی مہمیز لگائی ہے اور اس نسل کے ان لوگوں کو تقسیم کے بعد کے کئی ناولوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔

خدیجہ مستور کے ناول ''آنگن'' کے خاموش ہنگامے بھی ان کی وجہ سے ہیں۔ ''آنگن'' کو اردو ناول کی تاریخ میں منفرد حیثیت بخشنے والی اس کی یہی ایک خصوصیت ہے یہ ناول اسم با مسمیٰ ہے، اس ناول میں نہ صرف جدوجہد آزادی کو پیش کیا گیا ہے بلکہ تمام قومی اور اہم ترین بین الاقوامی مسائل کی گونج بھی ''آنگن'' میں سنائی دیتی ہے۔ زندگی اور زندگی کی ساری گہما گہمی اور اس کے سارے ارتعاشات ''آنگن'' ہی میں محسوس ہوتے ہیں۔

''آنگن'' میں آنگن سے باہر کے واقعات کو پیش کرنے میں خدیجہ مستور نے فنکارانہ کمال دکھایا ہے دوسری جنگ عظیم میں ہیروشیما اور ناگاساکی پر جو بم گرتا ہے اس کا دھماکا آنگن میں سنائی دیتا ہے۔

علاوہ ازیں کانگریس اور لیگ کی کشمکش ''آنگن'' میں باپ اور بیٹے کے نظریاتی اختلافات میں پوری تکمیل کے ساتھ نمایاں ہوتی ہے۔ ایک متوسط مسلم گھرانہ کی زندگی کو پیش کرتے ہوئے جدوجہد آزادی، ملک اور بیرون ملک کے سارے واقعات کو صرف ''آنگن'' کی چاردیواری میں پیش کر دینے میں ناول نگاری کا سلیقہ اپنے کمال پر نظر آتا ہے اور پھر فسادات کے خونچکاں واقعات اور آزادی کے بعد متاثرین کے دگرگوں مسائل اور مصائب کو بھی اس ناول میں بڑے اثر انگیز طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔

یوں موجودہ پاکستان معاشرے کے لیے ایک بلیغ استعارہ بن جاتا ہے۔ ناول ''آنگن'' ہمعصر زندگی کے ایک اہم مسئلے سے شدید آگاہی پر ختم ہوتا ہے۔ فکری و فنی اعتبار سے اس ناول کی بڑی اہمیت ہے۔

''زمین'' خدیجہ مستور کا دوسرا اور آخری ناول ہے۔ یہ ناول خدیجہ مستور کے انتقال کے بعد 1984ء میں طبع ہوا۔

''زمین'' کی کہانی کی ابتدا برصغیر کی تقسیم کے بعد پورے پاکستان میں

مہاجرین کے ایک کیمپ سے ہوتی ہے۔ جس میں ہزاروں مہاجرین کے ساتھ ساجدہ نام کی ایک لڑکی اپنے ضعیف العمر اور بیمار باپ کے ساتھ مقیم ہے، ایک دن کیمپ ہی میں ساجدہ کے والد کا انتقال ہو جاتا ہے اور وہ دنیا میں اکیلی رہ جاتی ہے۔

''زمین'' میں بھی سیاسی، سماجی اور معاشرتی زندگی کی جھلک موجود ہے۔ لیکن سیاسی زندگی کے حوالے اس انداز سے نہیں آئے جس طرح ''آنگن'' میں آئے تھے ''آنگن'' میں سیاست کرداروں کی ذات کا اہم حصہ تھی لیکن زمین میں صرف بیانات والی صورت دکھائی دیتی ہے جو اکثر مقامات پر کہانی کے نمونہ میں جذب نہیں ہو پاتی البتہ مادیت پرستی اور ریاکاری کی منفی قدروں کو خوب اجاگر کیا گیا ہے، لیکن کہانی میں ایک ہی جیسے واقعات کا بہت اعادہ ہے۔

چنانچہ ''آنگن'' کی طرح شروع سے آخر تک قاری کی دلچسپی برقرار نہیں رہتی جس کی وجہ سے بہت حد تک یہ ہے کہ اس ناول میں خدیجہ مستور نے کردار نگاری پر بہت زیادہ توجہ نہیں دی اور کرداروں کی انفرادیت میں ناکام رہیں۔

''زمین'' کی زبان ''آنگن'' کی طرح صاف ستھری اور حقیقت پسندانہ ہے، تشبیہ واستعارے بھی وہی استعمال ہوئے ہیں جو ''آنگن'' میں استعمال کیے جا چکے ہیں۔ بحیثیت مجموعی یہ ناول ''آنگن'' کی طرح دلچسپی برقرار رکھنے اور اپنا اثر قائم رکھنے میں ناکام ہے۔ لیکن اس میں خدیجہ مستور کے مرتبے پر زد نہیں پڑتی تاہم ان دونوں ناولوں کے جائزے سے یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ خدیجہ مستور اردو ناول کی دنیا میں یادگار فکشن نگار کی حیثیت سے زندہ رہیں گی۔

الطاف فاطمہ کا ناول ''چلتا مسافر'' اور رضیہ فصیح احمد کا ناول ''صدیوں کی زنجیر'' دونوں مشرقی پاکستان کے سقوط اور بنگلہ دیش کے قیام کے سیاسی وسماجی محرکات سے بحث کرتے ہیں، ''چلتا مسافر'' ایک ایسے بہاری کنبے کی کہانی ہے جو بہار میں تحریک پاکستان کے لیے کام کرتا ہے اور نئی بہار کی تلاش میں (سابق)

مشرقی پاکستان کی دھرتی میں اپنی جڑیں پیوست کرتا ہے تاکہ نئے وطن کی فضا میں اپنی خوشبو بھی شامل کر سکے، لیکن وہ وہاں پاکستانی بن کر نہیں رہ سکتا وہ تو ''لی ہارتی'' ہے اس طرح اردو سپیکنگ ہے تو کوئی (پنز آتی) ہے۔

مشرقی پاکستان کا المیہ ایک بے حد جذباتی موضوع ہے مگر الطاف فاطمہ نے اسے نہایت غیر جذباتی ہو کر لکھا ہے چنانچہ کسی طرح کی طنز یا دشنام طرازی کے بغیر انہوں نے تعصب، خوف اور نفرت کی اس فضا کی معروضی تصویر کشی ہے۔ جس نے ان سب کو ایک پیار بھرا کنبہ بنانے کے برعکس بھان متی کے کنبہ میں تبدیل کر دیا لیکن بنگلہ دیش بننے میں بہاریوں نے جو، جور سہے اس کی تصویر الطاف فاطمہ نے مزمل اور اس کے کنبہ کے حوالے سے بیان کی ہے۔

''چلتا مسافر'' کا کینوس تاریخی اعتبار سے نسبتاً چھوٹا مگر ملکوں کی تقسیم سیاسی و سماجی پہلوؤں اور انسانی المیوں کے ظہور اور ہجرت کے کرب کے حوالوں سے بڑے زاویوں کا احاطہ کرتا ہے۔

تقریباً اسی موضوع کو رضیہ فصیح احمد نے بڑے کینوس پر برتتے ہوئے تاریخ کے بڑے حصہ کا احاطہ کیا ہے، المیہ مشرقی پاکستان کے پس منظر 1971ء میں لکھا گیا۔ رضیہ فصیح احمد کا ناول ''صدیوں کی زنجیر'' انگلیوں پر گنے جانے والے اردو ناولوں میں یقیناً ایک اہم اضافہ ہے۔

رضیہ فصیح احمد کا ناول ''اک جہاں اور بھی ہے'' کا موضوع یقیناً ہمارے مخصوص سماجی حالات کی نشاندہی کرتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں جو ناہمواریاں ہیں ان کی وجہ سے ہمارے ملک کی عورت کو ان گنت مسائل اور مصائب سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ''اک جہاں اور بھی ہے'' کا مرکزی کردار نیلم بھی ایک ایسی ہی عورت ہے جو سماجی اور معاشرتی ناہمواریوں کا حدف بن گئی ہے۔

لیکن ''چلتا مسافر'' کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ ہم دونوں

ناولوں کو موضوعاتی حوالے سے انہی ناولوں کی فہرست میں رکھ سکتے ہیں جن کا تعلق تقسیم ہند سے متعلقہ انسانی المیہ سے ہے یعنی سیاسی اتھل پتھل کے بطن سے فسادات کا پھوٹ پڑنا، انسان کا انسان سے بربریت والا سلوک کرنا، ہزاروں لاکھوں انسانی جانوں کا ضیاع، ہجرت اور پھر نا سلجھائی کرب، ساتھ ہی نئی منفی اقدار کی تشکیل اور نئی مٹی میں اپنی پرانی جڑوں کا اتصال کرنا۔ مگر مشرقی پاکستان کے سقوط کے اپنے مخصوص پس منظر میں یہ دونوں ایک دوسری کہانی بھی سناتے ہیں اور اس کہانی کا تعلق ہجرت اندر ہجرت اور المیہ اندر المیہ ہے۔ الطاف فاطمہ اور رضیہ فصیح احمد نے بڑی خوبی سے المیہ کو ابھارا ہے جسے پاکستانی قوم شاید ہی کبھی فراموش کر پائے۔

مشرقی پاکستان کے المیہ کے موضوع پر سلمہ اعوان کا ناول ''تنہا'' بھی رونگٹے کھڑے کر دینے والی تحریر ہے اور لاثانی اور اسلوبیاتی انفرادیت کا حامل ناول ہے ''صدیوں کی زنجیر'' کے علاوہ رضیہ فصیح احمد کے دیگر پانچ ناول ''آبلہ پا''، ''انتظارِ موسمِ گل''، ''متاعِ درد''، ''آزادِ عشق'' اور ''ایک جہاں اور بھی ہے'' منظر عام پر آچکے ہیں۔ ''آبلہ پا'' پر مصنفہ کو 1964ء کا آدم جی ادبی ایوارڈ مل چکا ہے۔

مگر دراصل یہ ناول سے زیادہ سفر نامہ ہے تاہم یہ ایک سفر نامہ کی سی عمدہ اور جاندار خارجی عکاسی کی خوبصورت مثال ضرور فراہم کرتا ہے۔

الطاف فاطمہ کا ناول ''دستک نہ دو'' انسانی تعلقات کے دلچسپ مطالعہ کے لحاظ سے قابل ذکر ہے۔ الطاف فاطمہ نے رومانی بنے بغیر ہی زندگی کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اور حقیقت نگاری کے ہر معیار پر یہ ناول پورا اترتا ہے۔ بیشتر خاتون ناول نگاروں میں جو ایک خاص نوکی جذباتیت ملتی ہے الطاف فاطمہ اس سے شعوری طور پر دامن بچاتی ہے۔

سلمہ اعوان کا ''پھول نہ ہوں پامال'' اور نشاط فاطمہ کا ''آنسو جو بہہ نہ

سکے" عمدہ اور دلچسپ ناول ہیں۔ گذشتہ برسوں کے دوران چھپنے والے ناولوں میں یہ ایسے ناول ہیں جن میں فنی محاسن کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

اردو فکشن کے میدان میں عطیہ سیّد بہترین تخلیقی صلاحیتیں رکھتی ہیں۔ ان کا ناول "غبار" کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے یہ ناول ان کی فنی مہارت اور مخصوص ادبی جمالیات کا منظر ہے۔

آج کے دور میں ناول نگاری کا فن نئے نئے تجربوں سے گزر کر دن بدن نکھرتا جارہا ہے اس میں پختگی بھی آتی جارہی ہے۔ یہ پختگی ایک طرف فنی لحاظ سے بلند معیار قائم کرتی ہے تو دوسری طرف فکری لحاظ سے بھی ماضی اور حال کے تقریباً سارے ہی اہم فلسفوں سے اپنا تارو پود ہاتی چلتی ہے۔

فنی تجربات کے اسی عبوری دور سے جمیلہ ہاشمی کا بھی واسطہ رہا ہے۔ "دشتِ سوس" میں جمیلہ ہاشمی نے حسین بن منصور حلاج جیسی متنازع فیہ شخصیت کو اپنا موضوع بنا کر اس کے نعرہ "انا الحق" کی جذباتی تفسیر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ موضوع بے حد مشکل تھا اور خطرناک بھی مگر جمیلہ ہاشمی نے بڑی کامیابی سے حلاج کی شخصیت کی تصویر کشی کی ہے۔ مصنفہ نے ریسرچ سے اس عہد کی مخصوص فضا کو بھی زندہ کر دیا ہے۔ اور اس سلسلے میں ان کی جذباتی اور کسی حد تک مقرب نثر بھی بے کار آمد ثابت ہوئی ہے۔ اس ناول کا ایک وصف اس کا خوبصورت انداز بیان بھی ہے۔

یوں تو جمیلہ ہاشمی کے متعدد ناول طبع ہو چکے ہیں ان کے دو ناولوں "تلاشِ بہاراں" اور "آتشِ رفتہ" کو نسبتاً زیادہ پذیرائی حاصل ہوئی۔ "تلاشِ بہاراں" میں جمیلہ ہاشمی کا زاویہ نظر سراسر رومانی ہے انہوں نے زندگی کا مشاہدہ بلندی سے یا بہت فاصلہ سے کیا ہے اور رومانی انداز ہی میں پیش کیا ہے۔ اس لیے ناول کا سارا حسن اس کے انداز بیان ہی میں دکھائی دیتا ہے۔

"تلاشِ بہاراں" پر 1961ء میں مصنفہ کو آدم جی انعام بھی ملا۔ جمیلہ

ہاشمی کا ناول ''آتشِ رفتہ'' 1964ء میں طبع ہوا۔ فنی اعتبار سے ''تلاشِ بہاراں'' کے مقابلے میں زیادہ بہتر اور کامیاب ہے اس ناول میں سکھوں کی زندگی ان کے رسم و رواج اور ان کی روایات کو فنکارانہ چابکدستی سے پیش کیا گیا ہے۔

جمیلہ ہاشمی کے دیگر ناولوں میں ''روہی'' اور ''چہرہ بچہرہ روبرو'' شامل ہیں۔ ''چہرہ بچہرہ روبرو'' کا موضوع ایران کی متنازع شخصیت قرۃ العین طاہرہ ہے۔ اس ناول میں تاریخ صرف پس منظر کا کام ہی دیتی ہے۔ تاہم مصنفہ نے اس عہد کی فضا کو از سر نو زندہ کرنے کی سعی کی ہے۔

معروف افسانہ نگار عطیہ سید کا اولین ناول ''غبار'' کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔ ''غبار'' عطیہ سید کی فنی مہارت اور مخصوص ادبی جمالیات کا مظہر ہے۔ اس ناول میں ایک ایسے موضوع کا نفسیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے جس کے بارے میں ہمارے ہاں خاموشی جھجک یا گریز کا رویہ پایا جاتا ہے۔ اس نوعیت کے نازک موضوع پر عطیہ سید نے سلیقے، خوبصورتی اور فنی چابکدستی سے قلم اٹھایا ہے۔

فکشن میں کسی خاتون لکھاری کا سنجیدہ حلقوں میں قابلِ ذکر ٹھہرنا اب اتنا مشکل نہیں رہا جتنا حجاب امتیاز علی، قرۃ العین حیدر، خدیجہ مستور، بانو قدسیہ اور حاجرہ مسرور کی شہرت سے پہلے تھا۔

رشیدہ رضویہ فکشن میں ایک خاص اسلوب اور ایک خاص پس منظر میں اجاگر کرنے کے لیے مشہور ہیں۔ ان کے مندرجہ ذیل ناول ''لڑکی ایک دل کے ویرانے میں'' 1967ء ''اس شمع کے آخری پروانے'' 1970ء اور ''گھر میرا راستے غم کے'' 1971ء میں طبع ہو چکے ہیں۔ ان میں سے ''گھر میرا اور راستے غم کے'' قابلِ توجہ ہیں۔ جس میں اساطیر سے لیکر جدید عہد تک کی زندگی کے حوادث قلم بند کرنے کا تجربہ کیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر رشیدہ رضویہ نے اردو فکشن میں ایک خاص مقام حاصل کر لیا ہے۔

فرخندہ لودھی کا ناول ''حسرتِ عرضِ تمنا'' پہلی مرتبہ جنوری 1969ء اور دوسری مرتبہ 1992ء میں شائع ہوا۔ یہ ایک کیفیاتی اور اسلوب کے اعتبار سے منفرد اہمیت کا حامل ہے۔ یہ تین حصوں پر مشتمل ہے۔

دھیان

گیان

نروان

فرخندہ لودھی نے اس ناول میں زندگی کی جو عکاسی کی ہے اس میں اپنے فلسفہ حیات کو بھی شامل کر لیا ہے۔ یہ ان کا پہلا ناول ہے۔ اس سے ان کی راہیں متعین ہو گئی ہیں۔ ناول کا آخری حصہ نروان ہے۔ زیادہ المیہ اور زیادہ موثر ہے۔ اس حصہ میں فرخندہ لودھی نے فنکاری کے خوب جوہر دکھائے ہیں۔

بانو قدسیہ پہلو دار شخصیت ہیں۔ اور ان کی شخصیت کے ہر پہلو کا تعلق فکشن کے ساتھ ہے۔ ان کا ناول راجہ گدھ اردو ناول میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے ۔ جسے علمی و ادبی حلقوں میں خاصا پسند کیا گیا ہے۔ مکانی حوالوں سے مشرق و مغرب کے منظر نامے پر پھیلا ہوا یہ ناول وقت کے تین دورانیوں سے گذرتا ہوا حیات سے موت کا سفر طے کرتا ہے۔

اس ناول میں مصنفہ نے مردار خور گدھ کو معاصر زندگی کے ان افراد کا استعارہ بنایا ہے جو اپنا مردانہ پندار تج کر جب شخصی اَنا سے محروم ہو جاتا ہے تو پھر زوال ان کا مقدر قرار پاتا ہے، یہ زوال کردار کا بھی ہے۔ مقصد حیات کا بھی اور نفسی توانائیوں کا بھی۔

بانو قدسیہ اپنے افکار وخیالات میں بھی اپنا ایک مخصوص انفرادی رنگ رکھتی ہے جو اکثر اوقات چونکا دینے کی حد تک دوسروں سے مختلف ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے اس ناول میں بانو قدسیہ نے اپنے سماجی معاشرتی اور مذہبی تصورات کو پوری طرح سمو

دیا ہے۔

لہذا ''راجہ گدھ'' کو بانو قدسیہ کی تخلیقی زندگی کی معراج کہا جا سکتا ہے۔
بانو قدسیہ کے ناولٹس کا مجموعہ ''چہار چمن'' کے عنوان سے طبع ہو چکا ہے، جس میں مختلف عنوانات سے چار ناولٹس ''موم کی گلیاں''، ''پرواہ''، ''ایک دن'' اور ''شہرِ بے مثال'' ہیں۔

مرحب قاسمی کا شمار سندھی اور اردو میں یکساں روانی کے ساتھ لکھنے والی خواتین میں ہوتا ہے۔ 1988ء میں ان کا سندھی ماحول میں لکھا ہوا اردو کا پہلا ناول ''کرچیوں میں عکس'' شائع ہوا۔

اگرچہ کہانی بنیادی طور پر جاگیردارانہ نظام کے گرد گھومتی ہے۔ لیکن ناول کا کینوس اس قدر وسیع ہے کہ اس میں ہر طبقے کی زندگی کی جھلکیاں موجود ہیں۔ مصنفہ اپنے خیالات اور جذبات کو اس بے باکی سے لاگ لپٹ کے بغیر بیان کرتی ہیں کہ قاری ان کے خلوص اور سچائی کو شدت سے محسوس کرتا ہے۔ یہی خصوصیت اس ناول کو روایتی ناولوں سے الگ کرتی ہے۔

مرحب قاسمی کا ناول ''کرچیوں میں عکس'' اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ اردو میں یہ پہلا ناول ہے جو آج کے سندھ کے ماحول کی عکاسی کرتا ہے۔
محمد عالم خاں کی رائے کے مطابق ''کرچیوں میں عکس'' کا مطالعہ محض کسی داستان کا مطالعہ نہیں بلکہ ایک سماج کو مخصوص اندازِ نظر سے دیکھنے کی شعوری کاوش ہے اور یہ اندازِ نظر شاید مرحب قاسمی کا ہی ہو سکتا ہے کہ جس کے پاس نہ صرف جدتِ فکر ہے، اظہار کی سچائی ہے اور سادگی فن ہے۔ بلکہ ان کے ہاں بوجھل اور ثقیل الفاظ و تراکیب کی بھرمار بھی نہیں ہے۔ وہ تو صرف حقائق لکھتی ہیں نہایت ٹھوس انداز میں سلیقے اور فن چابکدستی کے ساتھ اور یوں لگتا ہے کہ مرحب قاسمی ناول نگاری میں اس روایت سے متاثر ہیں۔ جس میں اظہار اور اس کی سچائی بنیادی

عناصر کی ہیئت رکھتے ہیں۔ یوں اس ناول میں بڑے ناولوں کی خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں۔

ڈاکٹر فردوس جہاں قاضی کا ضخیم ناول ''خوابوں کی بستی'' کے عنوان سے 1990ء میں طبع ہوا۔ یہ ناول سیاسی پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ لیکن اس ناول میں اردو ناول نگاری کو نئے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یعنی سیاست کو کہانی کا روپ دیا گیا ہے۔

ٹیلی ویژن کی نامور ڈرامہ نویس حسینہ معین کا ناول ''پل صراط کا سفر'' 1991ء میں طبع ہوا۔

اردو کی معروف اور منفرد ادیبہ گوہر سلطانہ عظمیٰ کا ناول ''دار و رسن کے بعد'' طبع ہو چکا ہے۔

اردو فکشن لکھنے والی خواتین میں سیدہ حنا کی آواز اور مقام سب سے جدا لیکن منفرد ہے۔ ان کی سوچ دیگر اہل قلم خواتین سے مختلف ہے۔ ''وہ دن وہ راتیں'' کے عنوان سے 1961ء میں ان کا ناول طبع ہوا تو ادبی حلقوں میں خاصی پذیرائی ملی۔ ناول کی زبان سادہ اور رواں دواں ہے۔ موٹی موٹی بے جوڑ ترکیبیں اور ثقیل الفاظ یوں بھی کہانی کا حصہ نہیں بنتے۔ سیدہ حنا کو اس بات کا احساس ہے چنانچہ ''وہ دن وہ راتیں'' میں انہوں نے اپنی نثر کو غیر معمولی طور پر سنوارا اور نکھارا ہے۔ مجموعی طور پر ''وہ دن وہ راتیں'' اس معیار کا ناول ہے کہ اسے اردو ادب میں ایک اہم افسانہ کہا جا سکے۔

عذرا اصغر بنیادی طور پر اردو افسانے کے حوالے سے اپنی مضبوط پہچان رکھتی ہیں۔ لیکن ان میں ایک کامیاب ناول نویس کی صلاحیتیں بھی موجود ہیں۔ ''دل کے رشتے'' بلا مبالغہ عذرا اصغر ناول نویسی کا ایک کامیاب انداز ہے۔ ان کا یہ ناول پہلی بار 1970ء میں طبع ہوا اور دوسری بار 1990ء میں مقبول اکیڈمی لاہور نے

چھاپا۔

فردوس حیدر اردو کی خواتین ناول نگاروں کے درمیان ایک ایسا نام ہے جن کی فنی سمجھ بوجھ، گہرا مشاہدہ اور مختلف حالتوں میں انسانی زندگی پر مرتسم ہونے والے اثرات کو مدنظر رکھ کر ان پر غور و خوض کر کے انہیں اپنے فن میں سمو لینے کا ڈھنگ بہت سادہ لیکن پرکار ہے۔ ان کے ہاں ٹھہراؤ بھی ہے اور گہرائی بھی اور گیرائی بھی۔ فردوس حیدر نے یکے بعد دیگرے کئی اچھے ناول ایک مختصر سے عرصے میں اردو ادب کو دیے ہیں جن میں

''پیار کا ساگر''

''نقشِ قدم''

''رازداں'' اور

''مردم گزیدہ'' شامل ہیں۔ ان تمام ناولوں میں مصنفہ نے کسی نہ کسی سماجی مسئلے کو پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

1960ء کی دہائی سے لیکر اب تک ناول کے افق پر ہمارے ہاں جو ناول نگار سامنے آئی ان میں محترمہ بشریٰ رحمٰن بھی شامل ہیں۔ اب تک بشریٰ رحمٰن کے جو ناول منظر عام پر آئے ہیں ان میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں۔

''چارہ گر''

''لازوال''

''پیاسی''

''خوبصورت'' اور

''لگن''

چنانچہ ان ناولوں کے مطالعے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بشریٰ رحمٰن نے نہ صرف تعداد بلکہ معیار کے اعتبار سے بھی اردو ادب میں خوبصورت اضافے کیے

ہیں۔

زیتون بانو عصر حاضر کی ایک منفرد ادیبہ ہیں ان کے تخلیقی رویئے یکسر حقیقت سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ ان کا ناول ''ڈھول'' کے عنوان سے 1984ء میں طبع ہوا۔ منفرد اسلوب کا حامل یہ ناول صوبہ سرحد کے غیور اور جفاکش باشندوں کی معاشرتی اور سماجی زندگی کا عکس نما ہے۔

اردو فکشن لکھنے والی جانی پہچانی ادیبہ محترمہ زینت قاضی لگ بھگ نصف صدی میں انتقال کر گئیں، ان کی زندگی میں ان کا ناول ''باصرہ'' کے نام سے چھپا تھا جسے ادبی حلقوں میں خاصی پذیرائی ملی۔

''آندھی'' کے نام سے نسرین قریشی کا ناول شائع ہو چکا ہے۔ نسرین قریشی نے کہانی کا تانا بانا ایسے خوبصورت انداز میں اس طرح بُنا ہے کہ قاری کی دلچسپی برقرار رہتی ہے اور انداز بیان بھی دلچسپ ہے۔ رضیہ بٹ ایک مدت سے ناول لکھ رہی ہیں اور کثیر التصانیف اہل قلم خواتین میں نمایاں ہیں۔ مگر یہ قلم کار کے لیے بے حد مضر ثابت ہوتا ہے۔ ایک نتیجہ تو بسیار نویسی اور زود نویسی ہے جس کے نقصانات آشکار ہیں۔ پڑھنے والوں کی تعداد سے کسی مصنف کی عظمت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا، عوام کی پسند کو پسند کا معیار نہیں ٹھرایا جا سکتا۔

47ء میں تقسیم وطن کے رد عمل کے طور پر برپا ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات ابھی کل ہی کی بات لگتے ہیں، ان فسادات میں آدمی اپنی انسانیت فراموش کر کے خونخوار درندہ بن گیا تھا ان فسادات کی عکاسی میں جہاں اردو کا مختصر افسانہ پیش پیش رہا ہے وہاں ناول نے بھی اسے گرفت میں لینے کی کوشش کی ویسے یہ دوسری بات ہے خود ناول نگاروں کے ذہن صاف نہ ہونے کی وجہ سے وہ ہندوستانی قوم کے اتنے بڑے تجربے کو اپنے فن میں ڈھنگ سے سمو نہ سکے لیکن وہ اپنا مافی الضمیر بیان کرنے میں قطعی ناکام نہیں رہے ہیں۔

بہر صورت 1947ء سے لیکر اس جدید دور 1999ء تک کے ناول کی تخلیقی سر گرمیوں میں تیزی آئی اور ناولوں کے مختلف النوع موضوعات میں اتنا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ ہماری ناول نگار خواتین نے ہیئت، اسلوب اور تکنیک کی بلندیوں سے قطع نظر ایسے ایسے موضوعات کو ناول کے ماجرے کا حصہ بنانے کی سیاسی، تہذیبی، تاریخی، معاشرتی، معاشی، سماجی اور اخلاقی اقدار کی داستان مرتب کر کے پیش کر سکتا ہے۔

منفرد انداز و بیان اور خوبصورت لہجہ کی نیوز کاسٹر ثریا شہابؔ یقیناً کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں۔ موصوفہ ایران اور پاکستان کے ریڈیو اور ٹیلیویژن کے علاوہ BBC لندن کی اردو سروس سے ریڈیو وائس آف جرمنی تک جا پہنچیں، پاکستان سے ان کا سفر تمام نہیں ہوا پاکستان سے ان کا ناول ''سفر جاری ہے'' کے عنوان سے چھپ چکا ہے۔ یہ ناول ثریا شہابؔ کی زندگی بھر کی جدوجہد اور مشاہدات سے عبارت ہے۔ اس ناول کی مصنفہ نے ستر کی دہائی میں ان حالات کو محسوس کر لیا تھا جنہیں ناول میں بیان کر دیا ہے۔ یہ ناول ہمارے گذشتہ پچاس برسوں کی کہانی ہے۔

اختر جمال کا نام اردو فکشن میں غیر معروف نہیں ہے ان کا ناول ''پھول اور بارود'' طبع ہو چکا ہے جو اچھے ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس ناول میں ترقی پسند نظریہ حیات کو شائستگی سے پیش کیا گیا ہے۔

بلقیس ریاض کے ناول ''مہوش'' اور ''دام سحر'' آمنہ اقبال کا ''اک لڑکی چھوٹی سی'' جبکہ سلمہ اعوان کے دو ناول ''شیبہ'' اور ''زرغونہ'' کے علاوہ ناز کفیل گیلانی کے مندرجہ ذیل رومانی اور اصلاحی ناول چھپ چکے ہیں۔

''کھڑی نیم کے نیچے''

''من دیپ پتنگا راکھ''

''گھر جلائے سات میں''

''دوسرا جنم''

''زہرِ امرت''

''کیوں روئے شہنائی''

''من کے نین ہزار''

''گر گئی ہندیا''

''طور جلنے لگا''

''پوجا پریت ہماری'' اور

''بہک گئے فرشتے''

جبکہ اردو اور پنجابی کی معروف لکھاری کہکشاں ملک کا ناول بھی ''اک شخص شناسا'' کے عنوان سے چھپ چکا ہے۔

# ناولٹ

ناولٹ : بجائے خود ناولٹ کی تکنیک بہت منفرد و ممتاز نہیں یہ عموی طور پر طویل افسانہ اور ناول کے درمیان کی ایک ہیئت ہے اس کو ایک مستقل بالذات صنف بنانے والے اوصاف بہت کم ہیں اور جو کچھ ہیں نوعیت کے لحاظ سے نہیں مقدار کی بناء پر ہیں۔

افسانہ جب بہت طویل ہو جاتا ہے پھر بھی مکمل ناول کے حجم تک نہیں پہنچتا تو اس کو ناولٹ کہہ دیا جاتا ہے یعنی یہ ایک مختصر ناول ہے۔ رہی بات یہ کہ کسی مواد یا موضوع کے اندر مکمل ناول بننے کی صلاحیت نہیں ہوتی تو اسے مختصر ناول یا ناولٹ کے سانچے میں ڈھالنا پڑتا ہے، تو اس سلسلے میں کوئی قطعی بیان دشوار ہے۔ مواد کی نسبت سے ہیت کے سانچے کا تعین بہت مشکل ہے۔ بعض فنکار یا ناقد اگر اس معاملے میں

کوئی دعوے کرتے ہیں تو وہ دراصل صرف اپنی رائے پر اصرار کرتے ہیں۔ جبکہ ان کے پاس کوئی صریح دلیل نہیں ہے۔ ایسی رائے سے اختلاف بہت آسان ہے اور اس موضوع پر بحث کی کافی گنجائش ہے۔

قرۃالعین حیدر کے فنی ارتقاء میں یہ نقطہ قابلِ غور ہے کہ انہوں نے افسانہ، طویل افسانہ، ناولٹ اور ناول کی ترتیب سے فنکاری نہیں کی ہے بلکہ ان کے ناولٹ، ناولوں کے بعد بھی لکھے گئے ہیں۔ رہا یہ سوال کہ انہوں نے بعض اہم اور پیچیدہ موضوعات پر ناول کی بجائے ناولٹ کیوں لکھا؟

تو اس کا جواب خود مصنفہ جو بھی دیں تاہم اس سلسلے میں کسی تنظیم اور منصوبہ بندی کو دخل نہیں ہے، انہوں نے بس بعض موضوعات پر اپنے تجربات رقم کیے ہیں یا تصنیفی تحریک انہیں جس حد تک لے گئی وہ اس حد تک چلی گئیں اور جہاں جذبہ تخلیق سرد پڑنے لگا انہوں نے وہیں قلم رکھ دیا پھر تخلیق کا حجم دیکھ کر اسے ناولٹ (چھوٹا سا ناول) قرار دے دیا۔

ممکن ہے بعض لوگ اس تشریح کو ارتجالِ فن کے نقطہ نظر پر محمول تصور کریں لیکن اس کے سوا کوئی بہت منطقی بات سمجھ میں نہیں آتی۔

قرۃالعین حیدر کا پہلا ناولٹ ''دلربا'' ہے۔ یہ مٹتے ہوئے جاگیردارانہ سماج کی داستان ہے۔ ناولٹ کے واقعات میں اہمیت ''دلربا'' کے کردار کی نہیں بلکہ اس سے دو نسلیں اوپر گلنار کے کردار کی ہے۔ جس کی آویزش کبھی ''دلربا'' کے خاندان سے اس کے دور خوشحالی میں ہوئی تھی اور وہ شرفاء کہلانے والوں کے ہاتھوں اپنی توہین کا بدلہ لینے کی کسر لگائے ہوئے تھی۔

قرۃالعین حیدر کا دوسرا ناولٹ ''سیتاہرن'' نئی عورت کا المیہ ہے جو ہندوستان کی تہلکہ خیز حالات میں رونما ہوا ہے۔ ڈاکٹر سیتا میر چندانی ایک جدید تعلیم یافتہ سندھی ہندو ریفیوجی خاتون ہیں، جو گویا اپنے وقت کی علامتی سیتا ہیں

اور زندگی کی لڑائی ہار گئی ہیں۔ زمانے کے رویوں کے ہاتھ لگ گئی ہیں جن میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ انہیں تقسیم ہند کی سرحد کے دونوں طرف قرار کہیں نہیں، نہ ہندوستان میں نہ پاکستان میں۔ نہ ہندو معاشرہ ان کو راس آتا ہے نہ مسلم معاشرہ۔ مجموعی طور سے یہ ناولٹ ایک زبردست تمدنی مرقع ہے۔ اور ہندوستان کے تناظر کی وجہ سے جدید تہذیب میں ہندوستانی عورت کی بے کسی، بے راہ روی اور بے بسی کی ویسی ہی بلکہ اس سے بھی زیادہ المناک داستان ہے جیسی اطالوی ناول نگار البرٹو موراویا نے "The Woman of Rome" میں پیش کیا ہے۔ لیکن ''چائے کے باغ'' تک کا قرۃ العین حیدر کے فن کا یہ سفر ہمعصر اردو ناول کو نئے امکانات اور نئے تجربات سے روشناس کرتا ہے۔

زندگی کی تبدیلیوں کو ہندوستان کے تاریخی پس منظر میں رکھ کر دیکھنے اور دکھانے کی کوشش بڑے ہی وسیع پیمانے پر ''آگ کا دریا'' میں کی گئی ہے تو ہمعصر اردو ناول نگاری میں ''چائے کے باغ'' کو منفرد اور امتیازی مقام حاصل ہے اور اردو میں ہمعصر ناول کی نمائندگی ''چائے کے باغ'' سے کی جا سکتی ہے۔ موجودہ زمانے کے مسائل اور ان مسائل کے نتیجے میں پیدا ہونے والی سماجی اور اخلاقی تبدیلیاں اس میں بہتر طور پر پیش کی گئی ہیں۔

ناول کے موضوع کے تعلق سے ایک اہم بات یہ کہی جا سکتی ہے کہ سب سے سنجیدہ موضوع نہ سیاست ہے نہ جنگیں ہیں بلکہ لوگوں کے رہن سہن اور زندگی بسر کرنے کے طریقوں کی تبدیلیاں ہیں۔ نقطہ نظر کی وہ تبدیلیاں جس سے وہ دنیا کو دیکھتے ہیں، اور ناول کا سب سے سنجیدہ موضوع بھی یہی رہا ہے۔

''چائے کے باغ'' میں بھی زندگی بسر کرنے اور نقطہ نظر کی ان تبدیلیوں کا بڑا گہرا مطالعہ ملتا ہے۔ اردو ناولٹ کی تکنیک میں بھی ''چائے کے باغ'' بہت اچھوتا، اہم اور عہد آفریں تجربہ ہے۔

''اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجو'' جیسے عنوان سے واضح ہو تا ہے۔ یہ ایک دل ہلا دینے والی داستان حیات ہے۔ یہ بھی ''سیتاھرن'' کی طرح ایک ہندوستانی عورت کی ٹریجیڈی ہے لیکن رشکِ قمر کی بے بسی سیتا میر چندانی کی بے کسی سے زیادہ اندوہناک اور لرزہ خیز ہے۔ یہ بالکل مجبور، انتہائی مفلس اور پچھڑی، دلی پسی ہوئی عورتوں کی داستان ہے۔ ناولٹ کا عنوان ایک گیت کا بول ہے، اور زندگی سے قطعی مایوسی کا اظہار ہے۔ تناسخ کے استعارے میں شدید قنوطیت کا اعلان ہے۔ یہ ایک دلدوز چیخ ہے جو مکمل طور پر دل شکستہ عورتوں یا ان کی داستان طراز قرۃالعین حیدر کے لبوں سے نکلتی ہے۔ یہ چاروں ناولٹ ثابت کرتے ہیں کہ قرۃالعین حیدرؔ کو جو دسترس افسانہ نگاری اور ناول نویسی کے فن پر ہے وہی گرفت ناولٹ کے فن پر بھی حاصل ہے۔

نگہت سلیم کا شمار جدید افسانہ نگاروں میں ہو تا ہی ہے، لیکن وہ ناولٹ لکھنے کا بھی قرینہ جانتی ہیں اس کے ناولٹ ''مت اس سے کہنا'' کا شمار عہد موجود کے عمدہ ناولٹوں میں ہو تا ہے اس ناولٹ میں فطرت اور انسان کے مابین قائم رشتے کے طلسماتی پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔

سیدہ حناؔ کا ناولٹ ''تنہا اداس لڑکی'' 1967ء میں طبع ہوا۔ واقعات ایک تنہا لڑکی کے گرد گھومتے ہیں جس کے والدین وفات پا چکے ہیں وہ غیر ذمہ دار مفلس چچا اور ضعیف العمر دادی کے زیر سایہ پرورش پا رہی ہے۔ ''تنہا اداس لڑکی'' ناولٹ کی کہانی غم آگیں مگر دلچسپ ہے۔ ماحول کی جابر قوت کا قدم قدم پر احساس ہو تا ہے اور انسان کی بے چارگی اور مجبوری ہر جگہ محسوس ہوتی ہے۔ آخر میں کہانی ایک عجیب موڑ پر پہنچ کر ڈرامائی انداز میں ختم ہو جاتی ہے۔ کہانی طبعزاد ہے اور کردار چربہ کردار نہیں ہیں۔

زیتون بانو کے مطابق ''تنہا اداس لڑکی'' ہر اس لڑکی کی داستان ہے جس

کی خوشیوں اور آرزوؤں کے چاند گہنا گئے ہیں اور جو زندگی کے لق و دق صحرا میں تنہائی کا زہر پینے کے لیے بھٹک رہی ہے۔

کہانی میں ایک تسلسل ہے، ایک توازن ہے۔ کہیں پر بھی قاری یک دم بہت بلندی پہ یا بہت پستی میں نہیں گرتا البتہ عام زندگی میں نشیب و فراز کی طرح اتار چڑھاؤ ضرور ہے۔

محترمہ سیدہ حنا کا نیا ناولٹ بھی ''شہرزاد'' کے عنوان سے طبع ہو چکا ہے۔ معروف ادیبہ بشریٰ رحمٰن کا مجموعہ ناولٹ ''پے انگ گیسٹ'' کے نام سے طبع ہو چکا ہے اس میں ان کے چار ناولٹ، ''چاند سے نہ کھیلو''، ''قفل''، ''معمولی آدمی'' اور ''پے انگ گیسٹ'' شامل ہیں۔ علاوہ ازیں بشریٰ رحمٰن کے دیگر ناولٹ ''لالہ صحرائی''، ''ایک آوارہ کی خاطر''، ''اللہ میاں جی'' اور ''بت شکن'' بھی الگ الگ چھپ چکے ہیں۔

بانو قدسیہ کے ناولٹس کا مجموعہ ''چہار چمن'' کے عنوان سے طبع ہو چکا ہے جس میں مختلف عنوانات سے چار ناولٹس ''موم کی گلیاں''، ''پروا''، ''ایک دن'' اور ''شہرِ بے مثال'' شامل ہیں۔

گوداوری کے عنوان سے فہمیدہ ریاض کا ناولٹ چھپ چکا ہے جبکہ پاکستانی ادب میں سائرہ ہاشمی کا ناولٹ ''سیاہ برف'' بھی ایک خوبصورت اضافہ ہے۔ جسے قبول عام کی سند حاصل ہے۔

چاند اداسی اور افسردگی کی علامات اور صلیب ہم سب کے گلے کا مقدر ہے۔ یہ ایک چھوٹے سے مختصر لیکن جامع اور دلکش ناولٹ کا موضوع ہے جس کا عنوان ہے، ''چاند پر صلیب'' جو فریدہ حفیظ کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ اس ناولٹ میں مصنفہ نے جگہ جگہ اپنے گہرے سماجی شعور کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔

عائشہ اسلم کا نام ادبی حلقوں میں جانا پہچانا ہے۔ اس کا ناولٹ ''گیلی

سڑک" کے عنوان سے طبع ہو چکا ہے۔

نرگس کنول کا پہلا ناولٹ "ہجر کی پہلی بارش" کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔ بظاہر عام روایتی سا پلاٹ ہے تاہم کہانی میں بلا شبہ ایک تسلسل ہے ایک توازن ہے۔ بنیادی طور پر ناولٹ ڈرامہ کی تکنیک پر لکھا گیا ہے لیکن اس تکنیک کو خوبصورتی سے برتا گیا ہے اور ناولٹ کا انجام اس کو اور بھی ڈرامے کے نزدیک لے جاتا ہے۔ ہمارے ہاں خواتین ناول نگاروں نے عموماً کہانی اور کرداروں کی مدد سے ناولٹ لکھے ہیں مگر یہ ناولٹ اس مجموعی انداز سے قدرے مختلف ہے۔

1947ء سے اب تک پاکستان میں خواتین نے کچھ زیادہ ناولٹ نہیں لکھے ہیں تاہم اب تک خواتین کے جتنے ناولٹ بھی طبع ہوئے ہیں یہ ایسے ناولٹ ہیں جن میں فنی محاسن کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔

# خواتین کا افسانہ

کسی بھی صنف کی زندگی کا ثبوت اس کے بدلتے رجحانات و میلانات اور اس کے ارتقاء سے کیا جاسکتا ہے۔ صنف افسانہ نے کن حالات کے تحت جنم لیا؟ اردو افسانہ کا جدید دور کب سے شروع ہوا اور اردو کے جدید تر افسانے کی ابتدا کب سے ہوئی؟

یہ ایسے سوالات ہیں جن کا جواب آسان نہیں ہے، اگر ان کا کوئی جواب ممکن ہو بھی تو اس پر ناقدین اور مصنفین کا کامل اتفاق رائے بہت مشکل ہے اسلیے کہ ادبی رجحان کسی مخصوص دور کا پابند نہیں ہوتا اور نہ ہی تاریخ کے کسی خاص موڑ پر پہنچ کر اچانک ختم ہو جاتا ہے۔ البتہ ہوتا یہ ہے کہ مختلف رجحانات متوازی خطوط پر ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور بعض اوقات ایک دوسرے کو متاثر کرتے ہیں اور پھر طویل عرصے کے بعد قدیم رجحان رفتہ رفتہ ناپید ہو جاتا ہے۔ اور نیا رجحان ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔

افسانہ یا مختصر افسانہ دنیا کے قدیم اصناف ادب میں سے نہیں بلکہ جدید اصناف ادب میں سے ہے۔ مغرب میں ادب کی یہ صنف ناول کے ارتقاء کے بعد وجود میں آئی ہے۔ اردو ادب میں بھی ناول پہلے آیا اور افسانہ بعد میں لیکن افسانہ کا ارتقاء ناول سے زیادہ تیز رہا ہے۔ یہ ادب کی وہ خوش نصیب صنف ہے جسے تقریباً ہر ملک کے ممتاز ترین اہل قلم کی توجہ حاصل رہی ہے۔

ہمارے ادب میں افسانہ مغرب سے آیا لیکن داستان حکایات اور کہانی کے انداز میں اس کی روایت بہت مدت سے موجود تھی ۔ اس کی روایت اور مغربی افسانے کے بیشتر اجزاء مشترک تھے۔ چنانچہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مختصر افسانہ مغرب سے ضرور آیا لیکن اس کے ترقی کرنے کے لیے راہ پہلے سے ہموار تھی۔

بیسویں صدی کی ابتداء ہی سے زندگی کے اصول نظریات اور عقائد نے تغیر و تبدل نظر آنے لگا۔ چنانچہ قلمکاروں نے ادب برائے ادب کے نظریے کو رد کرتے ہوئے ادب برائے زندگی کا تصور پیش کیا۔ ترقی پسند تحریک نے ادب کی مختلف اوصاف کو متاثر کیا۔ نوجوان نسل کی ذہانت اور بزرگوں کے تجربے نے اس تحریک کو بڑھانے میں مدد کی۔ تخلیقی۔ تنقیدی یا تحقیقی ادب کے سلسلے میں مرد اور عورت کی تخصیص مناسب

نہیں کہ ایک بہترین اداکارہ کسی کے بھی تخیل کی تخلیق ہو سکتا ہے تاہم فطری اور معاشرتی لحاظ سے مرد اور صنف نازک کی تخصیص موجود ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے لفظوں میں ''کہانی سنانے کے لیے عورت، مرد سے زیادہ موزوں ہے بشرطیکہ کہانی کو صحیح معنوں میں کہانی سمجھا جائے''۔

جبکہ محترمہ خورشید زہرا عابدی کہتی ہیں ''اردو افسانے کی ترقی صرف مردوں کی رہین منت نہیں ہے اس میں عورتوں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ وہ گھروں کے اندر محبوس ضرور تھیں مگر دماغ زمین و آسمان کے قلابے ملاتا رہتا تھا۔ آج ہمارے سماج میں معاشرتی ترقی اور تہذیبی لطافت کا جو توازن قائم ہے اس کا بنیادی عنصر خواتین کی ہی دین ہے۔ چنانچہ رومانیت اور شاعرانہ لطافت سے بھرپور افسانے لکھنے والے مردوں کے ساتھ ساتھ حجاب امتیاز علی (حجاب اسماعیل) ان سے کچھ فاصلے پر حاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور وغیرہ کی تخلیقات بھی نظر آئیں جن میں طبقاتی کشمکش معاشی اور معاشرتی مسائل اور استحصال کے موضوعات کو موضوع بحث بنایا گیا تھا۔ ''کالی حویلی'' حجاب امتیاز علی کے افسانوں کا مجموعہ ہے، جو 1990ء میں طبع ہوا۔ ''تصویر بتاں'' بھی ان کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ فکری اور تخلیقی محاذ پر ڈاکٹر رشید جہاں کی شخصیت پہلے سے موجود تھی۔ ڈاکٹر رشید جہاں ''انگارے'' گروپ کی افسانہ نگار تھیں۔ انہوں نے روایتی اصلاحی افسانہ نگاری سے اجتناب کیا۔ ان کے افسانہ ''دلی کی سیر''، ''مجرم کون''، اور ''نئی مصیبتیں'' فنی لحاظ سے پختہ افسانے نہ سہی لیکن انہیں یہ تاریخی حیثیت حاصل ہے کہ رشید جہاں نے اردو افسانے کا رُخ سماجی حقیقت نگاری کی طرف موڑ دیا۔ ان کے افسانوں میں ایک ایسی باغی عورت رونما ہوتی ہے جو اپنا غصہ کاغذ پر منتقل کر سکتی ہے۔ انہوں نے بے باک اظہار نگاری کی طرح ڈالی۔ دسمبر 1932ء میں ''انگارے'' کے عنوان سے جو افسانوی مجموعہ طبع ہوا تھا اس میں ڈاکٹر

رشید جہاں کے بھی افسانے شامل تھے۔ ڈاکٹر رشید جہاں مردوں اور عورتوں دونوں
کے لیے زبردست محرک نظر کی حیثیت رکھتی تھی اور ان سے متاثر ہونے والوں میں
عصمت چغتائی اور فیض احمد فیض دونوں شامل تھے پھر سماجی زندگی کی مجلس آرائی اور
تہذیبی تزئینات کے نگار خانے میں عطیہ فیض بین الاقوامی شہرت کی حامل تھیں۔
ایک آواز حجاب امتیاز علی کی بھی تھی جو اس زمانے کی تحریروں میں اور نامانوس فضا کا
جادو جگا رہی تھی۔

دور جدید میں ترقی پسند تحریک ہی اردو افسانے کے عروج کا باعث بنی جس
کی پہلی کانفرنس 15 اپریل 1936ء کو لکھنو میں منشی پریم چند کی زیر صدارت منعقد
ہوئی، ترقی پسند تحریک بڑی تیزی سے پھیلنے لگی اور اردو کے تقریباً تمام بڑے اہل
قلم نے اس کا خیر مقدم کیا۔ ترقی پسند تحریک نے حقیقت نگاری کے رجحان میں
انقلاب اور طبقاتی شعور کو شامل کر دیا اور ادب میں مظلوم انسانوں کے حق میں جذباتی
لگاؤ کا اظہار کیا جانے لگا، اس طرح ترقی پسند افسانے کی روایت نے جنم لیا۔

ترقی پسند تحریک نئے دور کی دین تھی نئے دور میں زندگی کے متعلق نیا
رویہ اپنے ساتھ نئی صداقتیں لے کر طلوع ہوا جس نے ادب کی جملہ اصناف میں
جدید رجحانات اجاگر کیے۔

اگر اس دور پر نظر ڈالی جائے تو مرد افسانہ نگاروں کے ساتھ ساتھ خواتین
کا کس حد تک رجحان افسانہ نگاری کی طرف رہا اور کن خواتین نے اس صنف میں اپنا
آپ منوایا۔۔؟

اس ضمن میں مردوں کے ناموں کی طویل فہرست میں موجود تین خواتین
نمایاں نظر آتی ہیں۔ ان میں ایک تو رومانی طرز اظہار کی علمبردار افسانہ نگار بیگم
حجاب امتیاز علی تاج اور دوسری ڈاکٹر رشید جہاں ہیں۔ ان
کے علاوہ ترقی پسند تحریک کی چکا چوند میں جن اہل قلم خواتین کے نام نمایاں ہوئے

ان میں خدیجہ مستورؔ اور حاجرہ مسرورؔ کے نام کا سکہ اب تک چل رہا ہے۔ ان افسانہ نگار خواتین نے افسانے میں ترقی پسند نظریات کو اہمیت دی۔

افسانہ نگاروں کی دوسری کہکشاں ''غیر ترقی پسند'' خواتین نے مرتب کی ان میں سب سے اہم نام قرۃ العین حیدرؔ کا ہے۔ جن کا تخلیقی عمل تا حال مائل بہ ارتقاء ہے۔

اس دور کی افسانہ نگار خواتین میں ممتاز شیریںؔ بھی منفرد پہچان رکھتی ہیں جنھوں نے شعوری طور پر اردو افسانے کو مغربی معیار تک لانے کی کوشش کی۔

قرۃ العین حیدرؔ اور ممتاز شیریںؔ آزادی سے قبل اردو افسانے میں نہ صرف اپنی رونمائی کرا چکی تھیں بلکہ انہیں ایک مقام حاصل ہو چکا تھا۔

40ء کی دہائی سے 50ء کے عشرے تک ترقی پسند عصری ادب کا غالب رجحان رہا اور اس سے بیشتر اہل قلم شعوری یا غیر شعوری طور پر متاثر رہے۔ قیام پاکستان کے بعد بھی ان کی افسانہ نگاری کا سلسلہ ٹوٹا نہیں اور جاری رہا بلکہ ان کی بھرپور شہرت میں اضافہ قیام پاکستان کے بعد ہوا۔

بقول ڈاکٹر فرمان فتحپوریؔ، ''انہوں نے اردو افسانے کو تکنیک اور موضوع دونوں کے اعتبار سے وہ کچھ دیا کہ یہ اپنے پیشرو افسانہ کے قلمرو فن سے ہم آہنگ ہو کر بھی ان سے بہت الگ اور منفرد ہیں، اتنا الگ اور منفرد کہ اردو افسانے کے ایک نئے دور کا آغاز کرتا ہے''۔

قیام پاکستان کے بعد جدید اردو افسانے کی ابتداء اسی طرح ہوئی اور جدید افسانہ ترقی پسند افسانے کی کوکھ سے نکلا لیکن اپنی شکل و صورت، قد و قامت اور انداز و گفتار میں ترقی پسند افسانے سے قطعی مختلف ثابت ہوا۔ اس لیے کہ جدید اردو افسانہ ترقی پسند افسانے یعنی ریئلزم (Realism) کے رد عمل میں وجود میں آیا جبکہ جدید تر افسانہ، جدید افسانے کا عمل نہیں بلکہ اس کی توسیع ہے اس لیے جدید اور جدید تر

افسانے میں رجحان یا فکر کے اعتبار سے کوئی خاص فرق نہیں ہے، فرق ہے تو صرف وقت اور نسل کا ہے''۔

لیکن تخلیقات اور تخلیقی رویوں کا سلسلہ جاری رہا۔ البتہ پاکستانی ادب کی اصطلاح کا رواج 14اگست 1947ء یعنی قیام پاکستان کے بعد شروع ہوا۔ تاسیس پاکستان کے بعد نئے ذہنی رجحانات نے ہمارے ادب کو افقی اور عمودی جہتوں میں متاثر کیااس ضمن میں آزادی کی جدوجہد اور تصور حریت نے ایسے ادب کو جنم دیاجس پر ہم بجاطور پر فخر کر سکتے ہیں لیکن 47ء کی دہائی میں سنگین سے سنگین تر حالات رونما ہوئے۔ سیاسی، سماجی اور اقتصادی انتشار نے ہر آدمی کے دل ودماغ کو بری طرح متاثر کیا۔ آزادی کے ساتھ ساتھ آگ اور خون کا جو طوفان فرقہ واریت کے جنون سے اُمڈا، اس نے ٹھیک طور پر آزادی کی دیوی کا دیدار بھی نہیں کرنے دیااس دور کی نظمیں، غزلیں، یادداشتیں اور ناول فسادات کی سنگین صورتحال کی عکاسی کرتی ہیں۔

47ء کے بعد ادب کی دوسری اصناف کی طرح اردو افسانہ بھی بالکل نئے مسائل سے دوچار ہوا۔ برصغیر کے باسیوں نے جدوجہد کے بعد آزادی حاصل کی بیرونی سامراج کی ستم ارزانی سے نجات پائی لیکن جشنِ مسرت منانے کی گھڑی نہ آئی۔ آزادی کا چراغ روشن بھی نہ ہو پایا تھا کہ فسادات کے نام سے برق وباد نے گھیر لیا۔ گاؤں کے گاؤں اور شہر کے شہر قتل وغارت کی سرخ آندھیوں میں اُڑ گئے۔ بجلیاں ٹوٹ پڑیں، مکانوں کے ساتھ مکیں بھی جل کر راکھ ہو گئے، بادلوں سے پانی کی بجائے خون برسنے لگا، کوچے اور بستیاں اس میں ڈوب گئیں، آدمی کے روپ میں درندے نکل پڑے۔

برصغیر پاک وہند کی تقسیم کے بعد نقل مکانی بنتے بستے گھروں کے اجڑنے اور بندگان خدا کے قتل وغارت کے ساتھ ساتھ اپنوں کے جبر وستم، بدعنوانی، بدنظمی، لوٹ کھسوٹ اور ناعاقبت اندیشی جیسی داستانیں بھرپور انداز میں تقسیم وطن

کے بعد کے افسانے کا موضوع بنی اور فنی رویوں میں نمایاں رونما ہوئیں۔

اس دور کے افسانوں میں کرداروں کے نفسیاتی عوامل اور ذہنی کیفیات کو زیادہ قابل توجہ سمجھا جانے لگا چنانچہ اس دور میں تخلیق ہونے والے ادب کو فسادات کے ادب کا نام دیا گیا۔

فسادات کا سب سے ہولناک اور سب سے شرمناک پہلو عورتوں کی بے حرمتی تھا۔ برسرِ عام انسان کی حیوانیت کے مظاہرے انتہائی کریہہ اور گھناؤنے تھے لہٰذا اس دور کے افسانوں میں جذباتیت کا نمایاں عنصر پایا جانا تعجب کی بات نہیں۔

46ء ــــ 47ء کے خونچکاں فرقہ وارانہ فسادات سے لکھنے والے غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے۔ بعض افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں تقسیم وطن اور اس سے پیدا ہونے والے ردِ عمل کو اپنے افسانوں میں بیان کیا۔

افسانہ نگار خواتین میں سے دو نے تقسیم کے بعد اردو ادب کو عظیم افسانے دیئے، تقسیم کے پس منظر میں خدیجہ مستور کے افسانے ''دس نمبری''، ''ٹامک ٹوئیے'' اور ''مینوں لے چلے بابلا لے چلے وے''۔ خدیجہ مستور نے عورت کے اغوا کو موضوع بنایا ہے۔ ''ٹامک ٹوئیے'' میں تین چار اغوا شدہ عورتیں پیش کی گئی ہیں۔ جو اپنا اپنا دکھڑا سناتی ہیں ان کی باتوں میں بلا کی تلخی ہے، زہر ہے، طنز ہے۔ خدیجہ مستور کا دوسرا افسانہ ''مینوں لے چلے بابلا لے چلے وے'' پہلے افسانہ ''ٹامک ٹوئیے'' سے قدرے بہتر ہے خصوصاً وہ منظر جس میں لڑکی اغوا ہو رہی ہے۔ لڑکی کے خاموش کرب کا احساس اچھی طرح لایا گیا ہے۔ خدیجہ مستور کا یہ مختصر افسانہ ''مینوں لے چلے بابلا لے چلے وے'' وحدت تاثر اور اظہار کی خوبصورت کے اعتبار سے اردو کا عظیم افسانہ ہے۔ اسی موضوع پر قرۃ العین حیدر کا افسانہ ''جلا وطن'' اتنا بھرپور اور اس قدر پر درد افسانہ ہے کہ لوگوں کے ذہن پر اس کا تاثر بہت دیر تک قائم رہتا ہے۔ اس افسانے میں قرۃ العین حیدر نے کوئی فلسفہ نہیں بگھارا ہے بلکہ

انسانی کرب واذیت کو بڑے خوبصورت انداز میں افسانے کی صورت میں پیش کیا ہے۔ دراصل ''جلاوطن'' دکھے ہوئے دلوں کی کہانی ہے۔

خدیجہ مستوؔر کے ''مینوں لے چلے بابلا لے چلے وے'' اور قرۃالعین حیدرؔ کے ''جلاوطن'' سے قطع نظر قرۃالعین حیدرؔ نے ''فصلِ گل آئی یا اجل آئی'' اور ''دکھلائیے لیجا کے تجھے مصر کا بازار'' جیسی بڑی اور خوبصورت کہانیاں لکھیں۔ ''ستاروں سے آگے'' قرۃالعین حیدرؔ کے افسانوں کا اولین مجموعہ ہے جو 1946ء میں طبع ہوا۔ اس مجموعہ کے عنوان سے جا طور پر ایک مثالیت پسندی اور اس کی تمام خوبیوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔

جبکہ خدیجہ مستوؔر نے ''کانٹا''، ''دل کی پیاس''، ''راستہ'' اور ''ہینڈ پمپ'' جیسے افسانے لکھ کر اردو افسانے کو جلا بخشی۔ ''کھیل''، ''بوچھاڑ''، ''چند روز اور''، ''تھکے ہارے'' اور ''ٹھنڈا میٹھا پانی'' کے نام سے ان کے افسانوی مجموعے طبع ہو چکے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد قرۃالعین حیدرؔ نے سب سے زیادہ موثر افسانے لکھے اور شہرت کی بلندیوں کے باوجود اپنے فن کو زوال سے آشنا نہیں ہونے دیا۔ 54ء میں ان کا افسانوی مجموعہ ''شیشے کا گھر'' کے نام سے طبع ہوا۔ یہ علامتی عنوان ہے جو زندگی کے حزینہ پہلو کی غمازی کرتا ہے۔ اس مجموعہ میں شامل افسانہ ''یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر'' مصنفہ کی داستان حیات کا ایک ورق ہے اور ساتھ ہی آزادی ہند اور تقسیم ملک کے بعد جنم لینے والی مملکتِ خداداد کی ایک جھلک بھی ہے۔ ''پت جھڑ کی آواز'' گویا یہ مجموعہ کی کہانیوں کی عام فضا کا اشاریہ ہے بجائے خود اس افسانے کا عنوان ہی علامتی ہے اور زندگی کے زوال وانتشار کا مفہوم دیتا ہے، خواہ وہ فرد کی زندگی ہو یا سماج کی۔ ''پت جھڑ کی آواز'' کی ہیروئین غیر منقسم ہندوستانی کلچر کے عہد کی پیداوار ہے، یہ وہ کلچر ہے جو برصغیر کی آزادی کے وقت تقسیم ہوا، اور

ایک فرقہ وارانہ تاثر چھوڑ گیا۔ مجموعی طور پر ''پت جھڑ کی آواز'' قرۃالعین حیدر کے دیگر افسانوی مجموعوں سے بہتر و برتر ہے۔

تقسیم کے پس منظر میں حاجرہ مسرور کے افسانے ''امت مرحوم'' اور ''بڑے انسان بنے بیٹھے ہو'' قابل ذکر ہیں، ان افسانوں کے علاوہ حاجرہ مسرور نے ''کنیز''، ''بھاگ بھری''، ''تیسری منزل''، ''پھر لہو گیا ہے'' اور ''چوری چھپے'' جیسے بھرپور افسانے لکھے۔

ان کے افسانے عام زندگی سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان کے فن میں عمومیت نہیں پائی جاتی۔ ان افسانوں میں دکھی لوگوں کی زندگی کے ایک ایک دکھ کو جس طرح اجاگر کیا گیا ہے وہ حاجرہ مسرور کا ہی حصہ ہے۔ ''کنیز'' اور ''بھاگ بھری'' تو خاص طور پر ان کے نمائندہ افسانے ہیں۔

ان کے افسانوں کے مجموعے ''سب افسانے میرے''، ''چرکے'' اور ''چاند کی دوسری طرف'' میں ایک سماجی المیہ کو جس چابکدستی اور فنکارانہ اچھوتے پن سے پیش کیا گیا ہے وہ قابل داد ہے۔ 47ء کے بعد وقتی اور حادثاتی موضوعات کے تحت لکھے گئے بعض افسانے بھی اس معیار کے ہیں جو علامتی انداز میں اجتماعی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کی کامیاب عکاسی کرتے ہیں، مثال کے طور پر صدیقہ بیگم کے فسادات پر دو افسانے ''روپ چند'' اور ''گوتم کی سرزمین'' ان کے دیگر سیاسی موضوعات پر لکھے گئے افسانوں کے برخلاف جو اکثر سطحی ہوا کرتے تھے، کافی اچھے اور اثرانگیز ہیں۔ ممتاز شیریںؔ اردو کے افسانوی ادب کا ایک روشن باب تھیں، مختصر افسانے کو اردو کے ادبی منظر نامے پر نمودار ہو کر فنی اظہار کی مستند صنف کا درجہ حاصل کیا۔ وہ تخلیقی تجربے تکنیکی بوقلمونی، سخن سنجی اور معنی آفرینی کی ایک الگ جہت ہے اور اس باوقار ادبی سرمائے میں ممتاز شیریں کے افسانے ایک منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ ممتاز شیریں نے واقعیت پسندی و جذباتی تصویر کشی (''انگرائی''

اور ''آئینہ'') سے اسطورہ نویسی اور استعارہ سازی (''میگھ ملہار'' اور ''دیپک راگ'') اور تجربہ کی حدود کو چھوتی ہوئی علامت نگاری (کفارہ) تک سفر کیا ہے۔ ان کا یہ فنی سفر ایک ادیب کی ذاتی نمودوارتقاء کی داستان ہے اور شعور کی نئی منزلوں کے لیے ایک فنکار کی تلاش کی نمائندگی کرتا ہے اس کے ساتھ ساتھ یہ اردو افسانے کے دائرہ امکان کو نئی وسعتوں پر محیط کرنے کی کوشش بھی ہے۔

''انگڑائی'' اور ''آئینہ'' میں نفسیاتی ژرف نگاہی اور نرم دل کردار کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ ''میگھ ملہار'' اور ''کفارہ'' میں افسانہ نگار عشق اور فنا کے ان علاقوں سے گزرنے کی کوشش کر رہی ہے جن پر خیال کا سایہ کم کم پڑا ہے۔ یہاں سفر کی سمت بھی نئی ہے اور انداز سفر بھی۔ ان کے افسانوی مجموعہ ''اپنی نگریا'' کے آخری دو افسانے ''رانی'' اور ''شکست'' زیادہ تر مشاہدے پر مبنی معلوم ہوتے ہیں اور ایک محدود قسم کی کامیابی ضرور حاصل کر لیتے ہیں۔ طویل افسانے ''میگھ ملہار'' اور ''دیپک راگ'' ممتاز شیریں کے فنی سفر کا دوسرا پڑاؤ ہیں اور یقیناً متنازعہ فیہ بھی۔

ممتاز شیریں کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''اپنی نگریا'' بہت پہلے چھپا تھا، دوسرا اور آخری مجموعہ ''میگھ ملہار'' 61 - 1962ء میں طبع ہوا۔ اس مجموعہ میں شامل افسانہ ''کفارہ'' پر کچھ زیادہ تبصرے اور مضامین آئے جن میں بیشتر کی نوعیت معترضانہ معذرتانہ ہی رہی۔ مضامین اور تبصروں کے معترضانہ ہونے کی ایک بڑی وجہ ''میگھ ملہار'' کا دیباچہ بھی تھا۔

ممتاز شیریں کے افسانوں میں ''بھارت ناٹیہ'' اس لحاظ سے منفرد ہے کہ 47ء کے سیاسی ماحول سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔ ''بھارت ناٹیہ'' حقیقت پسندانہ رویہ کا مظہر ہے۔ ممتاز شیریں نے مثبت انداز فکر اختیار کیا ہے اور موضوع کو خالصتاً پاکستانی زاویہ نگاہ سے پیش کیا ہے۔ نسائیت کی فضا نے افسانے کو معصومیت اور پاکیزگی

کا حامل بنا دیا ہے۔

ہندوستان کے بدلتے ہوئے تہذیبی ماحول اور برطانوی سامراجیت کو پس منظر میں رکھ کر تقسیم کی کہانی نہایت عمدہ پیرائے میں بیان کی گئی ہے۔ ممتاز شیریں نے ''آندھی میں چراغ'' اور ''کفارہ'' کی شکل میں اردو کو دو بڑے اور فنی طور پر مکمل افسانے دیئے اور اس کے بعد وہ کوئی بڑا افسانہ نہ لکھ سکیں شائد ان کے اندر موجود تخلیق کی چنگاری ان کی تنقید کے نیچے دب کر بجھ گئی۔

فسادات کے ماحول کے بطون سے ابھرنے والے ادب کے بعد جب گردوپیش کی زندگی اپنا حق مانگنے لگی تو متعدد تاریخی، سماجی، سیاسی اور ادبی جہتوں پر غور و خوض کا عمل شروع ہوا۔ میرے خیال میں یہ ایک بہت اہم مسئلہ تھا اور یہ ہمارے ادب اور مجموعی معاشرے کے حق میں بہتر ہی ہوا کہ اس اہم مسئلہ سے نظریں چرانے کی بجائے اس کے ہر پہلو پر بحث کی گئی اس ضمن میں تلخیاں، شکوک و شبہات اور منفی رویوں کو بھی سامنے آنے کا موقع ملا۔ اس پوری کشمکش قومی اور انفرادی تشخص اور شناخت کے موضوعات ''آگ کا دریا'' (ناول) وغیرہ سے شروع ہوئے اور آج تک افسانوں، ناولوں اور نظموں میں اپنی جھلک دکھائے جاتے ہیں۔

یہ رجحانات ہمارے معاشرے کے حقیقی اور معروضی حالات سے پیدا ہوئے تھے۔ کسی فیشن یا درآمد برآمد یا ثقافتی یلغار کا نتیجہ نہیں تھا اسی لیے ان کے تخلیقی اظہار کو بھی ادب میں حیثیت حاصل ہوئی۔

مجموعی طور پر تقسیم وطن اور ہجرت سے متاثر ہو کر لکھے جانے والے افسانوں میں کئی خواتین کے افسانے اس دور کے بہترین افسانوں میں شامل کیے جاتے ہیں۔

جب پاکستان وجود میں آیا تو ملکی حالات قطعی ناموافق تھے اور وقت گزرنے

کے ساتھ ساتھ بد سے بدتر ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ 53ء میں ایک احتجاجی جلوس پر کراچی میں گولی چلی۔ 1954ء تک انجمن ترقی پسند مصنفین (پاکستان) حکومت کی طرف سے عائد کردہ بے جاپابندیوں اور کڑی مشکلات کا سامنا کرتی رہی تاوقتیکہ خوف وہراس نے تنظیمی انتشار کی صورت پیدا کی لیکن پھر بھی ہمارے افسانہ نگاروں نے اہم افسانے لکھے جن میں حاجرہ مسرور کا افسانہ ''راجہ بل'' بھی شامل ہے۔ حاجرہ مسرور نے اس افسانے میں اس دور کے تقریباً تمام اتار چڑھاؤ بڑی ہنر مندی سے رقم کیے ہیں۔

اس صدی کی چھٹی دہائی میں ہمارے ہاں جو نئے رویئے یا اصناف رائج ہوئیں وہ اصلاً مغرب سے درآمد شدہ تھیں مگر ایک زمانے میں ان کی مقبولیت ہمارے ہاں کی بعض سیاسی اور سماجی کروٹوں کے باعث بھی تھی جس کے نتیجے میں کھل کر بات کرنے کے انداز کے بجائے علامتی اور تجریدی انداز مقبول ہوتا چلا گیا لہذا افسانہ نگاری کے باب میں پاکستان کی مخصوص صورتحال کے خاصے واضح اثرات بھی اردو افسانے پر مرتب ہوئے۔

58ء کے بعد جو افسانے لکھے گئے اور اسے جدید افسانے کا نام دیا گیا دراصل افسانہ محض معروضی وجوہات کی بنا پر تبدیل ہوا ہے۔ 58ء سے قبل افسانہ نگاروں کو جو فضا میسر تھی وہ آزادی کی جدوجہد کی فضا تھی۔ انگریزوں کا عہد حکومت تھا۔ فضا رومانی تھی اور لہجہ صاف تھا۔ 1960ء میں نئی تشکیلات کی بحث سامنے آئی جو بنیادی طور پر نظم کی بحث تھی اور نئی لفظیات کی بات کی گئی تھی۔ یہ بحث افسانے میں بھی در آئی۔

نئے پاکستانی افسانے سے صرف وہی افسانہ مراد نہیں ہے جسے بالعموم علامتی افسانہ سے تعبیر کیا جاتا ہے بلکہ میری رائے میں 60ء کے بعد لکھے جانے والے وہ سب افسانے نئے افسانے کی ذیل میں آتے ہیں جو نئے معاشرتی سیاسی اور نفسیاتی

مسائل کو فنی چابکدستی سے پیش کرتے ہیں کیوں کہ نیا پن محض علامت و تجریدسے مخصوص نہیں کہ علامت اور تجرید اظہار کا ایک وسیلہ ہیں مقصود بالذات نہیں۔ اردو ادب اور بالخصوص افسانے میں علامت کی ترویج کا ایک سبب 1958ء کا مارشل لاء بتایا جاتا ہے۔ جب سیاست و صحافت کے میدان میں آزادی اظہار پر قدغنیں لگا دی گئیں تھیں مگر میرے خیال میں یہ درست نہیں کیونکہ 58ء کے مارشل لاء نے سیاست دانوں اور صحافیوں پر تو پابندیاں عائد کیں مگر خالص ادب اور ادیبوں سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ اولاً شائد اس لیے کے ایوب خان کو ادب کی محدودیت کا علم تھا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ 60ء کے آس پاس نمایاں ہونے والے بیشتر لکھنے والے علامتی انداز اختیار کیے ہوئے تھے۔ نیز جس دور میں پاکستان میں علامتی افسانے کا آغاز ہوا تو تقریباً اس زمانے میں بھارت میں بھی علامتی افسانے کا چرچا ہوا، حالانکہ وہاں مارشل لاء جیسے حالات نہیں تھے۔

البتہ یہ کہنا زیادہ قرین قیاس ہو گا کہ افسانے میں علامت کا استعمال اظہار و بیان کے نئے امکانات دریافت کرنے کی خواہش کا نتیجہ تھا یا شائد تخلیقی سطح پر نئے تجربات اور نفسی کیفیات کے مثبت اور منفی اثرات کا حقیقت پسندانہ توازن مفقود تھا ۔۔۔؟

ڈاکٹر سلطانہ بخش لکھتی ہیں۔ ''1958ء سے ہمارے افسانوں میں خواب اور شکست خواب کے موضوع اہمیت اختیار کرتے گئے۔ حقیقت پسندوں نے درون ذات کی طرف سفر کا آغاز کیا اس درون بینی نے علامتی تحریک کا رنگ اختیار کرنا شروع کیا۔ معاشرے اور اجتماعی مسائل کو پیش کرنے کو ایک ایسا ڈھنگ نکالا کہ علامتی افسانہ نازک، گہرے اور لطیف پہلوؤں پر موثر گرفت کا مظاہرہ کرنے لگا۔

علامتی و تجریدی افسانہ کے حوالہ سے علامتی افسانہ نگار خواتین میں خالدہ حسین اور زاہدہ حنا کے نام نمایاں ہیں۔ ان کے ہاں جدیدیت کے مختلف انداز ملتے ہیں

ان میں سے ہر افسانہ نگار نے علامت اور تجرید کو اپنے اپنے انداز میں استعمال کیا ہے اور زندگی کی مختلف جہات کو اپنے اپنے اسلوب میں پیش کرنے کی کاوش کی۔

ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں جب وہ خالدہ اصغر سے خالدہ اقبال اور پھر خالدہ حسین کے نام سے سامنے آئیں تو ان کی ابتدائی کہانیوں (ہزار پایہ وغیرہ) کے برعکس ان کی فنی کہانیوں میں نہ صرف موضوعاتی وسعت بلکہ اسلوبی اور تکنیکی تازگی بھی محسوس ہوئی خالدہ حسین نے نئے افسانے کو رنگا رنگ تجربوں اور ایک منفرد اسلوبی ذائقہ سے آشنا کیا اور ذات کے آشوب کو موضوع بنایا۔

ڈاکٹر سلطانہ بخش لکھتی ہیں خالدہ حسین نے علامت امیجری اور تجدیدیت کے رجحانات کو اس قسم کا تاثر دیا ہے کہ اس میں روایت زمین اور تہذیبی مزاج سے ان کا تعلق استدا د نظر آتا ہے ان کی کہانیاں عصری شعور سے بریز گہری فکر اور اسلوب کے امتزاج سے سامنے آتی ہیں۔

خالدہ حسین نے اپنے دو نمایاں افسانوں سواری اور ایک رپور تاژ (مطبوعہ سویرا 1965ء) کے بعد لگ بھگ پندرہ برس کی خاموشی کا حصار توڑ کر پرندہ اور ڈیڈلیٹر کی صورت نسوانی احساس عدم تحفظ خوف اذیت اور تشکیک سے ایک قدم آگے بڑھایا اور اپنے افسانوں میں عصری شعور اور تصوف کے رچاؤ کو جگہ دی۔

خالدہ حسین کے افسانوی مجموعے پہچان اور دروازہ چند برس پہلے طبع ہوئے یہ دونوں عنوانات خالدہ حسین کے سفر کے مزاج کے ترجمان ہی نہیں اس کی علامتی پیکر تراشی بھی کرتے ہیں۔ ''پہچان'' خالدہ حسین کے افسانوں کا ایک اہم اور نمائندہ مجموعہ ہے جو نہ صرف ان کے اپنے فن کی مختلف کیفیات کا اظہار کرتا ہے بلکہ نئے افسانے کی صورت اور پہچان بھی بناتا ہے کچھ سال پہلے مصروف عورت کے عنوان سے بھی ان کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ طبع ہو چکا ہے خالدہ حسین کے یہاں بلیک ہول اور گوالن میں انکا مخصوص ماجرائی فن جلوہ گر ہے۔

پاکستان کی تاریخ میں 65ء کا سال ہماری قومی زندگی کا ایک اہم ترین سال تھا بھارت نے ہم پر شب خون مار کر زبردستی جنگ ٹھونس دی تھی اور یہ ہر اعتبار سے ایک اہم اور ناقابل فراموش واقعہ تھا اگست 1947ء کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ ہمارے عوام اور خواص کو نہ صرف اپنے وجود کا احساس ہوا بلکہ یہ ادراک بھی ہوا کہ یہ خطہ زمین ہمارے وجود کی پہچان ہے۔

پوری قوم تحفظ پاکستان کے عمل میں شامل ہو گئی تھی سترہ روزہ جنگ سے ہماری پوری قومی زندگی متاثر ہوئی شعر و ادب پر بھی اس کے اثرات مرتب ہوئے چنانچہ اس جنگ کے پس منظر میں پاکستانی افسانہ نگاروں نے بھی کئی افسانے لکھے اس حوالے سے لکھے گئے افسانوں میں خدیجہ مستور کا ٹھنڈا میٹھا پانی اور فرخندہ لودھی کا پاربتی جیسے افسانے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

فرخندہ لودھی کے اکثر افسانوں کے مرکزی کردار نسوانی ہوتے ہیں وہ عورتوں کی زندگی کے کرب اور المیے بیان کرتی ہیں پاربتی جنگ کے پس منظر میں اس حوالے سے لکھا گیا ہے یہ افسانہ صحیح معنوں میں ایک عورت کا المیہ پیش کرتا ہے یہ عورت جو آگ اور خون سے گزر کر کندن بنتی ہے یہ راکھ اتنی متحرک فعال اور زندہ ہے کہ پڑھنے والے کا سانس رک کر رہ جاتا ہے۔

فرخندہ لودھی زندگی کی چھوٹی چھوٹی غیر اہم جزئیات سے غیر معمولی تاثر پیدا کرنے والی افسانہ نگار ہیں انکے فن کی ایک خاص بات اس کا مشاہدہ ہے مشاہدہ ژرف نگاہی سے وجود میں آتا ہے فرخندہ لودھی کے مشاہدے میں یہ اچھوتا پن اس درجہ تیز ہے کہ پڑھنے والا دم بخود ہو کر رہ جاتا ہے اس کے مشاہدے کا کینوس نہایت وسیع ہے موضوع اور مشاہدے کے اعتبار سے درماندگی شوق شرابی سے بھی زیادہ بھرپور افسانہ ہے۔ اس افسانے میں ہمارے شہروں کے مکین نچلے طبقے کے ماحول کو جس طرح زندہ کیا گیا ہے اس کا اندازہ آپ کو ایک ایسی تنگ گلی میں سے گزرتے وقت

ہو سکتا ہے جہاں تین مزلہ پرانی عمارات میں کئی کئی خاندان ٹھنسے ہوئے ہیں۔
شہر کے لوگ ۔۔۔۔فنی اعتبار سے نہایت مکمل افسانہ ہے افسانہ نگار نے اپنے اصل رنگ سے ہٹ کر یہ افسانہ لکھا ہے وہ اسے پلاٹ کا افسانہ بنا گئی ہیں کیونکہ اس کی تنظیم وترتیب میں کوئی واضح سقم نہیں۔

موضوع کے لحاظ سے اس کا افسانہ معجزہ ایک عمدہ افسانہ ہے۔

فرخندہ لودھی کے افسانوں کے تین مجموعے شہر کے لوگ آرسی اور خوابوں کے کھیت طبع ہو چکے ہیں۔

ہمارے قومی ادب میں تیسرا اہم حوالہ سقوط مشرقی پاکستان کا المیہ ہے جو 6 ستمبر 1971ء کو پیش آیا اس اندوہناک سانحہ نے پوری قوم کو ہلا کر رکھ دیا سقوط مشرقی پاکستان نے جو ارتعاش پیدا کیا اہل قلم کا اس سے متاثر ہونا' ناگزیر تھا اس المیہ کو افسانے کا موضوع بنانے والی خواتین میں ام عمارہ عذرا اصغر' رشیدہ رضویہ وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔رشیدہ رضویہ کا افسانہ شہر سلگتا ہے اس موضوع کے حوالے سے ایک عمدہ افسانہ ہے۔

گھس بیٹھیے۔سانحہ مشرقی پاکستان کی دل گرفتگی میں لکھی گئی بہترین کہانی ہے جو عذرا اصغر نے 1971ء میں لکھی تھی بلا مبالغہ یہ کہانی اس بے ثبات دور کی عکاسی کرنے کے ساتھ حب الوطنی کے زندہ جاوید جذبوں کی علامت بھی بنتی ہے یہ کہانی آج بھی اتنی ہی تازہ اور شگفتہ ہے جتنی 1971ء میں تھی۔

ان اہل قلم خواتین کے علاوہ اختر جمال اور ام عمارہ نے بھی سقوط ڈھاکہ کے اثرات کو قبول کیا اور تخلیقی سطح پر اس کا اظہار کیا ہے اختر جمال کے افسانے انگلیاں فگار اپنی اور ام عمارہ کے بعض افسانے اس المیے کی شدت کو سامنے لاتے ہیں۔

مشرقی پاکستان کے حوالے سے ام عمارہ کا افسانہ کوئلہ بھئی نہ راکھ۔ واضح طور پر استحصالی قوتوں کی چہرہ نمائی کر رہا ہے گویا یہ قبل از وقت خطرے کا الارم

تھا بلکہ اس وقت کے اس نوعیت کے دیگر افسانے بھی مشرقی بنگال کے ان جذبوں کے عکاس تھے گویا مشرقی پاکستان کے کھو جانے کے درد اور کرب کو شدت سے محسوس کیا اور تخلیقی سطح پر اس کا دردانگیز اور فکر انگیز اظہار کیا۔

اختر جمال کے افسانوی مجموعوں ''انگلیاں فگار اپنی'' کے علاوہ ''سمجھوتہ ایکسپریس'' اور ''خلائی دور کی محبت'' کو بھی خاصی پذیرائی ملی۔

سمجھوتہ ایکسپریس میں متحدہ پاکستان کی سرزمین پر جنم لینے والے یادگار افسانے شامل ہیں۔

اردو ادب کی تاریخ میں خواتین افسانہ نگاروں کی ایک بہت مضبوط اور وقیع روایت موجود رہی ہے موجودہ دور میں بھی خواتین افسانہ نگاروں کی ایک بہت بڑی تعداد موجود ہے نزہت زہرا گردیزی بھی اسی قافلہ میں شامل ہے ان کے اردو افسانوں کا پہلا مجموعہ تھکن کے عنوان سے طبع ہو چکا ہے۔

ان کے افسانوں کا بنیادی موضوع معاشرتی تضادات کا المیہ ہے اس مجموعہ میں شامل دو افسانے سقوط جاں اور تھکن پاکستان کے دولخت ہونے کے المیے سے متعلق ہیں۔

داؤد رضوان کے مطابق یہ افسانے اردو ادب کی تاریخ میں یقیناً نمایاں حیثیت کے حامل ہیں تھکن افسانے کا موضوع دوہری بے وطنیت کے شکار بہاریوں کے اجتماعی المیہ کی کہانی ہے جبکہ سقوط جان اس مجموعے میں سب سے زیادہ بھرپور تاثر انگیز اور مضبوط بنت کا خوبصورت افسانہ ہے۔

ڈاکٹر سلطانہ بخش کے مطابق ستر کی دہائی کے آخر میں مارشل لاء کی فوجی آمریت نے سنجیدہ اور جمہوریت پسند اہل قلم کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور اس نئی صورتحال میں اپنا کردار ادا کرنے کی مقدور بھر کوشش کی آزادی اظہار پر پابندی کے باوجود ادباء کا تخلیقی عمل جاری رہا۔

اس دور کی تخلیقات میں ایک جانب تو حزن وملال افسوس مایوسی اور جبر کی موجودگی کا دکھ نظر آتا ہے تو دوسری طرف روشن مستقبل کے خواب دکھائی دیتے ہیں اس دور کا ادب احتجاج اور رد عمل کی مختلف سطحوں کا آئینہ دار ہے جبریت کے اس دور میں دیگر افسانہ نگاروں کے ساتھ ساتھ خواتین میں فریدہ حفیظ کا افسانہ رب نہ کرے سعیدہ گزدر کا آگ گلستان بنی ۔ اور فہمیدہ ریاض کا عورت اور چیتا قابل ذکر افسانے ہیں۔

یہ افسانے مارشل لاء کے جبر طبقاتی نظام جمہوریت دشمنی اور اسلام کو ایک استحصالی حربے کے طور پر استعمال کرنے کے خلاف شدید احتجاج کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سقوط مشرقی پاکستان سے چند برس قبل پیچھے مڑ کر دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ ہمارے جدید افسانہ نگاروں کا ایک گروہ جو کہانیوں کے ذریعے معاشرتی گھٹن اور استبداد کا نوحہ پڑھ رہا تھا اس نے ساٹھ کی دہائی کے بعد ایسا ادب تخلیق کیا جو جمہوریت کے فقدان کے زمانے میں جمہوری امنگوں کا نہ صرف آئینہ دار رہا بلکہ معاشرتی اور معاشی عدم مساوات کو ایک ایسے نظام سیاست کا لازمی نتیجہ قرار دیا جو فرد کی آزادی اور جمہوری اقدار پر یقین نہ رکھتا ہو خواتین میں الطاف فاطمہ اور دیگر افسانہ نگاروں کے ہاں بہر حال ایک ایسا رجحان نظر آتا ہے جو حکمران قیادت کی غلط کاریوں پر کبیدہ خاطر ہو۔ پاکستانی معاشرے میں بدلتی اقدار اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل الطاف فاطمہ کے افسانوں کے بنیادی موضوعات ہیں جن میں شدت احساس نمایاں ہے۔

جب دیواریں گریہ کرتی ہیں کے عنوان سے الطاف فاطمہ کا افسانوی مجموعہ طبع ہو چکا ہے انہوں نے اردو افسانے میں اپنی تخلیقات سے اہم اضافے کئے ہیں وہ عام موضوعات کو عام انداز میں اس طرح بیان کرتی ہیں کہ ہر بات حقیقت سے قریب تر معلوم ہوتی ہے۔ 1960ء کے دہے میں نمایاں ہونے والے افسانہ نگاروں

(خواتین و حضرات) کی کھیپ میں اکثریت اگرچہ علامتی افسانے کی دلدادہ تھی مگر اس دور میں کچھ ایسے افسانہ نگار بھی سامنے آئے جنھوں نے علامت کے سکہ رائج الوقت ہونے کے باوجود بیانیہ انداز کو اہمیت دی اور ایک ایسے دور میں جب افسانے میں سے کہانی غائب ہو رہی تھی کہانی سے اپنا رشتہ برقرار رکھنے والی خواتین میں عذرا اصغر سائرہ ہاشمی 'مسرت لغاری اور فرخندہ لودھی وغیرہ نمایاں ہیں۔

ڈاکٹر بشیر سیفی کے مطابق -ان میں سے بعض افسانہ نگاروں نے اگر علامت کا استعمال کیا بھی تو اسے معمہ نہیں بننے دیا اسی لیے میں انہیں بیانیہ روایت ہی کی کڑی سمجھتا ہوں۔

تاہم ڈاکٹر سلطانہ بخش لکھتی ہیں فرخندہ لودھی کے افسانوں میں علامتی انداز اظہار موجود ہے لیکن علامتیں کہانی کے زیر سایہ آگے بڑھتی نظر آتی ہیں اور اپنے مفاہیم اجاگر کرتی چلی جاتی ہیں۔ حقیقت اور علامت کا جو نقطہ اتصال فرخندہ لودھی نے دریافت کیا وہ کتنے ہی نئے امکانات کی جانب معاصر افسانے کی سمت نمائی کرتا ہے۔

1960ء کے عشرے میں لکھا جانے والا افسانہ مجموعی طور پر علامتی افسانہ تھا لیکن 1970ء کے بعد آتے آتے دور از کار علامتوں کا استعمال رفتہ رفتہ اعتدال پر آگیا اور افسانے میں کہانی پن کی ضرورت و اہمیت کا احساس کر لیا گیا 1980ء کے بعد کا دور کہانی کی بازیافت کا دور ہے 1970ء اور اس عشرے کے آس پاس فردوس حیدر، شمع خالد 'ارجمند شاہین اور افشاں عباسی وغیرہ سامنے آئیں۔

مسرت لغاری اور نگہت لغاری نے ایک ساتھ افسانہ نگاری کا آغاز کیا تھا ان کے کچھ افسانے منظر عام پر آئے تو ان سے نقادوں نے کچھ توقعات وابستہ کر لی تھیں اس لیے بھی کہ ان کا آغاز تقریباً خدیجہ مستور اور حاجرہ مسرور جیسا تھا لیکن جب ان دونوں بہنوں کی شادیاں ہو گئیں تو یہ دونوں ایک طویل عرصے تک گوشہ نشین

رہیں لیکن بعد میں مسرت لغاری نے پھر سے افسانے لکھنے شروع کر دیئے اس کے افسانوں کا پہلا مجموعہ گھر ہونے تک کے عنوان سے طبع ہو چکا ہے اس کی دوسری کتاب مصنفہ کے ایک نئے رخ کو سامنے لاتی ہے یہ کتاب اس کی مزاحیہ تحریروں کا مجموعہ ہے جس کا نام ہے تبسم زیر لب اس مجموعہ میں شامل تحریریں بے حد شگفتہ اور دلچسپ ہیں۔

نگہت سیما' اردو افسانہ نگاروں کی اس نسل سے تعلق رکھتی ہیں جو اس صدی کی آٹھویں دہائی میں معروف ہوئی اس دور میں تجریدی اور علامتی افسانہ اپنا عروج دیکھ چکا تھا اور اب کسی نئے تجربے کا منتظر تھا نگہت سیما نے کہانی کے تار پود کو قائم رکھا لیکن تجرید اور علامت سے بھی خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔

دلکش اسلوب میں کہانیاں لکھنے والی افسانہ نگار خواتین میں عذرا اصغر کا نام نمایاں ہے۔

نئی اردو کہانی میں اسلوب کے بہت تجربے کیے گئے اور گہری علامتی دبازت سے تجریدی اور حقیقت نگاری تک کئی ذائقوں سے آشنا رہی ہے عذرا اصغر کی تخلیقات اس زمانے میں منظر عام پر آئیں جب اردو افسانہ ایک نئی کروٹ لے رہا تھا1960ء کی دہائی کے بعد یہ افسانہ جو ایک نئی فضا لے کر سامنے آیا جس نے ایک نئے مزاج کی تشکیل کی جو علامتی تجریدی یا تمثیلی افسانہ کہلایا لیکن عذرا اصغر نے اپنی کہانیوں میں اس نوعیت کے تجربے کر کے کہانی کو بوجھل نہیں ہونے دیا ان کے افسانے اس انداز سے یکسر مختلف ہیں۔

عذرا اصغر با مقصد لکھاری ادیبہ ہیں بے راہ روی کے اس دور میں وہ سنجیدہ معیاری افسانے لکھ رہی ہیں ان کے افسانے لکھنے کا انداز روایتی سہی لیکن وہ اپنے افسانوں میں کہانی اور کردار نگاری پر خاص توجہ دیتی ہیں اور ان کے افسانوں کے مطالعہ سے مصنفہ کے ذہنی ارتقاء کا خوبی اندازہ ہوتا ہے ان کے افسانہ آرزو کا پھول

میں زندگی کو فطری طور پر حسین بنانے کا مثبت جذبہ موجود ہے اسی طرح ان کا ایک اور نمائندہ افسانہ اور شمع بجھ گئی تھی اس نوعیت کا افسانہ ہے جس میں احساس کا شعلہ بھڑک رہا ہے۔

مزید برآں عذرا اصغر کا فنی اور تخلیقی کمال یہ ہے کہ معمولی واقعہ اور عام مشاہدے کے باوجود سماجی حقیقت کو خوبصورت افسانے کے روپ میں ڈھال دیتی ہیں۔

ان کے افسانوں کے چار مجموعے طبع ہو چکے ہیں پت جھڑ کا آخری پتا (اپریل 1980ء) بیسویں صدی کی لڑکی (1989ء) تنہا بر گد کا دکھ (1990ء) گدلا سمندر (1997)ء۔

سیدہ حنا کے افسانوں کے موضوعات کی رنگارنگی 'اسلوب کی پختگی اور زبان کا خوبصورت اور برمحل استعمال ان کی قدرت فن کا منہ بولتا ثبوت ہے نیز ان کے افسانوں کی نمایاں خصوصیت کہانی پن کا ہونا ہے وہ اپنے افسانوں میں اپنے عہد کے تجربے اور مشاہدے چابکدست فنکار کی طرح اس انداز سے کرتی ہیں کہ پڑھنے والا اکتانے کے بجائے خود کو اس ماحول کا حصہ سمجھنے لگتا ہے۔ سیدہ حنا کے افسانوں کے دو مجموعے طبع ہو چکے ہیں۔

''پتھر کی نسل''

''جھوٹی کہانیاں''

سیاسی جبریت کے دور میں دیگر افسانہ نگاروں کے ساتھ ساتھ سعیدہ گزدر کا افسانوی مجموعہ آگ گلستان بنی 1980ء میں شائع ہوا تو اس پر پابندی لگا دی گئی اس مجموعہ میں شامل تقریباً ہر فسانے میں اس دور کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔

سائرہ ہاشمی، انسانی زندگی کی ایک زیرک ناظر ہیں۔ ان کی پہلی کہانی

1973ء کے رسالہ ''نیا دور'' میں چھپی تھی، جس کا عنوان تھا ''سنگ میل''۔ سائرہ ہاشمی بہت طویل کہانیاں لکھنے کے لیے مشہور ہیں۔ ان کی کہانیوں میں غم اور سنجیدگی کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔ وہ عورتوں کے مسائل کا گہرا شعور رکھتی ہیں۔ ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے انہوں نے اکھڑے ہوئے معاشرے اور رنگ بدلتے انسانوں کی کہانیاں لکھی ہیں۔ ان کے افسانوں کے مجموعے ''تماشہ ہو چکا''، ''ریت کی دیوار'' اور ''وہ کالی ہو گئی'' طبع ہو چکے ہیں۔

فردوس حیدر جدید دور کی معروف و منفرد افسانہ نگار اور ناول نویس ہیں ان کی ادبیات کا سرمایہ ان کی نثری تصانیف ہیں۔ خواہ وہ افسانوں کی صورت میں ہوں یا ناولوں، سفرناموں، ڈراموں اور کتابوں کی شکل میں فردوس حیدر ایک ادیبہ ہیں، معلمہ ہیں، مصور ہیں اور ملکوں ملکوں کی سیاحت کرنے کی دلدادہ بھی ہیں۔ ان کی رنگا رنگ شخصیت کی ان تمام جہتوں کا اظہار ایک ادبی ذوق و شعور کے ساتھ ہوا ہے۔ بلا شبہ ان کا شمار صاحب طرز اہل قلم خواتین میں ہوتا ہے۔ انہوں نے افسانہ نگاری کا آغاز 1965ء میں کیا۔ ان کے افسانوں کا سب سے نمایاں پہلو ان کے اپنے عہد کا اور اپنے سماج کا شعور ہے۔ فردوس حیدر نے اپنے گردو پیش کا گہرا اثر لیا ہے

ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''راستے میں شام'' 1982ء میں طبع ہوا۔ اس مجموعے میں بیانیہ اور علامتی دونوں طرح کے افسانے شامل ہیں، ان میں کچھ افسانے تو بے حد چونکا دینے والے ہیں۔ خاص طور پر ''مجازی خدا''، ''نوبل پرائز''، ''سو سو کے پانچ نوٹ'' اور ''گائے'' کے علاوہ ''راستے میں شام'' جیسے افسانے زندگی کے گرد گھومتے ہیں۔ ان کہانیوں میں عورت ایک تشنگی بن کر ابھرتی ہے۔

شازیہ جبیں اپنے مقالہ میں لکھتی ہیں، ''فردوس حیدر کا افسانہ ''راستے میں شام'' عورت کی تحقیر کے ایک اور انداز کو پیش کرتا ہے۔ یہاں شوہر اور بیوی کے تعلق میں ایک سرد جنگ کو ابھارا گیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے''۔

میرے شوہر کے تین نام ہیں پتھر، ٹھنڈک اور قوت، لیکن میرا نام صرف ایک نام ہے ''چپ''۔ ان کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ''بارشوں کی آرزو'' ہے۔ جس کے اب تک دو ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں۔ پہلی بار 1988ء میں دوسری بار 1990ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں علامتی اور بیانیہ دونوں طرح کے افسانے شامل ہیں۔ ''پتھر میری تلاش میں'' فردوس حیدر کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن 1992ء میں جبکہ 1994ء میں دوسری بار طبع ہوا۔

فردوس حیدر کے افسانوں میں کہانی پن ہے اور یہ بہت متنوع کیفیت ہے۔ یہ محض پختہ پلاٹ کی بُنت تک محدود نہیں اسے تو نفس انسانی کے پیچ در پیچ تجربوں کے بیان کو بھی کہانی مانا آتا ہے۔ انہوں نے جب افسانوی سفر کا آغاز کیا وہ علامت نگاری کا دور تھا۔ مگر فردوس حیدر نے بیانیہ اسلوب اپنایا۔ اور ساتھ ہی علامتی افسانوں میں ''گائے'' جیسا شاہکار افسانہ بھی تخلیق کیا۔ ''گائے'' عورت کی محرمی پر مبنی افسانہ ہے۔ فردوس حیدر نے افسانے کی ابتدائی سطور میں ایک دلہن کی کیفیات کو خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ جس کے ارمان پورے نہیں ہوئے۔ اور وہ مسلسل انتظار کے کرب سے گزر رہی ہے۔ دلہن کی کیفیت کے بعد ''گائے'' کے ڈکارنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس طرح نو بیاہتا دلہن اور گائے میں مماثلت پیدا کی ہے۔ عورت مسلسل اپنے شوہر کا انتظار کر رہی ہے اور ''گائے'' ...... فردوس حیدر کا افسانہ ''بدل گئے موسم'' بھی کچھ اسی نوعیت کا افسانہ ہے۔

اکرام بریلوی کے لفظوں میں ''فردوس حیدر اگرچہ ترقی پسند نہیں مگر وہ ترقی پسندوں سے کسی طرح بھی پیچھے نہیں''۔

جمیلہ ہاشمی . . افسانہ نگار خواتین میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ''آپ بیتی جگ بیتی'' اور ''اپنا اپنا جہنم'' کے عنوانات سے جمیلہ ہاشمی کے افسانوی مجموعے چھپ چکے ہیں۔ جمیلہ ہاشمی اپنے افسانوں میں زندگی اور ماحول کے

مختلف پہلوؤں اور سماجی ناہمواریوں کو اجاگر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں ان رویوں کو سلیقہ کے ساتھ برتا گیا ہے۔ وہ ماحول میں ڈوب کر لکھتی ہیں۔ ایک عرصہ تک انہوں نے سکھوں کے معاشرے کے ایسے افسانے لکھے کہ سکھ کلچر اور (روہی) کلچر کے افسانوں میں زندہ اور حقیقی نظر آتے ہیں۔ انہوں نے چولستان پر بھی توجہ دی۔ روہی کو ایک ایسے زندہ کردار کی صورت میں متعارف کرایا جو دلوں میں محبت پیدا کرتا ہے۔ شدت اسی جادوئی سرزمین کا افسانہ اور جمیلہ ہاشمی کے فن کا ایک نادرہ کار نقش ہے۔

1970ء کے بعد بیشتر افسانہ نگار خواتین نے اردو افسانے کے لیے تہہ داری اور پرتدار معنویت کی فضا پیدا کی اور ہمارے سامنے افسانہ نگاروں کی ایک ایسی کہکشاں پیش کردی جو یک سطحی افسانے کی جائے کہانی کے مفہوم کو کئی سطحوں پر پیش کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ان میں سے اگر سب کے نہیں تو کچھ کے افسانے معیاری رسائل کے علاوہ اخبارات کے ادبی صفحوں میں بھی چھپتے رہتے ہیں۔ جن کی ایک بہت ہی طویل فہرست بنتی ہے۔ جن کے نام گنوانا بہت مشکل ہے۔ تاہم اس بات کا اعتراف کرنے میں بخل سے کام نہیں لینا چاہیے کہ وہ متعدد افسانے لکھ کر اس کہکشاں کو روشن کرتی رہی ہیں اور ان میں سے کچھ نے تو اپنا شعلہ تخلیق فروزاں رکھا ہوا ہے۔

1991-90ء میں جو افسانہ نگار خواتین تخلیق فن میں مصروف نظر آتی ہیں اور اس عرصہ میں جن کے افسانوی مجموعے طبع ہوئے وہ معیار اور تعداد کے لحاظ سے کسی طرح غیر تسلی بخش نہیں ہیں۔ ان میں ام عمارہ کا ''آگہی کے ویرانے''، فردوس حیدر کا ''بارشوں کی آرزو''، الطاف فاطمہ کا ''تار عنکبوت''، قدسیہ ہما کا ''تتلیوں کے پر''، نزہت گردیزی کا ''تھکن''، عذرا اصغر کا ''تنہا مرگ کا دکھ''، زینت قاضی کا ''جلتے سورج تلے'' فرخندہ لودھی کا ''خوابوں کے کھیت''،

''سائرہ ہاشمی کا ''ردی کا ٹکڑا''، اختر جمال کا ''سمجھوتا ایکسپریس''، ممتاز شیریں کا ''ظلمت نیم روز''، گوہر سلطانہ عظمی کا ''غلام عورتیں''، ڈاکٹر پروین عظیم کا ''گورکی کی ماں''، افشاں عباسی کا ''کانٹوں پر سفر'' نیلم احمد بشیر کا ''گلابوں والی گلی'' وغیرہ وغیرہ ادبی حلقوں میں خاص طور پر پسند کیے گئے۔

علاوہ ازیں 1991ء میں بانو قدسیہ نے ''تنکے کا سہارا''، ام عمارہ نے ''سچ کا دکھ''، فرخندی لودھی نے ''آخری موم بتی''، رشیدہ رضیہ نے ''بند کمرے میں سورج''، عذرا اصغر نے ''گدلا سمندر'' جیسے خوبصورت افسانے لکھ کر اردو افسانے کی صنف میں اضافے کیے ہیں۔

یہ افسانے تکنیک کے اعتبار سے بھی اور نظریاتی لحاظ سے بھی قابل قدر ہیں۔ پچھلے کچھ برسوں میں لکھے گئے افسانہ نگار خواتین کے مجموعوں کا مطالعہ کرتے ہوئے یقیناً آپ بھی اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ہمارا اردو افسانہ آج بھی توانا ہے۔ اور موضوعات و اسالیب کے تنوع کے ساتھ فن کی نئی جہات کی جانب مائل پرواز ہے اور واقعی ان افسانوں میں اسالیب خیالات اور موضوعات کی رنگا رنگی دکھائی دے گی۔ ان اہم افسانوی مجموعوں میں جمیلہ ہاشمی کا ''رنگ بھوم''، رفعت مرتضی کا ''بیس سال بعد'' سلمی اعوان کا ''بچ بچولن''، عظمی گیلانی کا ''ع۔ عورت م۔ مرد''، گلنار آفرین کا ''پلک پلک کٹی رات'' اور قدسیہ ہما کا ''سرد گلی میں سورج'' وغیرہ شامل ہیں۔ پاکستانی اردو افسانے کے موجودہ دور میں نسبتاً جو معروف افسانہ نگار سامنے آئیں اور افسانوں کے مجموعوں میں عمدہ اضافے کیے ہیں ان میں کئی نمایاں ہیں۔

فہمیدہ اختر ایک باشعور اور ترقی پسند فنکارہ تھیں۔ اس کا شعور ایک انسان دوست ترقی پسند اور دردمند ذہن کا شعور تھا۔ جسے تنزل پذیر رجحانات سے نفرت تھی اور جو تنگ نظری، تنگ دلی اور خاندانی عصبیت کے خلاف تھی۔ وہ روشن خیال

فکشن نگار تھی اس میں لکھنے کی بے پناہ قوت تھی۔ نئے ادب، نئے رجحانات ترقی پسند اقدار اور جدید ادبی تقاضوں پر اس کی گہری نظر تھی اور وہ جرأت مند بھی تھی۔ اس نے آزاد قبائلی علاقے کے ناہموار میدانوں میں بکھرے ہوئے خانہ بدوشوں کے خیموں، پہاڑی سلسلوں میں چھپے ہوئے مٹی کے گھروں اور خواتین کے پُر شکوہ حجروں میں سے افسانوں کے لیے افراد نکالے۔

فہمیدہ اختر کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''اپنے دیس میں'' 1961ء میں اور دوسرا مجموعہ ''کشمالا'' 1968ء میں طبع ہوا۔ فہمیدہ اختر کی کہانیاں ''دریائے باڑہ کی فاتح''، ''ندی اور پھول''، ''شاداب وادی کا ہیرو''، ''لمبی پلکوں کے سایوں میں''، ''دیوی''، ''زرسانگہ''، ''اپنے دیس میں''، ''جلتے دیے'' اور ''کشمالا'' وغیرہ ان بھولی بھالی، سیدھی سادھی، زیور تعلیم سے عاری مگر غیور، خوددار اور غیرت مند زندگیوں کے مرقعے ہیں جو آزاد فضاؤں میں سانس لیتی ہیں۔

بشریٰ رحمٰن کا شمار وطن عزیز کی ان اہل قلم خواتین میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو ادب میں قدیم اور جدید افسانوی روایت کے خوبصورت امتزاج کے حوالے سے فکشن لکھنے والی خواتین میں ایک منفرد مقام حاصل کیا۔

''قلم کہانیاں''، ''عشق عشق'' کے بعد ''پشیمان'' تک ان کا افسانوی سفر ان کے فکری ارتقاء کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ بشریٰ رحمٰن نے طویل اور مختصر دونوں طرح کے افسانے لکھے ہیں۔ مگر اب تک کوئی تجریدی اور علامتی افسانہ نہیں لکھا۔

بشریٰ رحمٰن کا تقریباً ہر افسانہ عورت کی بے بسی یا مظلومیت کی عکاسی کرتا ہے۔ ان کے افسانے عصری شعور کے ترجمان ہیں، ان کی تحریروں میں روایت کی پاسداری نظر آتی ہے۔ پاکستان میں اب تک جو اردو افسانہ لکھا گیا ہے اس میں ایک بھاری تعداد خواتین افسانہ نگاروں کی بھی ہے جنھوں نے افسانے میں بہت سی

تبدیلیاں پیش کی ہیں۔ اس حوالے سے عطیہ سید، شمع خالد، نیلم احمد بشیر اور ندرت فاطمہ کے نام اہم ہیں۔

امریکیوں کی زندگی کے کئی گوشے جو پاکستانیوں کی نظروں سے اوجھل ہیں، وہ پاکستانی جو امریکہ جاتے ہیں وہ امریکیوں کے گلیمر کے سبب یا پھر اپنی خریداری کی مصروفیت کے باعث ان پہلوؤں کو دیکھ نہیں پاتے۔ ایسی ہی کئی بہت سی حیران کن اور پریشان کن دیگر باتیں ہیں جن کا عطیہ سید نے اپنے افسانوں میں تفصیل سے بیان کیا ہے اور تجزیہ بھی کیا ہے۔ ''کرسمس کی شب''، ''چھ بجے کی خبر''، ''میری میرا'' وغیرہ امریکی زندگی کے چونکا دینے والے پہلوؤں کی نقاب کشائی کی ہے۔

عطیہ سید کی کہانیوں کا مجموعہ ''شہر ہول'' طبع ہو چکا ہے۔ افتخار جالب لکھتے ہیں، عطیہ سید کی کہانیوں کا مواد امریکن بودوباش سے حاصل کیا گیا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ عطیہ سید نے یہ استعداد کیونکر بہم پہنچائی۔ ان کہانیوں میں امریکن زندگی کی گہری واقفیت رچی بسی ہوئی ہے۔ ان کہانیوں میں جو سوالات اٹھائے گئے ہیں اگرچہ وہ امریکن طرز زندگی سے ہی متعلق ہیں لیکن اس پیرائے میں اٹھائے گئے ہیں کہ وہ بھرپور معنویت کے حامل ہو گئے ہیں۔ ''ہوٹل ہلازاد''، ''بنت اسرائیل''، ''پری زاد''، ''شہر ہول'' ایسی کہانیاں ہیں جنہیں امریکی معاشرے کی گہری بصیرت کے بغیر نہیں لکھا جا سکتا۔

''خزاں میں کونپل'' کا اختتامیہ انسانی امیدوں کا لافانی افق ہے۔ عطیہ کی کہانیوں کی ساخت ایک خاص انداز کی ہے۔ پہلے مرکزی واقعہ یا کردار آتا ہے جو بتدریج آگے بڑھنا شروع کر دیتا ہے پھر چند ثانوی کردار یا واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ ان کا ابتدائی تعارف کہانی کی شکل وصورت کو اجاگر کرتا ہے۔

نیلم احمد بشیر کے افسانوں کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ اردو افسانے کے افق کو وسعت دے رہی ہے۔ نیلم احمد بشیر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ

اس نے اپنے اظہار کے لیے امریکی معاشرے کا انتخاب کیا ہے اس لیے کہ اسے امریکہ میں چودہ سال رہنے کا تجربہ ہے۔ اس دوران اس نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا اسے نہایت خوبصورتی سچائی اور دردمندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

''ٹرک اور ٹریٹ''، امریکی طرز حیات کے ایک نہایت مکروہ پہلو کے بارے میں بہت ہی دلدوز افسانہ ہے۔ نیلم احمد بشیر نے ''چارہ گر'' لکھ کر ثابت کر دیا ہے کہ اسے کردار نگاری پر بھی غیر معمولی قدرت ہے اور وہ کردار کی بنیاد پر بھی کامیاب افسانے لکھ سکتی ہے۔

یہ کہنا درست نہیں کہ نیلم احمد بشیر کے سارے افسانے امریکہ کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں۔ اس نے پاکستان کے بارے میں خصوصاً عصری زندگی کے بارے میں بہت عمدہ افسانے لکھے ہیں۔ اس کا افسانہ ''میں اور میرا ساتھی'' آج کے دور کے ایک اہم مسئلے ۔ ۔ ۔ ۔ مرد کے مقابلے میں عورت کے مساوی حقوق سے متعلق ہے۔ اسی موضوع پر اس کا ایک اور افسانہ ''لالی کی بیٹی'' ہے۔ مردانہ معاشرے میں عورت کے مساوی حقوق کے مطالبے نے ازدواجی زندگی میں جو مسائل پیدا کیے ہیں ''لالی کی بیٹی'' اسی مسئلے سے متعلق ہے۔ نیلم احمد بشیر نے اپنے افسانوں میں فرد کے تضاد سے کئی خوبصورت افسانے تخلیق کیے ہیں مثلاً ''دن چڑھے کا پھول''، ''میلی روحیں'' اور ''شریف'' لیکن ان میں ''شریف'' سب سے عمدہ افسانہ ہے۔ محترمہ موصوفہ نے اگرچہ بہت اچھے افسانے لکھے ہیں تو کمزور افسانے بھی لکھے ہیں۔ ان میں سب سے کمزور افسانہ ''پانی کا قطرہ'' ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ اس کے ابتدائی دور کے افسانوں میں سے ہے۔

نیلم احمد بشیر کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''گلابوں والی گلی'' 1990ء میں دوسرا مجموعہ ''جگنوؤں کے قافلے'' 1993ء میں طبع ہوا جبکہ حال ہی میں اس کا تیسرا مجموعہ ''سچ جیسے سپنے'' چھپ کر آیا ہے۔

''منزلیں دار کی'' ندرت فاطمہ کے بارہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جو ندرت فاطمہ کے فنی سفر میں اہم سنگ میل قرار پایا ہے۔ ندرت فاطمہ نے افسانوی تکنیک کے جدید لوازم کو خوب برتا ہے۔

بانو قدسیہ، رضیہ فصیح احمد، شکیلہ رفیق اور سیما پیروز اردو افسانوی ادب میں اہم نام ہیں۔

بانو قدسیہ فکشن پر قدرت رکھتی ہیں۔ انہوں نے کہانی کی بنت میں معاشرتی حقائق اس خوبی اور خوبصورتی سے شامل کیے ہیں کہ زندگی کوئی راز پوشیدہ نہ رکھ سکی۔ چنانچہ بانو قدسیہ کے زندگی آمیز افسانے، تجربے اور مشاہدے کی بھٹی سے نکل کر ایک بھرپور اور مکمل شکل میں قاری کے سامنے آتے ہیں۔ ان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ موصوفہ اپنے افسانوں کے کرداروں کی نفسیاتی تصویر کشی میں بہت کامیاب ہیں۔ بانو قدسیہ کے افسانوں کے مجموعوں میں ''امر بیل''، ''بازگشت''، ''کچھ اور نہیں'' کے علاوہ ''ناقابل ذکر'' کو خاصی پذیرائی ملی۔

رضیہ فصیح احمد کا پہلا افسانہ ''نا تمام تصویر'' 1948ء میں رسالہ عصمت میں طبع ہوا تھا۔ ان کے افسانے عام طور پر پلاٹ کے افسانے ہیں، حقیقت نگاری کے ترجمان ہیں اور مصنفہ افسانے کی دنیا میں جداگانہ اسلوب کی حامل ہیں۔ ان کی کہانیوں کی خصوصیت میں سب سے اہم یہ کہ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا بیشتر حصہ قابل مطالعہ ہے۔

گنتی کے پچھلے چند برسوں میں لکھے گئے ان کے افسانوں کے علاوہ پہلے کے افسانوں میں ''چوہا''، ''گنبد بے در''، ''بہلاوے''، ''کانٹوں کا ہار'' اور ''گھاؤ'' کا مطالعہ کیا جائے تو واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ تین دہے پہلے وہ اپنے لیے مستقل جگہ بنا چکی تھیں۔

''نقاب پوش''، ''رام پیاری''، ''کالی برف''، ''سرگوشی''،

''بالاخانہ'' اور ''بارش کا آخری قطرہ'' کے عنوانات سے ان کے افسانوی مجموعے طبع ہو چکے ہیں۔

ان کے افسانوی مجموعہ ''نقاب پوش'' میں لاہور اور کراچی جیسے پر ہنگام شہروں کے گلی کوچوں میں جنم لینے والی زندگی سے قریب تر کہانیاں شامل ہیں۔ ''بے سمت مسافر'' رضیہ فصیح احمد کا تازہ افسانوی مجموعہ ہے، ''آشیاں گم کردہ'' اس مجموعے کی آخری کہانی ہے اور یہ ان کی دیگر تحریروں سے ہیت اور مواد کے لحاظ سے مختلف ہے۔ ان کا افسانہ ''ڈائن'' اردو کے بہترین افسانوں میں شمار کیا جا سکتا ہے جو موضوع کے اعتبار سے بھی منفرد ہے اور انداز بیان کے لحاظ سے بھی۔

شکیلہ رفیق آج کی افسانہ نگار ہیں۔ وہ افسانے میں تجربات کی مخالف نہیں خود ان کے بعض افسانوں مثلاً ''یقین و گماں کے بیچ''، ''اور پل ٹوٹ گیا'' یا ''خواب اور آگ'' میں کسی نہ کسی نوعیت کے تجربے ملتے ہیں لیکن قاری اور افسانہ نگار کے درمیان تفہیم کا رشتہ کبھی نہیں ٹوٹتا۔

''خوشبو کے جزیرے'' شکیلہ رفیق کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے، ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''کچھ دیر پہلے نیند سے'' تھا۔ مصنفہ محترمہ بیانیہ انداز کی افسانہ نگار ہیں یہ انداز بہت عام ہے۔ دنیا کے متعدد بڑے افسانہ نگاروں نے اظہار کا یہی انداز اپنایا ہے اور بہت خوبصورت کہانیاں لکھی ہیں۔

زمانے کی بدلتی ہوئی کروٹوں نے انسان کو نئے نئے مسائل سے دوچار کیا اور نئی نئی مشکلات کو، کوہ بے ستون بنا کر سامنے کھڑا کر دیا ہے۔ ان مشکلات کا حل دریافت کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں لیکن زرخیز تخلیقی ذہنوں کی شگفتگی ابھی ماند نہیں پڑی ان اذہان کا عمل جاری ہے۔ تخلیقی اذہان کے عمل کا ایک واضح ثبوت افسانہ بھی ہے۔ افسانہ دور جدید کی پیداوار ہے، اس کی پیداوار میں موجودہ عہد کی پیچیدگیوں کا بڑا ہاتھ ہے۔

80ء کے دہے کے آس پاس افسانہ نگار خواتین کی ایک تازہ دم کھیپ سامنے آئی جن میں سے بعض نے چند افسانوں سے شہرت اور نام پیدا کر لیا ان میں سے بعض کا مرتبہ تو بہت بلند ہے انہوں نے اس خلاء کو پر کیا جو معیاری افسانوں کی کمی کے باعث یہاں کی ادبی تاریخ میں پیدا ہو چکا تھا۔

ثریا شہاب، نگہت سلیم، رفعت مرتضےٰ اور صبیحہ شاہ کا شمار دور جدید کی پاکستانی افسانہ نویس خواتین میں ہوتا ہے۔

ثریا شہاب کے افسانوں کا مجموعہ ''سرخ لباس'' کے عنوان سے طبع ہو چکا ہے۔ ان افسانوں کے مطالعہ کے بعد ان کہانیوں کا تجزیہ کیا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنفہ نے دو تہذیبوں (مشرقی اور مغربی) کی باتیں کی ہیں۔ دونوں مقامات پر ایک عورت تسلسل کے ساتھ بولتی نظر آتی ہے لیکن ان میں اپنی معاشرتی اقدار اور مغربی معاشرے کا فرق محسوس ہوتا ہے۔ ''سرخ لباس'' میں شامل سب ہی نہیں تو چند افسانے بہت ہی عمدہ افسانے ہیں۔ کتاب کے عنوان کی نسبت سے افسانہ ''سرخ لباس'' میں مصنفہ نے ایک عورت کی حیثیت سے مغربی معاشرے کی گراوٹ اور پستیوں کو جس طرح محسوس کیا اسے پیش کر دیا ہے اور یہ مجموعے کا واقعی ایک بہت ہی عمدہ اور خوبصورت افسانہ ہے جبکہ ''خالی ہاتھ'' میں ثریا شہاب کے اندر چھپی ہوئی ماں کی ممتا بھری آواز سنائی دیتی ہے۔ اسی طرح'' رات اور رنگ'' تنہائی کی کہانی ہے جو خود کلامی کے انداز میں بیان کی گئی ہے۔ اسی مجموعے میں شامل افسانہ ''دھند'' میں بیوی کی صورت میں ایک عورت کا کردار اجاگر کیا گیا ہے۔

مجموعی طور پر ثریا شہاؔب نے اپنے افسانوں میں ایک عورت کے مسائل کی نمائندگی کا حق ادا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ علاوہ ازیں زبان و بیان اور ہیئت کے اعتبار سے بھی ان کی تقریباً تمام کہانیاں معیاری کہانیوں کی فہرست میں شامل کی جا سکتی ہیں۔ ثریا شہاؔب نے ایک اچھے افسانہ نگار کی طرح اختصار سے کام لیا

ہے۔

ہر لکھاری کا انداز بیان دوسرے لکھاری سے مختلف ہوتا ہے اور اسکی پہچان اس کا اسلوب ہوتا ہے۔ نگہت سلیم کے افسانے مختلف ادبی رسائل میں چھپتے رہتے ہیں، اس کے افسانوں میں وہ سب کچھ ہے جو ایک بلند نظر اور چابکدست افسانہ نگار کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ اس کے افسانے زیادہ تر نفسیاتی تجزیہ کے حامل ہوتے ہیں ان میں ایک ایسی کشمکش پائی جاتی ہے جو انسان کے اندر محسوس ہوتی ہے۔ نگہت کے چند افسانے مثلاً ''کیبل وستو''، ''آسیب میڈم'' ''زنگاری'' ''باکرہ'' اور ''بے ستون آئینہ'' اسلوب، فکر اور تاثر کے اعتبار سے خاص طور پر بہت پسند کیے گئے ہیں۔ نگہت سلیم کے چند افسانوں کے تراجم ہندی اور فارسی میں بھی ہو چکے ہے۔

افسانہ نگار خواتین کے اس جمگھٹے میں صبیحہ شاہ نمایاں نام نہ سہی لیکن وہ نسبتاً معیاری افسانے لکھتی ہے۔ اس کے افسانوں کا مجموعہ ''سائبان شیشے کا'' کے عنوان سے طبع ہو چکا ہے۔

رفعت مرتضےٰ کا نام بہت معیاری لکھنے والیوں میں ہوتا ہے۔ اس کا افسانہ ''پہلا پتھر'' بے حد متاثر کن افسانہ ہے۔ ایک بے بس عورت کے ساتھ بظاہر ایک مہذب شخص نے جو بہیمانہ سلوک روا رکھا ہے اسے رفعت مرتضےٰ نے اتنی عمدہ فنی عدم ہمگی کے ساتھ اور لرزا دینے والے کھرے پن کے ساتھ پیش کیا ہے کہ یہ افسانہ پڑھنے کے بعد بھی اپنا تاثر زائل نہیں ہونے دیتا۔

''پہلا پتھر'' دوہری شخصیت کے حامل مردوں پر سخت طنز کا مظہر ہے۔ مصنفہ نے کہانی کو بہت موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ موضوع پر گرفت اور دلنشین انداز اس افسانے کا امتیازی وصف ہے۔ رفعت مرتضےٰ کے دیگر افسانے مثلاً ''غبارے''، ''ایک چھوٹی سی پر الم'' بہت ہی عمدہ افسانوں میں شمار ہوتے ہیں۔ من دل کو بھا جانے والا خوبصورت اور زندہ رہنے والا افسانہ ''پھول چاند تارے اور

درخت'' ہے۔ افسانے کے اسلوب کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ جبکہ افسانہ ''آدم کی پسلی'' اپنے بیانیہ انداز نگارش اور فنکاری کے لحاظ سے عمدہ افسانوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ افسانہ ہماری بیورو کریسی پر طنز ہے۔

''میرے خواب'' رضیہ شمع کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اس سے قبل اس کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''مسکراہٹوں کے آگے'' خاصی پذیرائی حاصل کر چکا ہے۔ اسی پذیرائی نے رضیہ کے عزم کو توانائی بخشی اور وہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں ہوئیں۔ اس نے میرے خواب کو مجموعے کی صورت تعبیر دی۔

رضیہ شمع کا شمار ان خواتین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے افسانہ نگاری میں اپنی انفرادیت نہ صرف قائم رکھی بلکہ اسے برقرار بھی رکھا ہے۔

نیلو فر اقبال، افسانہ نگاروں کی تازہ دم کھیپ سے تعلق رکھتی ہے۔ نیلو فر اقبال زندگی کو حقیقی رنگوں میں دیکھنے والی افسانہ نگار ہے۔ وہ حقیقت پر کسی قسم کا مصنوعی رنگ چڑھانے اور اسے خوش نظر بنانے کی کوشش نہیں کرتی۔ اس کے افسانے کا انجام بعض اوقات اتنا دردناک ہوتا ہے کہ قاری کا دل سطح پر لائے گئے دکھ پر تڑپ اٹھتا ہے۔ نیلو فر اقبال کے افسانے تکنیک اور موضوع کے اعتبار سے منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ اس کا افسانہ ''دستاویزی ثبوت'' موضوع کی ندرت کی وجہ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ نیلو فر اقبال کے افسانہ ''چالی'' میں ایک محروم عورت کے جذبات کا جو اظہار ملتا ہے وہ کوئی خاتون افسانہ نگار ہی کر سکتی ہے۔

نیلو فر اقبال کی کہانی ''گھنٹی'' اس دہائی کی دس بہترین کہانیوں میں پورے اعتماد کے ساتھ رکھی جا سکتی ہے۔ نیلو فر اقبال کے افسانوی مجموعہ کا نام اسی افسانے ''گھنٹی'' پر رکھا گیا ہے۔ یہ مجموعہ 1989ء میں طبع ہوا۔

پچھلے دہے سے اردو افسانوی منظر پر جو نئی افسانہ نگار خواتین رونما ہوئیں ہیں ان میں فرحت پروین کا نام بھی نمایاں ہے۔ اس کے افسانہ ایک ننھی چڑیا کو بہت

پسند کیا گیا ہے۔ یہ افسانہ اس نکتے کو اجاگر کرتا ہے کہ ناداری کا کرب انسان کو المناک تجربات سے گزار کر وقت سے پہلے اس پر گھمبیر سنجیدگی طاری کر دیتا ہے۔ ایسے دردرسیدہ انسان معاشرے میں دوسروں سے الگ نظر آتے ہیں۔ ''ایک تھی چڑیا''، ''مامالوچی''، ''منجمد'' اور ''سبز پتلون'' افسانوی ادب کے کسی بھی اچھے انتخاب میں شامل ہونے والے افسانے ہیں۔ ''سبز پتلون'' کا موضوع عورت کی نفسیات اور ناداری ہے۔ افسانہ کے کردار آسودہ ماحول سے لیے گئے ہیں۔ اس میں مرد کی روایتی حکمرانی اور نفسیات کو پوری توانائی سے بیان کیا گیا ہے۔ ''سبز پتلون'' جدید دور کی مصنوعی انانیت کی ایک بھرپور تصویر ہے۔ فرحت پروین کا اسلوب قاری کو آغاز ہی سے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ فرحت ]پروین کے اٹھارہ افسانوں کا دلآویز مجموعہ ''منجمد'' کے نام سے 1997ء کے وسط میں طبع ہوا۔ ''منجمد'' میں شامل تقریباً ہر افسانہ معاشرے کی کسی نہ کسی دکھتی رگ کو چھیڑتا ہے۔

فرحت پروین... امریکہ میں طویل قیام اور اس کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری کی آنکھ اور تخلیق کار کا حساس دل رکھنے کے باعث وہ ان انسانی المیوں کی تہہ تک پہنچنے میں کامیاب رہتی ہے جہاں تک بالعموم عام افراد کی نگاہ نہیں پہنچ سکتی۔

فرحت پروین نے تجرید اور علامت کو ملا کر لکھنے کی کوشش کی جس میں وہ کامیاب رہی ہے۔ اس کے بیشتر افسانے تمثیلی اور علامتی فضا رکھنے کے باوجود کہانی پن کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ ''منجمد'' فرحت پروین کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جس میں شامل بیشتر افسانے امریکہ کے پس منظر میں انسانی المیئے اجاگر کرتے ہیں لیکن ''منجمد'' کے تقریباً سبھی افسانوں میں انسانی رشتوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ایسے رشتے جنھیں غیر ملکی آب و ہوا، راس نہیں آتی۔ ادھر ہم ہیں کہ ہماری زندگی ان ہی رشتوں سے عبارت ہوتی ہے۔ یہ رشتے ہماری سب سے بڑی کمزوری بھی ہوتے ہیں اور ہمارے لیے تحفظ کا باعث بھی بنتے ہیں۔ ہر رشتے کی جداگانہ اہمیت

ہوتی ہے، چنانچہ ان سے وابستہ جذباتی تلازمے انہیں منفرد اور محترم بنا دیتے ہیں۔

تاہم فرحت پروین کے افسانے محض امریکیوں اور پاکستانیوں تک ہی محدود نہیں رہے بلکہ اس نے دیگر ممالک کے کرداروں پر مبنی افسانے بھی قلمبند کیے ہیں۔ مثلاً ''مامالوچیا'' اطالوی عورت کا افسانہ ہے، ''عاملہ'' جو بینا کی لڑکی ہے، ''بن باس'' سکھ کنبے کے بارے میں ہے اور ''گم گشتہ'' ایرانی خاتون کے حوالے سے متاثر کن افسانہ ہے۔

یہ چاروں افسانے اگرچہ متنوع کرداروں اور قومیتوں کے بارے میں ہیں مگر ان سب میں مشترک تھیم ایک ہی ہے اور وہ ہے بنتے بگڑتے رشتے۔ ان افسانوں کے علاوہ فرحت پروین کے دیگر افسانوں میں ''سنک'' بھی ایک ایسا افسانہ ہے جس میں افسانہ نگار نے ہمارے اندر رچی بسی خود غرضی اور بے حسی کو یوں ہمارے سامنے پیش کیا ہے کے لگتا ہےہمارے معاشرے کا خود حفاظتی نظام اسی بدبُو پر منحصر ہے اور یہ معاشرہ ایک بڑا سا ''سنک'' ہے۔

فرحت پروین اپنے منفرد اسلوب اور عمیق مشاہدے کی بنا پر دور حاضر کی افسانہ نگار خواتین میں ممتاز مقام رکھتی ہے اسے جزئیات نگاری میں کمال حاصل ہے۔

جزئیات نگاری کلاسیکی طرز نگارش کے حامل حقیقت پسند افسانے کا خاصہ رہی ہے۔ جزئیات نگاری نے ترقی پسند افسانے کے دور عروج میں بڑی ترقی کی اور اردو میں ترقی پسند اور غیر ترقی پسند لکھاریوں میں راجندر سنگھ بیدی، غلام عباس، احمد ندیم قاسمی، خدیجہ مستور جیسے عمدہ جزئیات نگار پیدا ہوئے جنہوں نے اس تکنیک کو بہت خوبصورتی اور چابکدستی سے برتا اور چھوٹے چھوٹے واقعات ایک ماہر کشیدہ کار کی طرح ایک دوسرے میں موتیوں کی طرح پرو کر شاہکار افسانے تخلیق کیے۔

جزئیات نگاری دراصل طویل تر افسانے ناول اور وہ بھی کلاسیکی ناول کی روایت ہے۔ مختصر افسانے کی نہیں اسی لیے افسانہ نگاروں میں بہت کم جزئیات نگاروں میں انتظار حسین کے بعد اب فرحت پروین کا نام بھی شامل ہوگیا ہے۔

''مخمد'' کی جنیفر ہویا ''جنک یارڈ'' کی اماں ''بن باس'' کی ماں ہویا ''سبز پتلون'' کی نائیلہ اور فاروق ''بہانے باز'' کی برکتے ہویا ''ایک تھی چڑیا'' کی قندیل مختصر یہ ''مخمد'' سے لے کر ''سوال'' تک فرحت پروین کے افسانوں میں جزئیات نگاری اپنی تمام تر بڑی روایتوں کے ساتھ زندہ ہے اور یہ ایسے افسانے ہیں جو معاشرے کے اندر جاری کشمکش اور ذہنی گھٹن اور دور کھلے منظروں میں زندگی کی بے قراری اور والہانہ پن کا پتہ دیتے ہیں۔

فارینہ الماس، اردو افسانے میں نیا لیکن معیاری افسانے میں ایک اچھا اضافہ ہے۔ اسکا افسانہ ''پنکھ پکھیرو'' اپنے موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے بہت خوبصورت ہے۔ ''پنکھ پکھیرو'' دراصل فطرت کی خوبصورتی اور اعلےٰ انسانی اقدار کی ٹوٹ پھوٹ کا نوحہ ہے اور یہ ایک نسل کے انہدام اور دوسری نسل کی ضرورتوں کے مابین باہمی کشمکش کو ظاہر کر رہا ہے۔ کہانی میں محبت کے وسیع تر تعلق کو خوبصورتی سے قلمبند کیا گیا ہے۔

قدسیہ ہما، کے افسانوں کا مجموعہ ''تتلیوں کے پر'' کے عنوان سے چھپ چکا ہے۔ قدسیہ ہما کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ افسانوں کو سوئیٹر کی طرح بنتی ہے۔ زندگی کے واقعات اس کے افسانوں میں سلسلہ در سلسلہ بنتے چلے جاتے ہیں۔ اور جب افسانہ اختتام پر پہنچتا ہے تو پڑھنے والا اپنی آنکھیں زندگی سے بند نہیں کر سکتا۔

رشیدہ رضویہ فکشن میں ایک خاص اسلوب اور ایک خاص پس منظر اجاگر کرنے کے لیے مشہور ہے۔ اس کے افسانوں کا مجموعہ ''کھنڈر کھنڈر بابل بابل'' کے عنوان سے 1959ء میں طبع ہو چکا ہے۔

فیروزہ جعفر کا افسانوی مجموعہ ''پہلی بوند سمندر'' کراچی سے چھپ چکا ہے۔ جبکہ فیروزہ جعفر نے یہ افسانے لندن جیسے مادہ پرست، زر پرست اور خود پرست شہر میں بیٹھ کر اسی شہر کے پس منظر میں لکھے ہیں۔ لیکن ان افسانوں میں دکھ، درد کے مشترکہ رشتے موجود ہیں۔ ان افسانوں میں انسانی زندگی کی محبت ایک قوت بن کر ابھرتی ہے۔ یہ محبت سمندر کی بوند جیسی ہے جو صدف میں بند ہو کر قیمتی موتی بن جاتی ہے۔

سیما پیروز، اس تخلیقی دبستان سے تعلق رکھتی ہیں جو خاروار حقیقت کو نوکیلے انداز میں افسانے کی صورت دیتا ہے۔ اور صورت واقعہ کو کسی نتیجے پر لا کر پڑھنے والے کی سوچ کو ہر انگیختہ کر دیتا ہے۔ اس کی نمایاں مثال ان کا افسانہ'' اور آنسو رک نہ سکا'' بھی زندگی کی ایک حقیقی کاوش کا آئینہ دار ہے۔

''شام کی سرگوشی'' کے عنوان سے سیما پیروز کے افسانوں کا مجموعہ طبع ہو چکا ہے۔ اس مجموعے میں شامل کہانیاں بنیادی انسانی جذبوں کی کہانیاں ہیں۔ یعنی محبت اور نفرت کی ان کہانیوں میں جو اسلوب برتا گیا ہے وہ بالعموم بیانیہ ہے۔ بیان کی وضاحت لفظوں کے اسراف پر پردہ ڈالتی ہے۔ سادہ بیانیہ اسلوب کے باوصف کہیں کہیں جذبوں کے بیان میں رومانوی انداز کی جھلکیاں بھی ہیں۔ یہ مجموعہ ''شام کی سرگوشی'' ایک اور لحاظ سے بھی اہم ہے کہ یہ خواتین کے حقوق، معاشرے میں ان کے جائز مقام اور ان کی عزت نفس کے حق میں ایک اہم دستاویز ہے۔

''بھاگا ہوا غلام'' قدسیہ انصاری کے افسانوں کا ایک نمائندہ مجموعہ ہے۔ ان کے دیگر افسانوں کے علاوہ اس مجموعے میں '' گرین کارڈ''، ''شہاب ثاقب'' ''مگس رانی''، ''پل صراط'' اور ''پوسٹ مارٹم'' جیسے افسانے بھی شامل ہیں جن کی صدائے بازگشت ان کی پہلی اشاعت پر ادبی حلقوں میں تا دیر سنی جاتی رہی تھی۔ قدسیہ انصاری کے افسانے زندگی کی ناہمواریوں کو ایک مخصوص تناظر میں ابھارتے

ہیں۔

اس صدی کے ساتویں دہے میں جو خواتین افسانہ نگار اردو ادب میں رونما ہوئیں ان میں حمیدہ معین رضوی ایک اہم نام ہے۔ ''اجلی زمین میلا آسمان'' اس کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ''دربدری'' اگرچہ گھر سے لیکر سوشل سیکورٹی آفس تک پہنچنے کا مختصر سے وقت کا افسانہ ہے لیکن انداز بیان بہت دلنشین ہے۔

''درد کا سایہ''، ''اجلی زمین میلا آسمان'' اور ''برف گرتی رہی'' جیسے افسانوں میں بھی حمیدہ رضوی نے برصغیر کے لوگوں کو مغربی مناظر میں پیش کیا ہے۔ علاوہ ازیں ''مردہ لمحوں کے زندہ جنم'' میں حمیدہ معین رضوی نے طویل افسانے کی تکنیک کو اپنا کر اردگرد پھیلی ہوئی زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کے مطابق ''حمیدہ معین رضوی کی یہ بات مجھے اچھی لگی کہ انہوں نے اپنے افسانوں کے لیے ایک نئی فضاء منتخب کی اور اس فضاء میں پروان چڑھنے والی حقیقتوں کو افسانوں کا روپ دیا''۔

محسنہ جیلانی اردو کے جدید افسانہ نگاروں کی صف میں نمایاں مقام رکھتی ہیں اگر یہ کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ انہوں نے افسانے کے کینوس کو بین الاقوامی تناظر بخشاہے۔ مشرق اور مغرب کے معاشروں میں آج کی انسانی زندگی کے گوناگوں گہرے مسائل کو گہرے مشاہدے اور ہمہ گیر احساس کے ذریعے فنکارانہ انداز سے پیش کیا ہے۔ ''عذاب بے زبانی کا'' ایسے افسانوں کا مجموعہ ہے جس میں مغرب کے ترقی یافتہ معاشرے میں تہذیبی قدروں سے بے نیازی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے راہ روی کے المناک منظر نامے ہیں۔

خالدہ ملک کے افسانوئوی مجموعہ ''بلاوہ'' میں شامل کچھ افسانوں کے بارے میں یہ رائے قائم کی جاسکتی ہے کہ ان کی جدید افسانوی حسیت اور نئے افسانے کے دروبست پر خالدہ ملک کی گرفت صاف طور پر نظر آتی ہے۔ ان کے جملے گہرے

معاشرتی طنز کے آئینہ دار ہوتے ہیں ان کا مشاہدہ ہرگز سطحی نہیں۔ ایک مشاق فنکار کی طرح وہ پوری تخلیقی کیفیت اور کرب سے گزر کر افسانہ لکھتی ہیں۔

اردو فکشن میں وحیدہ نسیم جانی پہچانی شخصیت ہیں ان کا شمار کہنہ مشق اہل قلم خواتین میں ہوتا ہے۔ موصوفہ کے افکار پر کسی غیر ملکی نظریات کی چھاپ نہیں ہے۔ ''راج محل''، ''رنگ محل''، ''دگن محل''، ''دیپک محل''، ''بیلے کی کلیاں'' اور ''داستان در داستان'' کے عنوانات سے ان کے افسانوی مجموعے طبع ہو چکے ہیں۔

تازہ دم اہل قلم خواتین میں بازغہ تبسّم کا نام بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ اس کے افسانوں کا مجموعہ ''صدی مانگتی ہے نذرانہ'' طبع ہو چکا ہے۔ بازغہ تبسّم کے افسانوں کی سب سے بڑی خوبی فضا کی تازگی ہے۔ اس کے افسانوں میں جوش اور اعتماد پایا جاتا ہے۔ بازغہ تبسّم کے اسلوب کا تیکھا پن جملوں کی تراش خراش اور جھنکار سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

پاکستان کی نئی نسل کی اہل قلم خواتین کی کھیپ میں عبیدہ سیّد کا نام جانا پہچانا ہے۔ اس کے افسانوں کا مجموعہ ''انتظار ختم ہوا'' کے نام سے 1996ء میں طبع ہوا۔

پاکستان کی سیاسی، ثقافتی اور تہذیبی تاریخ میں دو ایسے اہم واقعات رونما ہوئے جس سے اردو افسانہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ایک سقوط مشرقی پاکستان کا المیہ اور دوسرا پاکستان میں دوسری مرتبہ مارشل لاء کا نفاذ، ان موضوعات پر تجریدی، علامتی، نیم علامتی اور بیانیہ انداز میں افسانہ نگاروں نے شدید ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے افسانے لکھے۔

پاکستان کی تاریخ میں المیہ کراچی بھی ہر اعتبار سے ایک اہم سنجیدہ اور ناقابل فراموش واقعہ ہے۔ زندگی کے دوسرے شعبوں کے ساتھ ساتھ شعروادب پر بھی اس کے اثرات مرتب ہوئے۔ 80ء کی دہائی سے لیکر 1995ء بلکہ کسی حد تک

آج بھی کراچی جن حالات اور واقعات سے دوچار ہے وہ ہر محبِ وطن کے لیے باعث آزار ہے۔ وہ کیا وجوہات ہیں جن کی بناء پر شہر کراچی شہر تشدد کا روپ دھار گیا۔ کراچی کے تصور کے ساتھ ہی سمندر کا خیال ضرور آتا ہے۔ یہ سمندر لہو کا سمندر کیسے ہو گیا، اس سمندر کو خون کے سمندر میں بدلنے والے لوگ کون تھے، ان کے مقاصد کیا تھے گھر کے بھیدی تھے یا باہر کے تخریب کار۔

قیام پاکستان کو پچاس سال ہو گئے ہیں۔ تعصب کی آندھی وقتاً فوقتاً اٹھتی رہی ہے لیکن اب یہ کیسی صورتحال ہو گئی کہ سرخ آندھی نے ساری بستی کو بے چراغ کر دیا ہے۔ کراچی کے سانحہ پر لکھے جانے والے ادب کو کسی طرح بھی وقتی ہنگامی یا صحافتی ادب کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس شہر کے لکھاریوں نے نظم و نثر ہر دو اصناف میں خود بیتے جانے والی روداد رقم کی ہے، تو پاکستان کے دوسرے علاقوں کے اہل قلم نے بھی اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کیا ہے اور اس انداز سے کہ ہر شخص ان تحریروں سے بالواسطہ یا بلاواسطہ متاثر ہوا ہے۔ خون کے آنسو رویا ہے۔

کراچی کے المیہ کے پس منظر میں پاکستانی افسانہ نگار خواتین نے بھی افسانے لکھے ہیں۔ اس حوالے سے لکھے جانے والے چند افسانے یہ ہیں۔

فہمیدہ ریاض کا ''کراچی''، شہناز پروین کا ''ہاگ وائرس''، گلنار آفرین کا ''کراچی کی ہوا کے نام''، عذرا اصغر کا ''بارود کی بو'' ۔ ان افسانوں کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ خواتین اہل قلم نے کراچی کے سانحہ پر نہایت دردمندی کے ساتھ لکھا ہے۔ فہمیدہ ریاض کے افسانہ ''کراچی'' میں وہ تمام سوالات موجود ہیں جو کراچی شہر کے ہر باشندے کے ذہن اور ہونٹوں پر موجود ہیں۔ دہشت گردی کیوں ہو رہی ہے، کون کروا رہا ہے، مقاصد کیا ہیں، مختلف اذہان مختلف وجوہات رکھتے ہیں۔ ایم ۔ کیو ۔ ایم اس کے متحارب گروپ شیعہ، سنی، امریکی ایجنٹ،

بھارتی ایجنٹ، افغانی ایجنٹ، روسی ایجنٹ بھی اس دہشت گردی میں ملوث ہو سکتے ہیں۔ اس طویل کہانی میں شہر کے تمام رنگ جن میں سرخ رنگ نمایاں ہے نظر آتے ہیں۔

عذرا اصغر کا افسانہ ''بارود کی بو'' ایک دلدوز افسانہ ہے بلکہ اس مصرع کی ترجمانی کرتا ہے۔

گلیوں میں بارود کی بو یا پھر خون مہکتا ہے

بلا مبالغہ ان افسانوں میں کراچی کے ان دکھوں کا تذکرہ موجود ہے جن سے عوام دوچار ہیں۔ اس باب میں اب تک جتنی افسانہ نگار خواتین کا ذکر آچکا ہے اس کے علاوہ بھی سینکڑوں کی تعداد میں خواتین اور لڑکیاں افسانہ نگاری کر رہی ہیں۔

آج ہمارا افسانہ نگار خاصی فنی اور فکری جست لگانے لگا ہے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم نہ صرف جدید افسانے کے زرین دور میں زندہ ہیں بلکہ ماضی کے مقابلے میں یہ اب ہمارا مقدر رہنے والا ہے لیکن یہ کوئی چلتا ہوا عمومی تبصرہ نہیں ہے اس کے عقب میں نصف صدی سے شائع ہونے والا ٹھوس افسانوی ادب ہے بلکہ وہ قابلِ ذکر افسانوی رجحانات ہیں جو محسوس اور نامحسوس طریقوں پر اپنے وجود کا احساس دلانے لگتے ہیں۔

آج کے افسانے کا ایک خاص رجحان حقیقت کے بطون میں پنہاں دوسری ایسی حقیقتوں اور سچائیوں کا اظہار ہے جو پڑھنے والے کو انکشاف کی لذت سے ہمکنار کر رہا ہے۔

پنہاں انصاری دورِ حاضر کی کامیاب ترقی پسند اور صاحبِ طرز ادیبہ ہیں۔ ان کی نثر شعریت سے معمور اور زندگی سے بھرپور ہے۔

پنہاں انصاری کے افسانے ہماری معاشرتی زندگی کے عکاس ہیں۔ وہ مسائل پر غور کرنے اور سماجی زندگی کی ناہمواریوں پر سوچنے اور تہذیبی اقدار کی شکست و ریخت پر بھر پور توجہ دیتی ہیں۔ خصوصاً طبقہ نسواں کے مسائل اور حالات سے گہری دلچسپی رکھتی ہیں۔

1997ء میں شائع ہونے والے افسانوی مجموعوں میں پنہاں انصارؔی کا افسانوی مجموعہ ''حرف نارسا'' بھی شامل ہے۔ جسے ادبی و علمی حلقوں میں بہت پسند کیا گیا ہے۔

موٹی موٹی آنکھوں میں کھوئی ہوئی حیرانیاں لیے انہونی کہانی سی مسرت کلانچوی کی کہانیاں ان کی زبان کی طرح میٹھی ہوتی ہیں۔ مسرت کلانچوؔی کا فن اپنی الگ شناخت کے ساتھ اپنی زبان کی نمائندہ پہچان بن چکا ہے۔ مسرت کلانچوؔی کی کہانیاں اپنی روایت کا بھر پور حصہ ہیں۔ ناآسودہ جذبوں کی خواہش لاحاصل، انسانی رشتوں کی آویزش، محبت کی بھول بھلیاں اور دوست سے دشمن ہو جانے والے رویے ان کے افسانوں میں بیان ہوئے ہیں۔

1990ء کی دہائی میں سامنے آنے والی افسانہ نگار خواتین میں شہناز شورؔو کا نام بھی ملتا ہے۔ شہناز شورؔو افسانہ لکھنے والی اہل قلم میں اپنا ایک مختلف انداز رکھتی ہے۔ شہناز شورؔو کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''لوگ - لفظ اور انا'' کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔

1947ء سے لیکر 1999ء تک کے مجموعی ادب خصوصاً افسانوی ادب کا جائزہ لیتے ہوئے اس امر سے آگاہی ہوتی ہے کہ یہ نصف صدی معیار اور مقدار دونوں اعتبار سے زرخیز رہی ہے۔ اور اردو افسانے کے اس منظر نامے سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ اس عرصے میں پرانی اور نئی دونوں قسم کی اہل قلم خواتین نے زبردست تخلیقی سرگرمیوں کا مظاہرہ کیا ہے۔

# خواتین کے سفر نامے

اصنافِ اَدَب میں سفر نامہ معتبر حوالہ متصور ہوتا ہے، اَدَب کی یہ ایک بیانیہ صنف ہے اس میں مشاہدے کا عمل دخل ہوتا ہے اور مشاہدے کو تخیل پر فوقیت دی جاتی ہے۔ چونکہ یہ ادبی صنف ہے لہٰذا اس کی پیشکش ادبی ہوگی، لیکن سفر نامہ " کو جاننے اور سمجھنے کے لئے ہمیں تاریخ سے رجوع کرتے ہوئے تاریخ کے اوراق پلٹنے ہوں گے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ "سفر" عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے، مسافت

طے کرنا۔ سیاحت کے لئے نکلنا۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا یا ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل ہونے کے ہیں۔ اُردو زبان میں یہ لفظ عربی سے مستعار ہے اور انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

"نامہ" فارسی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی لکھے ہوئے خط۔ فرمان یا عمومی طور پر تحریر شدہ عبارت کے ہیں اس لئے اُردو کے علماء نے "سفر" عربی اور "نامہ" فارسی سے لے کر "سفر نامہ" کی اصطلاح وضع کی، اُردو میں سفر نامہ روداد سفر یا سفری تجربات و مشاہدات رقم کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

شازیہ جبیں (طالبہ کراچی یونیورسٹی) کے لفظوں میں سفر نامہ کی اب تک کوئی جامع تعریف نہیں کی گئی جو اس کی واضح شناخت بن سکتی، سفر نامہ ایک ایسا ذاتی بیان Personal Narrative ہے جو سفر کے دوران تجربے مشاہدے، مطالعے اور خوشگوار اور ناخوشگوار واقعات کے ذاتی تاثرات پر مبنی ہے جو مسافر کو پیش آتے ہیں اور متاثر کرتے ہیں۔

سفر نامہ نگاری لازماً ایک تخلیقی تجربہ ہے، یہ دنیا کے ہر ادب کی مستقل صنف ہے اب سفر نامہ تیزی سے ایک صنف کے طور پر ادب میں داخل ہوا ہے، پہلے یہ صنف ادب میں مرکزی حیثیت نہیں رکھتی تھی لیکن جدید سفر نامے نے دیکھتے ہی دیکھتے نثری ادب میں مرکزی حیثیت حاصل کرلی ہے،

سفر نامہ میں کسی ملک یا علاقے کی جغرافیائی، تاریخی، سماجی سیاسی، اور ثقافتی قدروں کی مصوری ہوتی ہے۔ رسم ورواج، تعمیرات اور موسموں کو لفظوں کا منظر نامہ عطا کیا جاتا ہے اور دیگر معلومات احاطہ ء تحریر میں آتی ہیں، چنانچہ سفر و سیلہ ء سفر ہو یا نہ ہو مگر سفر نامہ تحریر کا باعث یقیناً ثابت ہوتا ہے اسی لئے سفر ناموں میں پڑھنے والوں کے لئے ایک کشش ہے،

سفر نامہ کے ذریعے ہم کسی بھی خطہ ارضی کے بارے میں آگاہی حاصل کر

سکتے ہیں اسی سبب اس نثری صنف میں دلچسپی کا عنصر غالب نظر آتا ہے، اگر اس میں افسانوی اسلوب کی رنگ آمیزی کر دی جائے تو اس کا حسن دوچند ہو جاتا ہے۔ گو اس افسانوی طرزِ احساس نے سفر نامے کے معیار اور مزاج کو نقصان بھی پہنچایا ہے مگر اس طرح کے اسلوب کو عوامی سطح پر پسند کیا جاتا ہے۔

اردو کا پہلا سفر نامہ "یوسف خان کمبل پوش کا سفر نامہ "عجائبات فرنگ" ہے۔ اس کے بعد سر سید احمد خان کا عہد آتا ہے۔ شازیہ جبیں کے مطابق "زمانے کے بدلتے مزاج کے ساتھ سفر نامہ میں بھی تیزی آگئی، عہدِ سر سید کے سفر ناموں کے اسالیب کے امتزاج سے سفر نامہ کو فنی توانائی ملی، بیسویں صدی میں ۱۹۴۰ء تک کا عرصہ قدیم وجدید سفر نامہ کے درمیان عبوری دور کی حیثیت رکھتا ہے"

1947ء سے قبل اُردو ادب میں سفر نامے بہت کم تھے کیونکہ اُردو میں سفر ناموں پر بطور فنی طور پر خصوصی توجہ نہیں دی گئی اس لئے جو سفر نامے ہمیں اُردو میں ملتے ہیں وہ زیادہ تر عربی، فرانسیسی یا انگریزی سفر ناموں کی تکنیک کو سامنے رکھ کر لکھے گئے ہیں اور محض معلومات اور دلچسپی کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔

لیکن 1941ء تا1998ء اردو سفر نامہ کا جدیدیت کی طرف تیزی سے بڑھتا ہوا قدم ہے کچھ سفر نامے ایسے ضرور ہیں جہاں سفر نامہ لکھنے والوں نے دوسری زبانوں کے سفر ناموں کے بین بین اپنے مخصوص انداز سے رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد سفر ناموں کی طرف توجہ دی گئی ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر کے لفظوں میں "گزشتہ چند برسوں میں اردو میں سفر نامہ کا جو احیاء ہوا وہ خوشگوار اور حیرت کا موجب ہے۔"

سفر نامہ عوام میں کافی مقبول ہو رہا ہے۔ اور اب اُردو میں سفر ناموں کی اچھی خاصی تعداد پائی جاتی ہے اور آئے دن سفر ناموں پر مشتمل کتابیں منظر عام پر آتی رہتی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس میدان میں جہاں مرد حضرات نے اپنے قلم کا استعمال

کیا ہے وہیں خواتین نے بھی اپنے قلم کا جادُو جگایا ہے، لیکن سفر نامہ نگار خواتین کی فہرست مختصر ہے ایسی اہلِ قلم خواتین جنہیں سیر و سیاحت کے مواقع ملے اور جنہوں نے سفر نامے لکھے ان کی تعداد کچھ زیادہ نہ سہی تاہم پچھلے کچھ اور برسوں میں خواتین کے جو سفر نامے سامنے آئے ہیں انہیں دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ خواتین نے بھی اس صنف کو اسلوب اور مواد کے اعتبار سے مقبول بنادیا ہے۔ سفر ناموں میں خواتین کا اسلوب سادہ بلکہ بعض اہلِ قلم خواتین کے سفر نامے تو ادبی تاریخ کا وہ سنگِ میل ہیں جو ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ اور یہ کوئی اچھنبے کی بات بھی نہیں ہے۔

" قدرت نے عورت کو حساس دل اور لطیف نظر عطا کی ہے اس میں تجسّس اور حیرت کے جذبات بھی مردوں کے مقابلے میں زیادہ شدید ہیں، اب تو وہ مہم جوئی سے بھی پوری طرح آشنا ہو چکی ہے ان جذبوں اور خوبیوں نے خواتین کے سفر نامے تخلیق کیے ہیں اور ان سے اُردو ادب میں ایک نئی معنویت پیدا ہوئی ہے ان کے دلکش اور احساسات میں ڈوبے ہوئے سیاحت ناموں نے ایک ارتعاش پیدا کیا ہے بڑا ہی پُر لطف ارتعاش ۔ وہ خواتین جن کا نام نشاط النساء تھا اور جن کو حسرت موہانی کی رفیقہء حیات ہونے کا شرف حاصل رہا ہے۔ ان کے "سفر عراق" اور" سفر حجاز" کے عنوان سے دو سفر نامے شائع ہوئے ہیں جو اپنے اندر ایک تاریخی حسن رکھتے ہیں۔ بغداد 1936ء میں کیسا تھا اس کی ایک جیتی جاگتی تصویر "سفر عراق" میں ملتی ہے۔

(بحوالہ : خواتین کے سفر نامے "ڈائجسٹ" سالنامہ 1999ء)

قیام پاکستان کے بعد جو سفر نامہ نگار خواتین سامنے آئی ہیں ان میں بیگم اختر ریاض الدین کو اولیت حاصل ہے جنہوں نے آہنی پردے کے پیچھے "طلوع آفتاب کی سرزمین" اور "کراچی سے نیلپز تک" کے سفر کی روئیداد لکھی ہے ان کے کئی دیگر

سفر نامے کتابی صورت میں طبع ہو چکے ہیں۔

علاوہ ازیں بیگم اختر ریاض کے دو سفر نامے "سات سمندر پار" اور "دھنک پر قدم" ادبی ارتقاء پر ایک گہرا نقش ثبت کر چکے ہیں۔ ان کا اسلوبِ نگارش اس قدر بے ساختہ پُر کیف اور سحر انگیز ہے کہ وہ قاری کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ بیگم اختر ریاض الدین کے سفر نامہ " دھنک پر قدم" کو آدم جی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا ہے۔

رسالہ "عصمت" کراچی میں لکھنے والی خواتین نے ہر طرح کے سفر نامے لکھے ہیں لیکن "عصمت" میں سب سے زیادہ سفر نامے ڈاکٹر شائشتہ اکرام اللہ کے لکھے ہوئے ہیں، شائشتہ اکرام اللہ ایک خوشحال گھرانہ کی بیٹی تھیں ان کی شادی بھی ایک متمول خاندان میں ہوئی ان کے شریکِ حیات محمد اکرام اللہ نے پاکستان کے پہلے فارن سیکرٹری اور کینیڈا میں سفیر اور انگلستان میں ہائی کمشنر کی حیثیت سے پاکستان کی بڑی خدمت کی خود محترمہ شائشتہ بیگم دستور ساز اسمبلی کی ممبر رہیں، ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن کی ممبر رہیں، انہیں مراکش نے اس ملک کا سب سے بڑا اعزاز دیا۔

شائشتہ اکرام اللہ نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ملک سے باہر گزارا اور لکھنے میں بھی مہارت رکھتی ہیں۔ رسالہ "عصمت" میں مسلسل ان کی مختصر رودادِ سفر شائع ہوتی رہی ہیں ان کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

1: سفرِ حج۔ جولائی ۱۹۶۶ء تا ستمبر ۱۹۶۶ء

2: دہلی کی ایک جھلک جولائی ۱۹۶۰ء

3: بیت المقدس کی جھلک دسمبر ۱۹۶۰ء

4: مراکش کا تاریخی پس منظر جنوری ۱۹۶۷ء

5: ترکی کا سفر فروری ۱۹۶۸ء

6: مراکش کو خیرباد

7: تیونس اور لیبیا میں چند روز جون ۱۹۶۸ء

محترمہ شائستہ اکرام اللہ کے سفر نامے فنی اور ادبی لحاظ سے ایک خاص مقام رکھتے ہیں ان کی تحریروں میں زیبائی اور سچائی بیک وقت نظر آتی ہے۔ ان کے لکھنے کا ایک خاص اپنا انداز ہے، یہ اسلوب ان کی اپنی زندگی کا پرتو ہے، ان کا طرزِ تحریر نہایت شائشتہ اور دلکش ہے۔

شائستہ اکرام اللہ کے علاوہ کچھ دیگر خواتین نے بھی مختصر سفر نامے لکھے جو رسالہ "عصمت" میں شائع ہوتے رہے ہیں، ان میں سے چند ایک کے نام پیش کئے جاتے ہیں، ملکی و غیر ملکی دونوں میں طرح کے سفر نامے ہمیں رسالہ "عصمت" میں نظر آتے ہیں۔

| | | |
|---|---|---|
| سیدہ شہربانو | حجاز میں میں نے کیا دیکھا۔ | فروری ۱۹۵۹ء |
| امت الوحی | میرا سفر حج | اکتوبر ۱۹۶۵ء |
| بیگم رحمٰن | راولپنڈی سے ہنزہ تک | ستمبر ۱۹۶۵ء |
| محمودہ حق | ہری پور سے کوتری تک | اکتوبر ۱۹۶۸ء |
| بیگم الطاف حسین | مارگلہ کی پہاڑیوں میں | اکتوبر ۱۹۶۸ء |
| بدرانساء رحمٰن | ترکی کا سفر | فروری ۱۹۶۸ء |

ان سفر ناموں کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ ان میں مشرق کی باحیا عورت مغرب سے مرعوب نظر آتی اور اپنے تاثرات کو واشگاف انداز میں پیش کرتی ہے۔

گزشتہ چند برسوں میں جن سفر نامہ نگار خواتین کے سفر نامے قارئین میں مقبول ہوئے ان مین قرۃالعین حیدر فردوس حیدر، کشور ناہید، رضیہ فصیح احمد،

بلقیس ریاض، مسرت براچہ، پروین عاطف، نیلم احمد بشیر، بشریٰ رحمن، سائرہ ہاشمی۔ سعیدہ خلیل ثریا حفیظ اور سلمیٰ یاسمین نجمی کے نام نمایاں ہیں۔

قرۃ العین حیدر برصغیر پاک و ہند کے ادبی حلقوں میں ایک منفرد مقام رکھتی ہیں آپ کی لکھی ہوئی بیشتر تحریریں اُردو اَدب میں کلاسیک کا درجہ رکھتی ہیں، موصوفہ حالات، واقعات اور افراد کو اس کائنات کا ایک جزو سمجھتی ہیں ان کا قلم انسان کی نفسیات کی گہرائیوں تک اُتر کر اس کی روح کو آئینہ دکھاتا ہے وہ اس جہان سے سرسری طور پر گزرنے کی عادی نہیں یہی وجہ ہے انہیں ہر جہانِ دیگر نظر آتا ہے، قرۃ العین حیدر اب تک سفر نامۂ روس سفر نامہ ایران اور سفر نامہ کشمیر قلمبند کر چکی ہیں اور سفر نامہ امریکہ بھی جہانِ دیگر کے عنوان سے طبع ہو چکا ہے جو امریکہ کے متعلق مصنفہ کے تاثرات پر مبنی ہے۔

اپنے عہد کی معروف فکشن نویس فردوس حیدر نے کئی ممالک کا سفر کیا" دائروں میں دائرے "اور" یہ دوریاں یہ فاصلے" کے عنوانات سے دو سفر نامے لکھ کر سفر نامہ نگاری میں ایک نئی طرز کی بنیاد ڈالی ہے انہوں نے سفر نامے کو ناول کے انداز میں لکھنے کا تخلیقی تجربہ کیا ہے جو کامیاب رہا ہے "دائروں میں دائرے" فردوس حیدر کا پہلا سفر نامہ ہے جو تھائی لینڈ کے حوالے سے پہلی بار ۱۹۸۰ء میں طبع ہوا، فردوس حیدر نے ناول کے انداز میں سفر نامہ تحریر کیا ہے، کردار اور کہانی سے اس میں دلچسپی پیدا کی ہے اور جو کچھ لکھا اس میں سیاسی اور تاریخی پس منظر پیش کر کے بھی اسے دلکشی دی ہے لیکن تکنیک کو برتنے کے ساتھ یہ بات ان کے پیش نظر رہی کہ وہ سفر کے وسیلے سے ایک کہانی بیان کر رہی ہیں۔

شوکت صدیقی کے لفظوں میں "دائروں میں دائرے" ایک خوبصورت سفر نامہ ہے۔ واقعات اور حادثات اس میں جس ترتیب سے سامنے آتے ہیں، اُتار چڑھاؤ کے مراحل سے گزرتے ہوئے جس انداز سے نقطۂ عروج پر پہنچ کر مجموعی تاثر

پیدا کرتے ہیں، وہ ایک عمدہ ناول کی تشکیل کا عمل ہے۔ فردوس حیدر نے واقعات کے تصادم اور تلاطم، کرداروں کے تنوع اور ان کے سماجی اور اقتصادی تضادات کو فنکارانہ سلیقے سے اس طور پیش کیا ہے کہ موضوع کی دلکشی کسی مرحلہ پر مجروح نہیں ہوتی، اندازِ بیان میں کہیں جھول نہیں ملتا۔ "دائروں میں دائرے" فردوس حیدر کے تخلیقی ارتقاء کے سفر میں ایک نیا سنگِ میل ہے، اُردو کے افسانوی اَدب میں ایک اہم اور قابلِ توجہ اضافہ ہے،

اسی طرح حاجرہ مسرور نے لکھا ہے "دائروں میں دائرے" کو محض سفری ڈائری نہیں کہا جا سکتا۔ فردوس حیدر نے یہ کہانی لکھتے ہوئے "تھائی لینڈ" کے تاریخی، جغرافیائی اور سیاسی ماحول کے ساتھ وہاں کے رہن سہن اور کھان پان، تہوار اور عقائد کو بھی فراموش نہیں کیا بلکہ سب کو خوش اسلوبی کے ساتھ کہانی کے مرکزی کرداروں میں پرو دیا ہے میرے نزدیک "دائیروں میں دائیرے فردوس حیدر نے بہت جم کر لکھا ہے اور میں مستقبل میں ان سے ایسی ہی دیگر کتابوں کی اُمید رکھتی ہوں"

فردوس حیدر کا دوسرا سفر نامہ "یہ دوریاں یہ فاصلے" 1969ء میں طبع ہوا۔ اس سفر نامہ کے بارے میں انور سید لکھتے ہیں فردوس حیدر کا سفر نامہ "یہ دوریاں یہ فاصلے" دلی دنیا اور بھارت کے ملک کے عام لوگوں کی ملاقاتوں سے شروع ہوتا ہے اور بڑی فردوس نظر اپنائیت پیدا کرتا ہے انسانی قلوب کی دوریاں اور فاصلے سمٹ جاتے ہیں قربتوں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے میں نے اس سفر نامے میں متعدد دوستوں سے تجدید ملاقات کی اس تمام وقت میں جو فردوس حیدر نے جوگندر پال کرشن پال کے ساتھ گزرا، ان کے سیالکوٹ جانے میں گزارا تھا میں بھی ان کے ہمراہ تھا"۔

اس سفر نامے میں فردوس حیدر نے اپنے تجربات، مشاہدات اور محسوسات کو بڑے نرم اور سادہ لہجے میں بیان کیا ہے طرزِ تحر سادہ اور صاف ہے اس

میں رنگ و رعنائی کی آمیزش نہیں نہ عبارت آرائی کا زور ہے نہ علمیت سے مرعوب کرنے کا جذبہ اور نہ ہی اپنی بڑائی کے تذکرے۔ مجموعی طور پر فردوس حیدر کا سفر نامہ "یہ دوریاں یہ فاصلے" اردو کے دوسرے سفر ناموں سے مختلف ہے۔

کشور ناہید کے اسلوب بیان میں بلا کی رنگینی اور رعنائی اور لطافت و روانی پائی جاتی ہے ان کا سفر نامہ "آؤ افریقہ" ان کی خوبصورت تحریر کا عمدہ نمونہ ہے۔ انہوں نے اپنے محسوسات اور نادر تشبیہات اور اچھوتے کتابوں میں بیان کئے ہیں ان کے جملوں میں مرصع کاری اور فنکارانہ آرائشگی اپنے درجۂ کمال پر نظر آتی ہے۔ افریقہ کی تہذیبی زندگی کی بہت سی جزئیات کو انہوں نے اپنے سفر نامے میں سمیٹا ہے وہ افراد کے حوالے سے پوری قوم کے مجموعی مزاج اور اجتماعی کردار کو پہچاننے کی کوشش کرتی ہیں، ان کے سفر نامہ کو بغور پڑھا جائے تو ان کی نظر میں گہرائی اور مشاہدے میں وسعت کی وجہ سے اسے محض عورت کا مشاہدہ قرار دے کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا انہوں نے دنیا کو ایک بالغ نظر سیانے کی حیثیت سے دیکھا اور اپنے تاثرات کو نہایت شگفتہ ادبی اسلوب میں بیان کر دیا۔

بشریٰ رحمٰن، ایک کامیاب سفر نامہ نگار کے طور پر سامنے آئی، ان کے سفر ناموں کا نمایاں وصف یہ ہے کہ وہ سفر نامے بھی ہیں اور تاریخ بھی، مواد، اسلوب، تکنیک اور فنی لحاظ سے ان کے سفر نامے "ٹک ٹک دیدم" اور "براہِ راست" مکمل سفر نامے ہیں۔ ان سفر ناموں کا انداز تحریر دلچسپ اور ہلکا پھلکا ہے، معلومات بھی ہیں تو ہلکا پھلکا طنز بھی ہے اور افسانوی رنگ ہے کہ مصنّفہ ناول اور افسانے کی بھی آدمی ہے۔

بشریٰ رحمٰن کا سفر نامہ "براہ راست" اپنی سرشاری اور شادابی کے اعتبار سے بڑا منفرد ہے اور دلچسپیوں اور بے باکیوں کا ایک حسین مرقع، انسانی فطرت کے متنوع تجربات کی پیچ و خم کھاتی ہوئی ندی ایک خاص آہنگ اور ساز کے ساتھ بہہ رہی

ہے۔

پروین عاطف نے کرن تتلی اور بگولے اور "ٹہر واسی" کے عنوانات سے نہایت خوبصورت اور دل میں اُتر جانے والے سفر نامے تحریر کر کے ایک کامیاب سفر نامہ نگار کی حیثیت سے سامنے آئیں ہیں اور مختلف معاشروں کی جیتی جاگتی تصویریں کھینچی ہیں ان کی تحریر کا بانکپن اور ان کے مشاہدے کی گہرائی انسانی معاشروں کے اندر کی کیفیت بے نقاب کرتی ہیں اور پڑھنے والوں میں ساتھ ساتھ چلنے کی ایک نشاط روح بھی پیدا کرتی جاتی ہیں۔

"ٹہر واسی" میں لکھنڈو وار جن ٹینا چین اور ہیروشیما اور ایمر ڈڈیم کے عنوانات سے پانچ سفر ناموں کی روداد شامل ہے۔ انہوں نے اپنے سفر ناموں میں متعلقہ ملکوں کے کئی راز اور کئی پرتیں وا کی ہیں۔ اُردو میں اس سے پہلے اتنی گہرائی اتنی بے ساختگی اتنے بھرپورپن سے کم ہی سفر نامے لکھے گئے ہیں یہ سفر نامے حالات سفر سے زیادہ تجربات سفر کا کھرا اور ساتھ ہی فنکارانہ اظہار ہیں اور معیاری سفر نامے کا یہی اسلوب ہونا چاہئے کہ ملکوں اور شہروں کے جغرافیہ اور تاریخ کے حالات تو ہم بے شمار معلوماتی کتابوں میں پڑھ سکتے ہیں مگر وہاں کی تہذیب و ثقافت کے اندر اُتر جانے کا سفر بہت کم سفر نامہ نگاروں سے ہو سکا۔

پروین عاطف کے سفر نامے فنی لحاظ سے مکمل سفر نامے ہیں۔

محمد منشاء یاد کے لفظوں میں _ پروین عاطف نے ہر معاشرے کی اچھی اور بُری دونوں طرح کی تصویریں دکھانے کی کوشش کی ہے یہ تصویریں کبھی تاریخ میں دُور تک اور کبھی جدید تہذیبوں کے اندر تک پہنچ کر لے جاتی ہیں۔

نیلم احمد بشیر اُردو افسانے کے حوالے سے مضبوط شناخت رکھتی ہیں وہ مکالموں اور منظر نگاری پر گرفت رکھتی ہیں اور اپنے منفرد اندازِ اسلوب کی حامل قلمکار ہیں جس کی مثال انکے افسانے ہیں اب ان کا سفر نامہ "پنج وتی کی گھنٹیاں" کے عنوان

سے طبع ہو چکا ہے انہوں نے اس قدر خوبصورت انداز میں سفر نامہ لکھ کر جدید سفر ناموں میں یقیناً اچھے اور معیاری سفر نامے کا اضافہ کیا ہے۔ نیلم احمد بشیر نے سفر نامہ میں نہ صرف پُراسرار نیپال کی سیر کرائی ہے، بلکہ انہوں نے نیپال کے سفر نامہ میں اس خطے کے بارے میں نہایت مفید معلومات فراہم کی ہیں اور بڑے دلچسپ اور شگفتہ پیرائے میں انسانی سوچ اور مزاج کی تصویر کشی کی ہے۔

ایک زمانہ وہ تھا کہ بیروت کے حسن، اس کے رنگین دنوں اور جگمگاتی راتوں کے تذکرے زبان زد عام تھے، وہ بیروت جسے مشرق کا پیرس کہا جاتا تھا لیکن جب اس کے حسنِ بے مثال کو لوگوں کی نظر بد لگی تو بیروت جنگ کی تباہ کاریوں کی لپیٹ میں آگیا اور اخبارات میں یہ سُرخیاں جلی حروف میں آنے لگیں تھیں کہ بیروت جل رہا ہے۔ لبنان میں خانہ جنگی کی تباہ کاریوں سے بیروت کا حسن انتائی بُری طرح سے متاثر ہوا۔

"مسافتیں کیسی؟" بلقیس ظفر کا سفر نامہ جو انہوں نے بیروت کے حوالے سے لکھا ہے، مصنفہ نے بیروت کے قیام کے دوران جنگ کے دلدوز مناظر کا نقشہ جس حقیقت نویسی سے کھینچا ہے اس کو پڑھ کر قاری پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، بیروت کے قیام میں بلقیس ظفر کو جو واقعات اور حالات پیش آئے اور وہ جس کرب سے گزری ہیں اس کا برملا اظہار "مسافتیں کیسی" میں ملتا ہے علاوہ ازیں اس سفر نامہ میں نہ صرف بیروت کی عمارتوں، لوگوں کی معاشرت، تہذیبی روّیوں، خوش لباسی خوش ذوقی اور صحت مند چمکتے دمکتے چہروں کا ذکر بھی خوبصورت لفظوں میں ملتا ہے۔ مصنفہ کی نگارش کی سلاست وروانی، خوبصورت تشبیہات اور اچھوتے استعارات مؤثر اور دلکش بھی ہیں۔

سائرہ ہاشمی، اُردو افسانے کے حوالے سے معروف نام رکھتی ہیں۔ اب ان کا نام سفر نامہ نگار خواتین کی فہرست میں بھی شامل ہو گیا ہے۔ انہوں نے کیمرج

کے بارے میں اپنا ایک اچھوتا تجربہ تخلیق کیا ہے اور بڑی متانت کے ساتھ علمی فضا کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے انکا بے حد حساس دل ایک اعلیٰ تعلیمی ادارے کا قریبی مشاہدہ کر کے بے چین ہو جاتا ہے اور اس اضطراب سے ایک عظیم تحریر وجود میں آتی ہے۔

اُردو کی صاحب طرز ناول نویس سلمیٰ یاسمین نجمی نے کوئے ملامت میں لندن کی زندگی کا ایک مسکراتا ہوا چہرہ نہایت لطیف پیرائے میں اجاگر کیا ہے۔ مزاح کی ایک ہلکی سی چاشنی لطف کو دوبالا کر دیتی ہے جو اس سفر نامہ میں شامل ہے۔

سلمیٰ یاسمین نجمی نے "کوئے ملامت" لکھ کر سفر نامے کی روایت کو وقعت اور اعتبار بخشا ہے جو بشاشت اور بصیرت کا نادر نمونہ ہے۔ یہ سفر نامہ واقعات کی پیکر تراشی اور شوخی اور ظرافت کا معیار متعین کرتا ہے۔

محترمہ ثریا حفیظ، جو کئی برس بھارت میں مقیم رہی، انہوں نے اس پرتگالی ریاست کا سفر کیا جس پر بھارت نے فوجی طاقت کے ذریعے قبضہ کر لیا تھا۔ تاریخ کے اس مدو جزر کا مصنفہ نے پہلی بار ایک غیر مطبوعہ سفر نامے "خوابیدہ ساحل" کی صورت میں احاطہ کیا ہے اور سوچ کے نہایت گہرے رنگ پیدا کئے ہیں۔

محترمہ مسرت پراچہ، جو ایک جرأت مند اور بہادر خاتون ہیں انہوں نے سفر کو ایک نئے زاوئے سے دیکھا اور ایک نئے انداز سے تحریر کیا ہے ان کی تحریر حوصلے عطا کرتی ہے اور پڑھنے والے کے دل میں بڑے کام کرنے کی امنگیں بیدار کرتی ہے۔ اس کی تحریر میں پاکیزگی اور شیرینی ہے۔

بلقیس ریاض، پاکستان کی ایسی معروف سفر نامہ نگار ہیں جن کے متعدد سفر نامے طبع ہو چکے ہیں مثال کے طور پر "سفر حرمین شریف" جہان اور بھی ہیں" "عمر خیام کے دیس میں" "بادبان" اور "پہنچی وہیں پر خاک" بلقیس ریاض کے سفر ناموں میں ایسی تصویریں اُبھرتی ہیں جن کے نقوش تیکھے مگر رنگ شوخ نہیں۔

یہاں بیگم ثریا حفیظ الرحمٰن کے سفر نامہ "جس دیس میں گنگا بہتی ہے" کا ذکر نہ کیا جائے تو یقیناً یہ مضمون تشنہ رہے گا۔ بیگم ثریا حفیظ الرحمٰن اپنے صحافی شوہر کے ساتھ ان کے سرکاری فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں بھارت کی سرزمین پر چھ برس تک رہنے کا موقع ملا انھوں نے اس دوران بھارت کے طول و عرض کی سیاحت کی ڈلہوزی انکی جنم بھومی سماں تھی جہاں انھوں نے اپنے بچپن کے خوبصورت ماہ و سال گزارے ہیں۔

"جس دیس میں گنگا بہتی ہے" ایک مکمل سفر نامہ ہے ایک اچھوتی تحریر اور ایک منہ بولتی تاریخ ہے یہ وہ آئنہ ہے جس میں بر صغیر کی تاریخ اور اس کے عروج و زوال کے کئی مناظر کی پرچھائیں نظر آتی ہیں۔ اس سفر نامے کا ہر باب فکر انگیز۔ ہر منظر خیال افروز اور ہر لفظ چونکا دینے والا ہے۔

پاکستان میں لکھے گئے قابلِ ذکر سفر ناموں کے اس مُجمل جائزے سے اور کچھ واضح ہو یا نہ ہو کم از کم اندازِ نظر کے تنوع اور اسالیب میں نئے پن کا اندازہ ہو جاتا ہے اور یہ بھی بہت ہے ان دنوں سفر ناموں میں جس خصوصی دلچسپی کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے وہ اس صنف کے لئے ایک نیک فال ہے اور مستقبل میں نظر اور خبر سے وابستہ نئے نئے امکانات کی توقع بے جا نہ ہو گی۔ پچھلے برسوں میں خواتین کے جو سفر نامے قارئین میں مقبول ہوئے ہیں ان میں دیگر اہلِ قلم خواتین کے علاوہ سلمیٰ جبیں کا سفر نامہ "جلاوطن" ان سے کچھ فاصلے پر رضیہ فصیح احمد کا "سفر ہے شرط" انور رضا کا "ہوا کے دوش پر" تامدہ بتول کا "شالیمار سے تاج محل تک" سلمیٰ اعوان کا "یہ میر البلتستان" اور بشریٰ اعجاز کا "عرضِ حال" یہ متعدد سفر نامے منظر عام پر آئے ہیں اور یہ سب مطالعے، مشاہدے اور تجربات کے مختلف پہلوؤں اجاگر کرتے ہیں۔

خواتین کے یہ سفر نامے (بحوالہ: "اُردو ڈائجسٹ" سالنامہ ۱۹۹۹ء) اپنی دلچسپیوں اور بو قلمونیوں کے اعتبار سے بڑے ہی خوش رنگ اور پُر بہار ہیں۔ ان میں

شخصیت کا اظہار بھی ہے۔ وقائع نگاری بھی ہے۔ تاریخ بھی ہے، آپ بیتی بھی ہے، اور جغرافئے کی دلکشی بھی اور انسانی رسوم ورواج کی متنوع تصویریں بھی معانی اور لطافت کی ایک دنیا سمٹ آئی ہے۔

# تحقیق و تنقید

تحقیق علم و فن نہایت اہم شعبہ ہے بات زبان کی ہو یا واقعات کی تحقیق کے بغیر صحیح نتائج تک رسائی ممکن نہیں۔ لیکن تحقیق ایک مشکل فن بھی ہے اور اپنے موضوع کے ساتھ انصاف چاہتی ہے۔ وہ مواد کو اکھٹا کرنے اور اس کی صحیح پرکھ اسناد کی صداقت تقابل اور تنقیدی شعور کی محتاج ہے یہ ایک مشکل اور صبر آزما کام ہے اس میں بڑی دیدہ ریزی اور ریاضت مشقت کی ضرورت ہے۔ تحقیق اور تنقید نہ صرف ہم جنس ہیں بلکہ ان کی زیر جنس بھی ایک ہے لہذا دونوں میں مماثلت ہے دونوں ہی کا طریق عمل بہت حد تک یکساں ہے دونوں میں ہی تشریح و تجزیہ سے کام لیا جاتا ہے

تب کوئی فیصلہ کیا جاتا ہے۔

دونوں میں بحث و اسباب و نتائج کی کھوج باہمی تعلق مفاہیم وغیرہ کی وضاحت یکساں طور پر ملتی ہے۔ اس طرح موضوع کی موافقت اور مخالفت میں تمام دلائل کا تجزیہ بے معنی ہوگا۔ لہذا نتائج اخذ کرنے اور فیصلہ دینے کی اہمیت تحقیق اور تنقید دونوں کے لئے یکساں طور پر تسلیم کی گئی ہے۔ اس کے بغیر سلسلہ فکر پورا نہیں ہوتا۔ حقائق کی بنیاد تحقیق کے لئے تو لازمی ہے ہی لیکن تنقید میں بھی اس کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ حقائق کی مضبوط بنیاد کے بغیر تنقید میں یقین کا عنصر مستحکم نہیں ہونے پاتا۔ تنقید ادب کا ایک اہم شعبہ ہے ادب کے بنیادی رجحانات کا عکس اس میں بھی نظر آتا ہے، بلکہ ادب کی دوسری تخلیقی اصناف سے پہلے ہی اس میں رجحانات کی جھلک نمایاں ہو جاتی ہے، روایات کی تعمیر و تشکیل کا آغاز بھی پہلے تنقید میں ہوتا ہے اور تجربات بھی اس میں سب سے پہلے اپنا اثر دکھاتے ہیں بلکہ تنقید ہی کے توسط سے ادب کو ان روایات کا احساس ہوتا ہے اور تجربات کی جولاں نگائیں نظر آتی ہیں۔ وہ ادب کو ہر دور میں اس اعتبار سے بلند کرتی ہے۔ ادب کی ترقی کے ساتھ اس کا ارتقاء ہوا ہے اور خود اس ارتقاء کے ساتھ ادب نے ترقی کی ہے۔ اردو تنقید تجربات کی ایک داستان ہے ان ہی تجربات نے اس میں مستقل جگہ بنا کر روایات حیثیت بھی اختیار کی جس کی وجہ یہ ہے کہ ہر تجربے نے روایات پر اپنی بنیادوں کو استوار کیا ہے یہی وجہ ہے کہ ان تجربات و روایات میں ایک ہم آہنگی ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی نہیں معلوم ہوتے۔

تنقید... تخلیقی ادب کو سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش ہے۔ معاصر تنقید میں یہ کوشش کئی جہتوں سے جاری ہے، تخلیقی فن پارہ ادبی روایات کا حصہ بھی ہوتا ہے اور عصری تجربے کا جزو بھی اس کے پیرایۂ اظہار میں فن کی رمزیت اور خیال کی ندرت مل کر ایک دلکش آمیزے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ظاہر ہے سب سے پہلی کوشش

تخلیقی فن پارے کا مفہوم سمجھنے اور اس کی کیفیت پہچاننے یا اس کی کیفیات کے تجزیے کی ہوتی ہے۔ چنانچہ تنقید ادب کا ایک ایسا لازمی شعبہ ہے جو اس کی تخلیق کے ساتھ ہی معرضِ وجود میں آتا ہے۔ اور اپنی حیثیت کو مستحکم کر کے ادب کی حیثیت کو متعین کرتا ہے، یہ رفتار وقت کے ساتھ ادب کے ارتقاء اور بالیدگی کے مطابق اپنی توسیع کرتا ہے داخلی طور پر یہ تکمیل یافتہ تخلیق میں ایک بے نام تحریری اور متضاد تجربے کی تشکیل اور ٹھوس پیکریت میں ڈھلتے اور پھر ارتکاز اور توازن کی تکملیت تک اپنی فعالیت اور کارِ آگہی کا احساس دلاتا ہے۔

اردو میں تنقید کا آغاز اردو شاعری کے ساتھ ہی ہو گیا تھا۔ قدیم اردو تنقید معشوق کی موہوم کمر نہیں بلکہ ایک مستقل فن تھی یہ دوسری بات ہے کہ اس فن کو بطورِ فن باقاعدہ مدوّن نہیں کیا گیا۔ اپنی موجودہ صورت میں اردو تنقید 1875ء کے بعد شروع ہوتی ہے جب مغربی تصوّرات تنقید ہمارے ہاں رائج ہوئے، اس اعتبار سے اردو کی پہلی تنقیدی کتاب مقدمہ شعر و شاعری کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اگرچہ اصول تنقید پر بہت کم لکھا گیا لیکن عملی تنقید پر مسلسل کام ہوتا رہا کئی نقاد سامنے آئے اور تنقید کے سرمائے کو باثروت بنانے میں اپنا کردار ادا کرتے رہے۔

آزادی کے بعد پاک و ہند میں ادبی تحقیق کو اتنا فروغ حاصل ہوا ہے کہ اسے تحقیق کا زریں دور کہا جا سکتا ہے۔ لیکن پاکستان میں خواتین نے تحقیق و تنقید کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی یہی وجہ ہے کے اس میدان میں خواتین کی تعداد کم نظر آتی ہے۔ تاہم یہ تعداد مایوس کن نہیں ہے تقسیم وطن کے بعد سے لیکر اب تک پچاس برس کے عرصے میں تحقیق و تنقید میں خواتین کے جو نام سامنے آئے ہیں ان میں سب نہیں تو کچھ نام نمایاں ہیں خصوصاً ان میں سب سے زیادہ اہمیت ممتاز شیریں رکھتی ہیں۔ ممتاز شیریں کا شمار ان قدآور شخصیتوں میں ہوتا ہے جنہوں نے عہد جدید کے تنقیدی مزاج کی تشکیل کا آغاز کیا ممتاز شیریں نے اردو تنقید کو مغربی طرز و آہنگ سے آشنا

انہوں نے تاثراتی اور سائنٹیفکٹ تنقید کے درمیان (خصوصاً فکشن میں) ایک توازن قائم کرنے کی کوشش کی اور اردو ادب میں ایک متوازن تنقیدی لب و لہجہ رائج کیا۔ ان کی تنقیدیں، تنقید متن کی حدود سے نکل کر ایک وسیع تر آگہی تک پہنچیں کہ ان کے نزدیک تنقید کا منصب تخلیقی فن پارے کی تقسیم ہے محاکمہ نہیں گویا فن پارے کو اس کے اندرونی ضوابط و آئین کے مطابق ہی پرکھنا اور جانچنا ان کے خیال میں کافی ہے۔

ممتاز شیریں کی تنقید اس صدی کی چھٹی دہائی میں جتنی خود منضبط اور خود معتبر دکھائی دیتی ہے ان سے پہلے یا ان کے عصر میں تو کیا ان کے بعد یعنی آج لکھی جانے والی جدید افسانے کی جدید تنقید بھی اتنی خود منضبط اور خود معتبر دکھائی نہیں دیتی۔ تنقیدی فکر و شعور کے انضباط اور تنقیدی لہجے کے اعتبار سے ممتاز شیریں کو اردو افسانوی تنقید میں ایک معیار اور مقام پر فائز کر دیا ہے۔ ممتاز شیریں کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ۱۹۶۶ میں معیار کے نام سے طبع ہوا۔

ممتاز شیریں نے اپنے طویل مقالے "تکنیک کا تنوع" میں افسانوی اظہار کی متعدد جہات پر روشنی ڈالی اور مغربی فکشن میں بیان کی جو تجزیاتی تکنیکیں انہوں نے دیکھی تھیں انہیں اردو کے بعض اہم افسانوں میں دریافت کیا ہے اور اردو فکشن میں اظہار کے طریق ہائے کار کو ایک مخصوص فنی نظام یا فنکارانہ نظریاتی اصول میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔

تنقید کا تقابلی رجحان ممتاز شیریں کے مقالات "طویل مختصر افسانہ" اور مغربی افسانے کا اثر اردو افسانے پر بڑی حد تک سیاسی، سماجی، ادبی، اور کچھ حد تک اخلاقی اور مذہبی نظریات سے بحث کرنے والے مقالات ("ترقی پسند ادب۔ سیاست"۔ "ادب" اور "ذہنی آزادی")۔ "پاکستانی ادب کے چار سال" اور فسادات پر ہمارے افسانے کے مجموعہ میں بھی ممتاز شیریں کشادہ ذہن و فکر کی حامل

شخصیت کے طور پر سامنے آتی ہیں۔ ممتاز شیریں ذات کی گہرائیوں کو افسانوی پیکر میں ڈھالنے والی ادیبہ تو تھیں ہی وہ افسانے کی بہترین نقاد بھی تھیں، سعادت حسن منٹو کے مطالعے کے بارے میں ان کی کتاب "منٹو نوری نہ ناری"۔ ایک بلند معیاری کتاب ہے اور یہ کتاب منٹو کے مطالعے میں نئی جہت اور افسانے کی تنقید میں اہم اضافہ قرار دی جاسکتی ہے۔ ان کی تنقیدی کتاب "معیار" کے مختلف مقالات میں مختلف نوعیت کی تکراروں کے بعد ممتاز شیریں "منٹو نوری نہ ناری" کے مقالات میں مخصوص موضوعی منضبط اور ایک معتبر تنقیدی اسلوب گرفت میں لینے میں خاصی کامیاب ہیں اور اس طرح تجزیاتی تنقید کے عمل کو جمالیاتی اور تاثراتی رنگوں سے معمور کر دیا ہے۔ قرۃ العین حیدر کے بھی کچھ تنقیدی مضامین سامنے آئے ہیں ان میں اُردو افسانے اور تخلیق کی جموریت ان کا بہت اہم مضمون ہے اس کے علاوہ انتخاب سجاد حیدر یلدرم بھی ان کی کامیاب منفرد کوشش ہے۔ ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش کا شمار نقادوں اور محققوں کے ایسے قبیلے میں کیا جاتا ہے جنھوں نے نہ صرف اپنے عہد کی سیاسی۔ سماجی۔ تہذیبی۔ اور اخلاقی صورتحال سے مکمل آگہی حاصل کی ہے بلکہ وہ ادب کی روایت کا گہرا شعور بھی رکھتی ہیں ان کے موضوعات کا تنوع اس بات کو ثابت کرتا ہے۔

ڈاکٹر سلطانہ بخش تحقیقی مزاج رکھتی ہیں۔ چنانچہ ان کی تحقیق اور تنقید کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ ان کا رجحان تحقیق و تنقید کی طرف ہے اور وہ ایک غیر جانبدار محقق اور نقاد ہیں اس کی مثال ان کی کتاب "عصمت چغتائی۔ شخصیت و فن" ہمارے سامنے ہے، اس کتاب کے حوالے سے لکھے گئے تنقیدی جائزوں کو کئی حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ان میں عصمت کی کہانی آپ بیتی وغیرہ کے علاوہ عصمت چغتائی کے فکر و فن پر نقادانِ فن کے تنقیدی جائزے شامل ہیں۔

پروین شاکر کی ناگہانی حادثاتی وفات کے بعد ان کی شخصیت و فن کے حوالے

سے ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش کی تحقیقی کتاب منظر عام پر آئی جو سلطانہ بخش کی اعلیٰ بصیرت کا نمونہ ہے۔

ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش کا تحقیق و تنقید کے میدان میں ایک نمایاں کارنامہ ان کی کتاب اُردو میں "اصول تحقیق" بھی ہے جو دو جلدوں پر مشتمل ہے۔

محترمہ ایم سلطانہ بخش اس کتاب کے مقدمہ میں ادبی تحقیق تحقیقات کی رفتار اور جائزہ میں انکساری سے کام لیتے ہوئے کہا ہے کہ یہ کتاب آزادی کے بعد اردو تحقیق کی رفتار اور سمت کا مختصر ساخاکہ ہے۔

حقیقت میں یہ مقدمہ ڈاکٹر صاحبہ کی ذوق آگہی عمدہ بصیرت ان کی جمالیاتی حسّیت بلند معیار کا خوبصورت ثبوت ہے بلکہ یہ خاکہ مختصر ہونے کے باوجود معیارِ تحقیق کا امید افزا پھلاؤ ہے اور اردو کے تحقیقی اور ادبی اثاثہ میں ایک گرانقدر قیمتی اضافہ بھی ہے۔

علاوہ ازیں ایسے مقالات جو بیشتر صورتوں میں اپنے موضوع پر حوالہ کی چیز ثابت ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش کا مقالہ اردو کی نثری داستانوں میں طنز و مزاح اور ان کے محرکات کا جائزہ اسی نوعیت کے مقالوں کی فہرست میں آتا ہے۔

داستانوں میں کئی حوالوں سے کتابیں لکھی گئیں اور اردو ادب کے کئی اوصاف سخن اور اصناف نثر پر مزاح کے حوالے سے ارباب نقد و نظر نے اپنی آراء قلم بند کی ہیں لیکن اردو کی داستانوں میں مزاح کے مزاج کو پہلی دفعہ موضوعِ تحریر بنایا گیا ہے، "اُردو کی نثری داستانوں میں طنز و مزاح" موضوع کے اعتبار سے اپنی نوعیت کی منفرد اور پہلی کتاب ہے جسے دو حصّوں میں تقسیم کر کے منظوم اور نثری داستانوں کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ حصہ اول داستانیں اور موضوعات مزاح نگاری نثری داستانوں میں اور حکائتوں میں مزاح (1825 تک) دہلی اور لکھنو کی داستان تقابلی مطالعہ نثری داستانوں اور حکائتوں میں مزاح (1825 سے

1987 تک) اور 1858 سے 1905 تک کی داستانوں میں مزاح کے عناصر اور داستانوں کا اثر افسانوی ادب پر مشتمل سات ابواب ہیں۔

حصہ دوئم۔ دکن گجرات اور شمالی ہند کے منظوم قصوں میں مزاح کے دو تفصیلی باب ہیں اس کتاب کے حصہ اول کے آخر میں داستانوں کا افسانوی ادب پر اثرات کے بارے میں جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کا دوسرا حصہ منظوم قصوں میں مزاح کی دریافت سے ہے ان قصوں میں دکن گجرات اور شمالی ہند میں لکھے جانے والے منظوم قصوں کو شامل کیا گیا ہے۔

مجموعی طور پر یہ کتاب تحقیقی و تنقیدی اعتبار سے ایک منفرد اور اہم حیثیت رکھتی ہے اس میں انیسویں صدی کے آخر تک کی نثری اور منظوم داستانوں میں مزاح کے عناصر کا احاطہ کیا گیا ہے۔ شاہ تراب علی تراب بیجاپوری بارھویں صدی ہجری کے نامور صوفی شاعر تھے اور دکن میں چشتیہ سلسلے کی ایک کڑی سمجھے جاتے ہیں ان کا دیوان جس کا واحد نسخہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی میں موجود ہے۔ جسے ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش نے اپنے فاضلانہ مقدمے کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ اور انجمن ترقی اردو پاکستان نے اسے 1982ء میں شائع کیا ہے۔

دیوان تراب کے متن کی تدوین اور اس کا مقدمہ اور دو ضمیمے جو آخر میں شامل ہیں۔ یہ سب تحسین کے لائق ہیں ایسے قدیم مخطوطات جن کا صرف ایک ہی نسخہ موجود ہوتا ہے جیسا کہ دیوان تراب کا واحد نسخہ انجمن ترقی اردو کی تحویل میں ہے ایسے نسخے کو پڑھنا اور تدوین کے تمام تقاضے پورے کرنا ایک مشکل کام بن جاتا ہے کیونکہ الفاظ کی تصحیح کے لئے کوئی اور نسخہ سامنے نہیں ہوتا یہی دشواری ڈاکٹر سلطانہ بخش کو بھی پیش آئی لیکن اس سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ اس محنت طلب کام کو ڈاکٹر موصوفہ نے پوری علمی احتیاط اور قابلیت سے پورا کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ کا مقدمہ ایک علمی کارنامہ ہے انہوں نے شاہ تراب کے متعلق نہایت گرانقدر معلومات

بہم پہنچائی ہیں بلکہ اس پورے عہد پر روشنی ڈالی ہے۔

مقدمے کے آخر میں ان مخطوطات اور کتابوں کی تفصیل بھی موجود ہے جن کے حوالے مقدمے میں دیئے گئے ہیں۔ یہ کتابیات مجموعی حیثیت سے مقدمہ نگار کے ذوقِ تحقیق اور محنت کی آئینہ دار ہے لہذا ڈاکٹر سلطانہ بخش کا کام بلاشبہ مجموعی لحاظ سے عمدہ کام ہے۔

تخلیق اور شعور کے حوالے سے بیگم ثاقبہ رحیم الدین ادبی و علمی حلقوں کی معروف ممتاز شخصیت ہیں۔ ادبی ذوق اور وضع داری ان کا خاندانی ورثہ ہے۔ "محفلِ تنہائی) ان کے تنقیدی مقالات اور نثائی تحریروں کا مجموعہ ہے اگر ایک طرف وہ علامہ اقبال کے فلسفہ ادب اور آرٹ کا اسلامی ورثہ اور موجودہ ادبی تخلیقات میں جمالیاتی عنصر کا فقدان جیسے اہم موضوعات پر کامیابی سے اظہارِ خیال کرتی ہیں تو دوسری جانب عشق۔ ثقافت اور شوخی قلم جیسے طنزیہ مضامین تحریر کرنے پر قادر ہیں۔ محترمہ بیگم ثاقبہ رحیم الدین صاحبہ نے یہ بیش قیمت مضامین بڑی لگن سے لکھے ہیں یقیناً نوع بہ نوع مضامین موضوع پر ایک کامیاب کوشش ہیں اور یہ گرانقدر تحریریں آئندہ لکھنے والوں کے لئے خاصا ٹھوس مواد مہیا کرتی ہیں اور اُردو زبان و ادب کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ پاکستان میں مسلم تہذیب و تمدن پر روشنی ڈالتی ہیں۔

1970ء کے دہے کے بعد پاکستانی خواتین کی ایک قابل لحاظ تعداد اردو تنقید و تحقیق کی طرف متوجہ ہوئی ہے۔ ان خواتین میں قراۃ العین طاہرہ کا شمار بھی ہوتا ہے وہ اردو ادب کی ذہین محقق اور نقاد کی حیثیت سے سامنے آئی ہیں۔ ان کے وہ تنقیدی مضامین اور تحقیقی مقالات جو وقتاً فوقتاً رسائل اور اخبارات میں چھپتے رہتے ہیں، ان کے مطالعہ سے خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ قراۃ العین طاہرہ عصرِ حاضر کی تنقید نگار خواتین میں نمایاں مقام پر نظر آتی ہیں۔ چنانچہ تحقیق و تنقید کے میدان میں ہم ان

سے اچھی اُمیدیں وابستہ کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر فردوس انور قاضی، اردو فکشن اور تحقیق و تنقید میں ایک جانا پہچانا نام ہے۔ اُن کا طویل تحقیقی مقالہ اُردو افسانہ نگاری کے رجحانات کتابی شکل میں طبع ہو چکا ہے۔ یہ کتاب اُردو افسانہ نگاری کی پوری تاریخ ہے جو کم و بیش نوے سال پر محیط ہے۔ اور یہ افسانہ نگاری کے رجحانات اور تجربات کا تحقیقی مطالعہ ہے اردو ادب میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی کوشش ہے جس میں تاریخ تسلسل کے ساتھ ادبی۔ معاشرتی سیاسی اور معاشی تحریکات پر تحقیقی بحث کے ساتھ صنف افسانہ نگاری کی تعریف اس کے تقاضے، تشکیلی نوعیت۔ عہد بہ عہد رجحانات تجربات مغربی ادب اور افسانہ نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔

ڈاکٹر روبینہ ترین کا تحقیقی مقالہ ملتان کی ادبی و تہذیبی زندگی میں صوفیائے کرام کا حصہ کتابی صورت میں چھپ چکا ہے، یہ مقالہ ڈاکٹر روبینہ ترین کے منفرد اسلوب نگارش کا ایک ایسا نمونہ ہے جس میں ادب کی تاریخ کو ادبی تحریکوں ادبی رویوں اور متقی و پرہیز گار بزرگان دین اور ادبی شخصیتوں کے حوالے سے تاریخی، سماجی اور سیاسی پس منظر میں بیان کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر روبینہ ترین کے مزید تحقیقی کام کے سلسلے میں ان کی کتاب "اظہار خیال" کا ذکر بھی بے جا نہ ہو گا "اظہار خیال" روبینہ ترین کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو تین حصوں تحقیق، مسائل ادب و شعر اور تنقید و تبصرہ پر مشتمل ہے۔

علاوہ ازیں ڈاکٹر میمونہ انصاری کا نام بھی معروف و ممتاز اہل قلم کی فہرست میں نمایاں نام ہے۔ ڈاکٹر میمونہ انصاری نے "مرزا ہادی، مرزا ہادی رسوا" کے نام سے ایک کتاب لکھ کر مرزا رسوا کی زندگی اور فن کے چھپے ہوئے گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کی یہ کتاب مرزا رسوا کو سمجھنے میں بہت مددگار سمجھی جاتی ہے۔

ناہید قاسمی کو پنجاب یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کر دی ہے۔

انہوں نے ڈاکٹر سہیل احمد خان کی زیر نگرانی "جدید دور کی شاعری میں فطرت نگاری" کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھا ہے۔

محترمات کلثوم نواز، ڈاکٹر مسز شمیم ملک، ڈاکٹر شاہدہ بیگم وغیرہ تنقید نگار خواتین میں اپنے تحقیقی و تنقیدی کام کے حوالے سے اپنی پہچان رکھتی ہیں۔

محترمہ کلثوم نواز کا تھیس "رجب علی بیگ سرور کا تہذیبی شعور" طبع ہو چکا ہے جو بہت سے دیگر تحقیقی مقالات سے مختلف اور قابل مطالعہ ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی اس کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں

''کلثوم نواز کی یہ کتاب، ''رجب علی بیگ سرور کا تہذیبی شعور'' اردو کی تاریخ بھی ہے۔ لکھنو کے معاشرتی ماحول کا تذکرہ بھی ہے وہاں کے تہذیبی عناصر کا جائزہ بھی ہے، رجب علی بیگ سرور نے جس طرح اپنے اتہذیبی شعور سے کام لے کر ان تمام عناصر کو پیش کیا ہے اس کی تفصیل و جزئیات بھی ہے۔"

آغاذ سہیل یوں رقمطراز ہیں "کلثوم نواز کی کتاب "رجب علی بیگ سرور کا تہذیبی شعور"، سرور کی شخصیت اور ان کے فن پر چھائی ہوئی دُھند کو صاف کرتی ہے اور سرور کے بارے میں بعض حقائق کو جو اہلِ نظر سے بھی مخفی ہوتے جارہے تھے روشن کر کے حقائق مھقہ کے درجے پر فائز کرتی ہے"

ڈاکٹر مسز شمیم ملک کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ "آغا حشر کاشمیری، حیات اور کارنامہ" طبع ہو چکا ہے۔ جس میں انہوں نے آغا حشر کے متعلق تمام کوائف مدوّن کر دیئے ہیں۔

''حرفِ سرور'' آل احمد سرور کی سوانح عمری ہے، جو محترمہ زہرا معین نے قلم بند کی ہے، کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ زہرا معین نے محنت اور دلچسپی سے کام کیا ہے علاوہ ازیں باغ و بہار کا تنقیدی اور کرداری مطالعہ بھی موصوفہ کا ایک نمایاں کام ہے۔

"ناصر کاظمی۔ شخصیت اور فن" ناہید قاسمی کا تحقیقی مقالہ ہے جو انہوں نے ایم اے اردو کے لئے لکھا۔ یہ مقالہ چھ ابواب پر مشتمل ہے پہلے باب میں ناصر کاظمی کے حالات زندگی تفاصیل اور ان کی شخصیت کو ایک خاص آب و رنگ عطا کرنے والے واقعات و محرکات کی نشاندہی کی گئی ہے اس کے علاوہ "اردو غزل، قیام پاکستان تک" "غزل کی حیاتِ نو اور ناصر کاظمی" "ناصر کی غزل کے اہم پہلو" اور "ناصر کی نظم اور نثر کا جائزہ" کے عنوانات سے یہ کتاب مزین ہے۔

"قتیل شفائی: شخص و شاعر" کے عنوان سے تسنیم کوثر قریشی کا ایم اے اُردو کے لئے لکھا گیا مقالہ ہے 1991 میں کتابی صورت میں طبع ہو چکا ہے۔ یہ مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔

پہلے باب میں قتیل اشفائی کی زندگی اور ان کی شخصیت کو دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں قتیل کی غزل کا جائزہ پیش کیا گیا ہے، تیسرے باب میں قتیل کی گیت نگاری پر بحث کی گئی ہے، چوتھا باب قتیل کی نظم کے مطالعے پر مشتمل ہے، قتیل کی نظموں کا موضوع عورت ہے، خاص طور پر "مطربہ" کی نظمیں اسی حوالے سے دیکھی جاسکتی ہیں۔ کتاب کے پانچویں اور آخری باب میں اُردو شاعری میں قتیل کے مقام و مرتبے کو پیش کیا گیا ہے۔

اُردو میں خواتین کی تنقیدی اور تحقیقی خدمات پر (پاکستان میں) نظر ڈالی جائے تو اب تک کی معلوم تاریخ اُردو ادب میں گنتی کی چند خوش نصیب خواتین کے نام سامنے آتے ہیں ان میں ڈاکٹر میمونہ انصاری کا نام بھی کافی شہرت کا حامل ہے۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن کے لفظوں میں ـــــ "اُردو ادب کے حوالے سے ڈاکٹر میمونہ انصاری کو بعض بڑے قابلِ رشک امتیازات حاصل ہیں، انہیں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی جانب سے اُردو میں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی۔ ڈاکٹر میمونہ انصاری کو علی گڑھ سے یہ امتیاز اور اعزاز پانے والی دوسری خاتون ہونے کا افتخار

حاصل ہے۔

مرزا رسوا، اور ان کی ناول نگاری پر محترمہ کے پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالے کو کسی خاتون اسکالر کے پاکستان میں سب سے پہلے چھپنے والے مقالے کا اعزاز اور امتیاز حاصل ہوا جبکہ دوسری پاکستان میں سب سے پہلے چھپنے والے مقالے کا اعزاز اور امتیاز حاصل ہوا جبکہ دوسری خواتین کو پاکستان میں یہ اعزاز ڈاکٹر میمونہ انصاری کے برسوں بعد حاصل ہوا۔ یہ امتیازات ایسے ہیں کہ ڈاکٹر میمونہ انصاری اترائے بغیر زمین پر قدم نہ رکھیں تو روا ہے لیکن ان کی شخصی بڑائی کا ایک پہلو یہ ہے کہ وہ کبھی اشارہ بھی اپنے اولیات کو نہیں جتاتیں۔ تحقیقی اور تنقیدی مضمون میں وہ پوری تحقیق کرتی اور عمیق نظر سے داد تحقیق دیتی ہیں چنانچہ ان کی تنقید غیر جانبدارانہ واقفیت پر مبنی ہوتی ہے۔

"مرزا رسوا (تحقیقی ناول)۔ پھول پتھر (ناول)۔" رسوا + ایک مطالعہ" "انیس ایک مطالعہ" "تنقیدی روش" اور "تنقیدی روئے" جیسی کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔

ڈاکٹر ناہید کوثر کا تحقیقی مقالہ "اُردو شاعری کا ارتقاء" کے عنوان سے طبع ہو چکا ہے۔ اس کے مقالے میں ڈاکٹر ناہید کوثر نے ۱۷۳۹ سے ۱۸۰۳ تک کی اُردو شاعری کا جائزہ لیا ہے پوری کتاب چھ ابواب پر تقسیم ہے اور ہر باب کی مختلف فصلیں ہیں۔ یہ شاعری کی ایک صنف کسی ایک موضوع یا کسی ایک شاعر کے کلام پر مشتمل نہیں ہے بلکہ اس میں لگ بھگ پون صدی کی اردو شاعری اس کے ارتقاء اس کے رُجحانات اور اس دَور کے شعراء کے کلام پر مجموعی طور پر جائزہ پیش لیا گیا ہے۔

ٹھوس جامع اور دقیع تحقیق کتابوں کے علاوہ کئی اہلِ قلم خواتین کے تحقیقی و تنقیدی مقالات اور مضامین اخبارات ورسائل میں بھی چھپتے رہتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ واقعی خواتین کی منفرد تحقیقی کاوشیں قابلِ ذکر ہیں۔ یہ امر یقیناً

اطمینان و مسرت کا باعث ہے کہ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد سے اب تک اُردو اَدب کے مختلف شعبوں میں تحقیق کا کام نہایت سرگرمی کے ساتھ ہو رہا ہے اور دنیائے اَدب کے بہت سے تاریک گوشے تحقیق کی روشنی میں جگمگا اُٹھے ہیں۔

311

# اُردو ڈرامہ

ڈرامے کا لفظ سنتے ہی اس کا لغوی مفہوم ذہن میں آتا ہے، دائرہ المعارف، برطانیہ میں (ڈرامہ) کے موضوع پر لکھنے والے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ ڈرامہ یونانی لفظ کی "نقل لفظی" ہے جس کا مفہوم کر کے دکھائی ہوئی چیز ہے (دائرۃ المعارف برطانیہ، براؤن آئیور) شیلڈن چینے لکھتا ہے کہ ڈرامہ یونانی لفظ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں "میں کرتا ہوں" اور اس کا اطلاق کی ہوئی چیز پر ہوتا ہے (چینے تھیٹر 13) ڈرامے کے آغاز کا بیان کرتے ہوئے ارسطو نے بھی لکھا ہے کہ ڈورین لوگ ڈرامے کے موجد ہونے کے دعویدار ہیں ان کا استدلال ہے کہ لفظ ڈرامہ یونان کی "ڈورک" بولی کے لفظ کے مترادف ہے جس کے معنی کرنا یا عمل

ہے۔

مشرق و مغرب میں ڈرامے کے مفہومات میں دیکھنے اور سننے کے دو پہلو شامل رہے ہیں ہاہر یں بصری اور سماعی پہلو ڈرامے کا لازمہ قرار دئے جاسکتے ہیں۔
ڈرامہ مختلف عناصر کا مجموعہ اور بہت سے لوگوں کی امداد باہمی کا نتیجہ ہوتا ہے اور کسی کھیل کی تخلیق میں مصنف ایک حصہ دار کی حیثیت رکھتا ہے اور اہم مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔ چنانچہ اس کے تصوّر کے بغیر ڈرامے کا امکان ممکن نہیں۔
ڈرامے کا تصوّر ڈرامہ نگار کے ذہن میں موجود ہوتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ڈرامہ پہلے پہل مصنف کے ذہنی سٹیج پر کھیلا جاتا ہے اس کے ذہن میں کردار ابھرتے ہیں اور کہانی کو عملی طور پر پیش کرتے ہیں، ڈرامہ نگار کا ذہن ان کا تماشائی ہوتا ہے، ڈرامہ نگار اس ذہنی عمل کاری کو الفاظ اور کرداروں کا جامہ پہنا کر صفحہ قرطاس پر اتارتا ہے۔

وکٹوریہ ناٹک منڈی 1870ء میں تشکیل دی گئی تھی جو بعد میں پارسی وکٹوریہ تھیٹریکل کمپنی کے نام سے مشہور ہوئی، اس کے علاوہ بھی مختلف ناموں سے دیگر تھیٹریکل کمپنیاں تھیں جن کے مالکان پارسی مذہب سے تعلق رکھتے تھے، یہ سب تھیٹریکل کمپنیاں پارسی تھیٹر کے نام سے موسوم تھیں۔
پارسی تھیٹر جو اُردو ڈرامے کا سب سے توانا اور مقبول روپ تھا، آزادی سے بہت پہلے دم توڑ چکا تھا۔
تھیٹر کے بعد ڈرامہ کو ادبی جرائید نے زندہ رکھا، ادھر 1935ء کے بعد ریڈیو نے اپنی مخصوص ضروریات کے تحت ایک ایکٹ کے ڈراموں کو فروغ دیا۔
برصغیر پاک و ہند میں ناٹک کو اسٹیج پر دکھانے کا فن سیکڑوں برس پرانا ہے اور قدیم ماہرین فن نے اسے مدون بھی کیا ہے اسے ابھے کہا جاتا ہے اس فن میں بتایا جاتا ہے کہ کسی ناٹک کے کرداروں کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیتوں کو کیونکر دکھایا جا

سکتا ہے کہ ناٹک کے پوشیدہ محاسن اور خط آفریں پہلو تماشائیوں کی چشم تصور کے سامنے آجائیں۔

آزادی کے بعد مختلف موضوعات پر ڈرامے تحریر کئے گئے ہیں حب الوطنی ۔ قومی یکجہتی انسان دوستی ۔ جنگ وامن گھریلو اُلجھنوں۔ نفسیاتی پریشانیوں۔ نابرابری ۔ اقتصادی بدحالی۔ سرمایہ داری سے نفرت۔ فرقہ واریت سے بیزاری۔ احساس تنہائی۔ ٹوٹتی قدروں اور ایمرجنسی کی زیادتیوں پر ڈرامے لکھے اور ترجمہ کئے گئے ہیں۔

مگر ایسے ڈرامے لکھے جاتے تھے جو اسٹیج کے تقاضے تو پورے نہیں کرتے تاہم دلچسپ ہے ایسے ڈراموں میں طویل بھی ہیں اور ایک باب کے بھی چنانچہ اُردو ڈرامہ کا ترقی یافتہ رُوپ ریڈیو ڈراموں میں موجود ہے۔

ریڈیائی ڈراموں کی طرف چند ہی خواتین متوجہ ہوئیں حجاب امتیاز علی نے "نمو"، "دوسری شادی"، "دعوت نامہ"، "مہمان"، "وہ"، "شکاری بیوی"، "وجہ"، "افشاں" اور دوسرے بہت سے ریڈیائی ڈرامے لکھے۔

بانو قدسیہ نے "دھواں" "کلو" "اس دیوانگی میں" "گرتی دیوار" "ویار دوست" "دامندگی شوق" "رفوگر" اور "سنگ حوادث" جیسے یادگار اور خوبصورت ریڈیائی ڈرامے لکھ کر مقبولیت حاصل کی۔

حمیدہ افضل نے "تنہائی کی ایک رات" اور "خیریت گزری پر" ہی اکتفا کیا۔ حسینہ معین نے "کم ظرف" اور دوسرے کئی ریڈیائی ڈرامے لکھے، صفیہ شبنم نے "ریشم کی زنجیر" لکھا اس کے علاوہ عصمت جعفری اور شمع پرویز بھی مزاحیہ خاکے لکھتی رہی ہیں ان دونوں نے کئی ریڈیائی ڈرامے بھی لکھے ہیں۔

بحیثیت مجموعی ریڈیو ڈرامے کی صنف میں بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن اس کی ادبی اور فنی حیثیت ابھی زیر بحث ہے۔ یاس پسند لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ پاکستان میں

ریڈیو ڈرامہ نے کوئی امتیازی مقام حاصل نہیں کیا لیکن بڑا امید یہ کہتے ہیں کہ ریڈیو ڈرامے کے دم سے ڈرامے کا نام زندہ رہ گیا ہے اگر ریڈیو ڈرامہ نہ ہوتا تو آج ڈرامے کو کون پوچھتا، باتیں دونوں کی کسی حد تک صحیح ہیں۔

ریڈیو ڈراموں کے بعد جب ہم ایک ایکٹ کے ڈراموں کی طرف آتے ہیں تو کم از کم ہمیں اس مشکل کا سامنا نہیں رہتا ایک ایکٹ کے ڈرامے کے سلسلے میں ہمارا تمام علم مطلوبہ ڈراموں پر مبنی ہے اگرچہ یہ ڈرامے ریڈیو ڈراموں کے مقابلے میں تعداد میں کم ہیں لیکن مطالعے کے لئے بہت ہیں اور اکثر و بیشتر مطالعے ہی کے کام آتے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد لگ بھگ ربع صدی تک ڈرامے کی صنف کی طرف خواتین نے کوئی خاص توجہ نہ دی یہی وجہ ہے ڈرامہ نگاروں میں گنتی کی دو تین خواتین قابل ذکر نظر آتی ہیں حاجرہ مسرور نے ایک ایکٹ کے کئی ڈرامے لکھے جو -وہ لوگ- کے نام سے شائع ہوئے ان کے ڈرامے حسن و عشق اور خدو خال اور کھلی کھڑکیاں، اچھے ڈرامے ہیں۔ اس کے بیشتر ڈرامے سٹیج ہو چکے ہیں۔

رضیہ فصیح احمد نے بھی کئی ڈرامے لکھے ان کا ڈرامہ -ڈریس ریہرسل- خاص طور پر پسند کیا گیا جبکہ اس فہرست میں بانو قدسیہ اور خدیجہ مستور کے نام بھی شامل ہیں، خدیجہ مستور نے ایک اچھی تعداد میں ریڈیو ڈرامے لکھے۔

تاہم کہنے والوں کا یہ کہنا کچھ مناسب نہیں ہے کہ اُردو ادب کی تاریخ میں غالباً ڈرامہ ہی ایک ایسی صنف ہے جس کے فقدان کا ہمیشہ شکوہ رہا، لیکن یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ریڈیو اور بعد میں ٹیلی ویژن نے تھیٹر اور کتابی ڈراموں کی اہمیت کم کر دی، ٹیلی ویژن نے تو ڈراموں کا ایک طویل سلسلہ فراہم کر کے اس صنف کو ترقی کے آکاش پر پہنچا دیا ہے۔

اس عرصے میں ڈرامہ لکھنے والی کئی خواتین کے نام اردو ڈرامے کی سطح پر

اُبھرے لیکن فرداً فرداً ان سب کا جائزہ لینا انتہائی دشوار ہے اس لئے صرف چند ڈرامہ نگار خواتین کا ذکر کروں گا جو اس فن میں اپنے منفرد انداز اور آہنگ کی وجہ سے ممتاز ہیں۔

نجمہ فاروقی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ پاکستان ٹیلی وژن کی پہلی ڈرامہ نویس خاتون تھیں ٹیلی وژن کا پہلا ڈرامہ "نذرانہ" تھا جسے نجمہ فاروقی نے لکھا تھا۔

گزشتہ برسوں میں ٹیلی وژن ڈراموں نے کافی ترقی کر لی ہے، اس میدان میں جو ڈرامہ نویس اُبھری ہیں اور جن کے نام سامنے آئے ان میں بانو قدسیہ، فاطمہ ثریا بجیا، حسینہ معین اور نور الہدیٰ شاہ کے نام زیادہ نمایاں ہیں ان کے علاوہ طاہرہ واسطی، ناہید سلطانہ اختر اور سیما غزل بھی لکھتی ہیں خواتین ڈرامہ نگاروں میں بانو قدسیہ کو فوقیت حاصل ہے، بانو قدسیہ نے اسٹیج کے لئے ڈرامے لکھے جو بہت مقبول ہوئے اس کے علاوہ ریڈیو اور ٹیلی وژن کے لئے بھی کئی ڈرامے تحریر کئے ہیں، ٹیلی وژن کے ناظرین بانو قدسیہ کے کسی نہ کسی ڈرامہ سے محظوظ ہوتے رہتے ہیں بانو قدسیہ کی ڈرامہ سیریل ضرب جمع تقسیم ۱۹۷۵ء میں ٹیلی وژن کاسٹ ہوئی ان کے ڈراموں کا مجموعہ "آدھی بات" کے عنوان سے طبع ہو چکا ہے،

فاطمہ ثریا بجیا، ایک ادبی گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں، راولپنڈی سینٹر کی بات ہے جب بڑکوں سے خوبصورت کھیل پیش کئے جاتے تھے، انہی دنوں فاطمہ ثریا بجیا کی ڈرامہ سیریز "اوراق" کے نام سے ٹیلی کاسٹ ہوئی تھی، کراچی سنٹر سے خاص فاطمہ ثریا بجیا کے ڈرامے بہت مشہور ہوئے اگرچہ راولپنڈی سینٹر نے ان کو نام اور بجیا نے راولپنڈی سینٹر کو اپنی تحریروں سے ایک پہچان پہلے ہی دے دی تھی۔ مگر کراچی جیسے وسیع و عریض شہر نے بجیا کے ذرخیز ذہن کو کام کرنے کے لئے ایک وسیع کینوس دیا،

یہ ابتداء کی بات ہے جب وہ بچوں کے لئے انفرادی ڈراموں کے علاوہ

کہانیاں اور ایک سیریل "ایک دو دس" کر چکی تھیں، "اوراق" نے فاطمہ ثریا بجیا کے تاریخی نقطۂ نظر کو واضح کر دیا تھا اسی طرح لوک عکس کے ذریعے بجیا نے لوک کہانیوں "سسی پنوں" "سوہنی مینوال" کی ڈرامائی تشکیل کامیابی سے کی۔لوک عکس ایک عرصے تک لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا رہا اور بجیا کے روایت پسند مزاج نے کہانیوں کے ذریعے لوک ورثہ عوام تک پہنچانے میں مدد دی۔

ابتداء میں فاطمہ ثریا بجیا کی زیادہ توجہ ماخوذ کہانیوں کی طرف رہی، محترمہ اے آر خاتون کا ناول "شمع" اس سلسلے کی واضح کڑی بن کر سامنے آیا، اس کے بعد آگہی پیش ہوا، پھر وہ ماخوذ کہانی کی صورت میں اے آر خاتون کے ایک ناول "افشاں" کی جانب آتی ہیں۔

1997ء کی سہ ماہی میں محترمہ اے آر خاتون کے ناول تصویر پر مبنی ڈرامائی تشکیل فاطمہ ثریا بجیا کی نہایت دلچسپ اور کامیاب کوشش رہی، لیکن اس ماخوذ کہانی سے قبل وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بھرپور انداز میں ڈرامہ "انا" کی صورت میں سامنے لا چکی تھیں۔

"شہزوری" سے لیکر "دھوپ کنارے" اور "انکل عرفی" سے لیکر "ان کہی" اور "پانی پر لکھا تھا" جیسے خوبصورت ڈرامے حسینہ معین کی تخلیقی صلاحیتوں کے بلند معیاری نمونے ہیں، حسینہ معین کا موضوع نوجوان نسل اور پرانی نسل سے اس کے تعلقات رہے ہیں جو ہر دور میں اپنے عہد کے حوالے سے نظر آتے ہیں، حسینہ معین نے "انکل عرفی" اور "ان کہی" جیسے خوبصورت اور معنویت سے بھرپور ڈرامے لکھے اور شہرت حاصل کی۔ نورالہدیٰ شاہ گو کہ سندھی ادب کی ایک معروف و منفرد شاعرہ، افسانہ نویس اور ڈرامہ نگار بھی ہیں لیکن اُردو میں بھی لکھتی ہیں، عوامی مقبولیت انہیں ٹیلی ویژن کی سیریز "جنگل" اور "آسمان تک دیوار" کے ذریعے ملی ان سیریز نے لوگوں کو چونکا دیا، اور خود نورالہدیٰ شاہ کا مقصد بھی یہی تھا کہ لوگ

چونک کر ان کی طرف دیکھیں اور ان کے ذریعے انسان اور عورت ان کے ان دکھوں کو دیکھیں جنہیں خوبصورت اور رنگین پردے ڈال کر ہمارے سماج نے چھپادیا ہے "جنگل" اور "آسمان تک دیوار" کے بعد ان کا ڈرامہ "کوکھ جلی" ٹیلی ویژن کے ڈراموں میں ایک بہت ہی خوبصورت اضافہ ہے بلکہ یوں کہا جائے تو قطعی غیر مناسب نہ ہوگا کہ وڈیرہ شاہی اور جاگیردارانہ دور کے اخلاقی ضابطوں نے عورت سے اظہار کا فطری حق چھین رکھا تھا نورالہدیٰ شاہ نے حق کو استعمال کر کے ہزاروں برس سے موجود مزاحمتوں کا خول توڑا، نورالہدیٰ شاہ پاکستانی اہلِ قلم خواتین کی اس نسل میں سے ہیں جس نے مکمل طور پر روایت سے بغاوت کی ہے اور بالکل نیا منفرد اور اچھوتا اندازِ بیان اختیار کیا ہے ان کا یہ اندازِ بیان اس امر کی روشن مثال ہے کہ ادیبہ نے معاشرے میں ناہموار منفی روّیوں ریاکاری اور منافقت پھیلانے والے کرداروں کہ نہ صرف ہدفِ نشانہ بنایا ہے بلکہ انہوں نے توانا لہجے مثبت روئے جدید انداز و بیان، حسنِ ترتیب اور منفرد تراکیب و تمثیلات سے افسانے اور ڈرامے کا دامن وسیع کیا ہے۔

بحیثیت ڈرامہ نویس ٹیلی ویژن پر نورالہدیٰ شاہ کی آمد ایک خوبصورت اور تازہ ہوا کا جھونکا تھا، ان کا چار قسطوں پر مشتمل ایک کھیل سب سے پہلے سیریل کے طور پر پیش کیا گیا جس کا نام تھا "زندگی کے میدان میں" اگرچہ کہانی کے بعض پہلو خالص فلمی رنگ لئے ہوئے تھا لیکن بنیادی تھیم مضبوط تھی، شاید اس کی وجہ نورالہدیٰ شاہ کا بنیادی طور پر ادیبہ ہونا تھا اس عہد میں اس حوالے سے ایسی کہانیاں کم ہی ہوتی تھیں جس نے ٹیلی ویژن پلے کو ایک نئے راستے پر ڈالنے کی اور کچھ نئے نئے سوالات سامنے لانے کی کوششیں کیں۔

اُردو ڈرامہ سیریل کے حوالے سے نورالہدیٰ شاہ کا نام پہلی بار "جنگل" کے حوالے سے سامنے آیا اس کا پہلا نام "اندھیرے کا سمندر" تھا،

"جنگل" میں سندھ کے سماجی دُکھ کو جس واضح انداز میں پیش کیا گیا تھا وہ انداز لوگوں نے پہلے نہیں دیکھا تھا، "جنگل" کی کہانی اس عورت کا المیہ تھا جسے مرد کی فطرت نے تھکا دیا ہے، ٹھکا دیا ہے اور ایسی ستم رسیدہ عورت ہر جگہ ہے، چنانچہ "جنگل" ایک نہایت مقبول سیریل ثابت ہوا، اس کے بعد نور الہدیٰ شاہ نے آسمان تک دیوار کے حوالے سے گاؤں سے شہر تک کا سفر طے کیا اور حیرت انگیز طور پر کامیاب رہیں، اس کامیابی کی بنیادی وجہ خود ان کا عورت ہونا تھا اور وہ شاید اس اذیت کو محسوس کر سکتی تھیں۔ جو عورت جھکنے کے عمل میں محسوس کرتی ہے، اس کے بعد کوئٹہ سینٹر سے "فاصلے" کے نام سے بالکل نئے انداز میں سامنے آئیں اسی طرح اگست 1989 میں ان کا ڈرامہ سیریل "تپش" کے نام سے کراچی سینٹر سے پیش کیا گیا 1997ء جولائی میں کراچی سینٹر سے سلسلہ وار ڈرامہ "عجائب خانہ" اور فروری 1998ء میں لاہور سینٹر سے ان کا سلسلہ وار ڈرامہ "اجنبی راستے" دکھایا گیا نور الہدیٰ شاہ کے ڈراموں کو بہت پسند کیا گیا۔

ثروت عتیق ٹیلی ویژن کی معروف و ممتاز اداکارہ کی حیثیت سے ایک مضبوط پہچان رکھتی ہے لیکن اس نے ٹیلی ویژن کے لئے ڈرامے بھی لکھے ہیں "گود" اس کا بہت ہی اچھا ڈرامہ تھا، پھر کوئٹہ سینٹر سے "پارس پھول" اور "خواب سراب" کے ناموں سے دو مختلف کھیل ٹیلی کاسٹ ہوئے، ثروت عتیق کا لکھا ہوا ڈرامہ "بہلاوا" بھی پسند کیا گیا۔ اس کا بچوں کے لئے لکھا ہوا سلسلے وار کھیل "بچوں کی عدالت" اور پھر ایک طویل دورانیہ کا ڈرامہ "میرا پیغام محبت" بھی معیاری ڈرامہ تھا۔

ممتاز و معروف افسانہ نویس اور ناول نگار فردوس حیدر نے بھی ٹیلی ویژن کے لئے ڈرامے لکھے ہیں۔ انہوں نے ٹیلی ویژن کے لئے پہلی بار ڈرامہ سیریل "جال" تحریر کیا جو بانوے (92) اقساط پر مبنی تھا۔ فردوس حیدر نے "جال" میں جاندار کردار پیش کئے جو ہمیں روزمرہ کی زندگی میں نظر آتے ہیں۔

فردوس حیدر کا طویل دورانیئے کا دوسرا ڈرامہ "وہی آسمان" کے نام سے ٹیلی ویژن پر دکھایا گیا۔ یہ ڈرامہ چھبیس (26) قسطوں پر مشتمل تھا۔ اس کے علاوہ فردوس حیدر کے تحریر کردہ پچیس، پچیس منٹ کے دورانیئے کے تین ڈرامے "رنگ دِل" "کار ساز" "کہاں جاؤ گے" بھی ٹیلی ویژن کے ناظرین نے بہت پسند کیے ہیں۔

غزالہ اورکزئی کا شمار بھی عمدہ ٹیلی ویژن ڈرامے لکھنے والی خواتین میں ہوتا ہے ان کے عمدہ ڈراموں میں ڈرامہ "بساط" کی مثال دی جا سکتی ہے، "بساط" خاندانی تنازعات۔ معاشرتی مسائل اور سماجی جھمیلوں پر مبنی ایک بھرپور سیریل تھا۔

ان کا دوسرا ڈرامہ "ریگزار" لاہور مرکز سے پیش کیا گیا تھا۔ بہاولپور کی صحرائی زندگی پر مبنی یہ کہانی مسرت کلانچوی نے لکھی تھی۔

ڈرامہ سیریل "یہ زندگی" اور "ذکر کئی سال پہلے کا" ناہید سلطانہ اختر کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ ان ڈراموں کے علاوہ بھی ناہید سلطانہ اختر نے کئی عمدہ ڈرامے تحریر کیے ہیں۔

اُردو ڈرامے کے اس منظر نامے سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ اب تک اُردو ڈرامہ متعدد تجربات سے گزرا ہے اور یقیناً موضوعی۔ ہیتی، تکنیکی اور اسلوبیاتی لحاظ سے یہ مزید منازل طے کرے گا۔

# رپورتاژ

جدید تاریخ علم وادب میں ایک نئی صنف داخل ہوئی ہے جسے رپورتاژ کہتے ہیں، رپوتاژ فرانسیسی زبان کا لفظ ہے جس کا براہ راست انگریزی لفظ رپورٹ سے تعلق ہے، فرانسیسی میں اس کا تلفظ " رپورتاژ" اور رومن رسم الخط میں املا(RE-PORTAGE) یہ لفظ بڑی حد تک رپورٹ کے معنوں میں ہی مستعمل ہوتا ہے۔ دیگر ترقی یافتہ اصناف کی طرح اس میں موضوع کی اہمیت ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ اس کے فن سے بھی چشم پوشی نہیں کی جاسکتی کیونکہ اس صنف کو رپورٹ اور صحافت سے اس کا فن ہی علیحدہ کرتا ہے اس کا موضوع اگرچہ بڑی حد تک صحافتی ہے لیکن فن قطعی ادبی ہے، یہ صنف خارجی عناصر کی ترجمان ہوتے ہوئے بھی داخلی کیفیات اور

تاثرات کی حامل ہوتی ہے۔ جہاں تک اس کے موضوع کا تعلق ہے تو خارجی عناصر اس کی تشکیل کے لئے درکار ہوتے ہیں لیکن جہاں فن کا سوال آتا ہے تو اس کے مصنف کی داخلی کیفیات اور تاثرات کی رہنمائی ناگزیر ہو جاتی ہے، تبھی اس کے موضوع میں تنوع، ہمہ گیری، اور نکھار اور فن میں حسن پیدا ہو جاتا ہے مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک ایسی صنف ہے جس میں خارجیت اور داخلیت کا ایک حسین امتزاج ہوتا ہے وہ ایک دوسرے سے شیر و شکر ہوتی ہیں اور دونوں ہی اس صنف کے میدان کا تعین کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہیں۔

رپور تاژ کا ماحول افسانہ اور ناول کے مقابلہ میں زیادہ حقیقی اور صداقت آمیز ہوتا ہے، صنف رپور تاژ ایک ہمہ گیر اور جامع صنف ہے۔ اس کے موضوعات کا دائرہ محدود نہیں ہے جس قدر وسیع زندگی اور جامع ہے اسی قدر رپور تاژ کے موضوعات کا دامن بھی پھیلا ہوا ہے بہر کیف رپور تاژ کے موضوعات براہ راست انسانی زندگی میں ہونے والے مختلف نوعیت کے واقعات اور انسان کی ہمہ اقسام کی سرگرمیوں سے ہی مستعار لئے جاتے ہیں الغرض رپور تاژ کے موضوعات کا دائرہ دوسری اصناف ادب کی طرح کافی وسیع اور متنوع ہے۔ لیکن خواتین میں یہ صنف مقبول نہ ہو سکی، اس عرصے میں صرف چند رپور تاژ لکھے گئے،

زاہدہ حنا کے لفظوں میں رپور تاژ لکھنے والی صرف دو تین خواتین کے نام نمایاں ہیں، قرۃ العین حیدر نے " ستمبر کا چاند " " پدماندی کنارے " اور " لنڈن لیٹر " جیسے خوبصورت رپور تاژ لکھے جبکہ سلمیٰ عنایت اللہ نے " ڈوب ڈوب کے اُبھری ناؤ " لکھ کر ایک اور رپور تاژ کا اضافہ کیا۔ قرۃ العین حیدر کا رپور تاژ " ستمبر کا چاند " بے حد مقبول ہوا اور اب جب بھی اُردو میں رپور تاژ کا ذکر آئے گا اس میں " ستمبر کا چاند " سر فہرست ہو گا۔

# اُردو تراجم

اَدب میں صدیوں سے ایک زبان سے دوسری زبان یں کلاسیکی تخلیقات کو منتقل کرنے کے لئے ایک بصیرت افروز ذریعہ قرار دئے گئے ہیں اور ملکی سے غیر ملکی اَدب کو تہذیبی اور فنی دونوں طور پر متاثر کیا ہے۔

تراجم کسی زبان اور ادب کے دامن کو وسیع کرنے میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ تراجم کے ذریعے ایک زبان سے دوسری زبان میں نہ صرف نئے نئے موضوعات داخل ہوتے ہیں بلکہ ان موضوعات کو برتنے کے طور طریقے اور اسلوب سے بھی آشنائی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے دوسری زبانوں تک رسائی کا ذریعہ تراجم ہی ہیں۔

اُردو میں ہمیشہ سے ہی تراجم پر خصوصی توجہ دی جاتی رہی ہے کہ یہ بھی نئے

خیالات کی ترویج اور معیاری تخلیقات سے تعاون کا ایک فنکارانہ انداز ہے، یہی وجہ ہے کہ صدیوں پرانا "شکنتلا" کالی داس کا شاہکار صرف سنسکرت زبان اور ہندوستان کی ملکیت نہیں بلکہ دنیا کے تمام اَدب کا ایک حصہ بن چکا ہے۔ ترجمے کی وساطت سے بھی دنیا کے تمام مذاہب، رسومات، اور ثقافت کو سمجھنے میں مدد ملی ہے، ہمارے ہاں غیر ملکی تراجم کو ہمیشہ سے بے حد اہمیت دی جاتی رہی ہے چنانچہ تراجم کے سلسلے میں خواتین اہلِ قلم میں ایک اہم رجحان نظر آیا اور انہوں نے دوسری زبانوں کے تراجم کر کے اُردو اَدب میں گرانقدر اضافے کئے ہیں، اب ایسی خواتین کی کمی نہیں جو انگریزی پر انحصار کرنے کی بجائے اصل زبان سے تراجم کر رہی ہیں۔ گزشتہ پچاس برسوں میں جدید اَدب کے بعض بہت اہم تراجم کر رہی ہیں،

کشور ناہید دوسری زبانوں کے اُردو میں تراجم کرنے کا ذوق رکھتی ہیں، کچھ برس پہلے ان کے تراجم کے آگے پیچھے کچھ کتابیں آئی تھیں۔ سمون وبوار کی "سیکنڈ سیکس" کا ترجمہ اور تلخیص "عورت" باقی ماندہ خواب اور "نظمیں"۔

کشور ناہید نے سمون وبوار کی کتاب سیکنڈ سیکس میں قطع وبرید کرلی، زیر نظر صورت میں کشور ناہید کا ترجمہ سمون وبوار کی کتاب کا من وعن ترجمہ نہیں ہے کتاب کا ایک حصہ انہوں نے ترجمہ و تلخیص کے لئے چنا، تلخیص اس طرح کی کہ اس میں مقامی رنگ شامل کر دیا۔ کشور ناہید کا ترجمہ رواں سادہ اور دلچسپ ہے، "باقی ماندہ خواب" دوسری قسم کی کتاب ہے، یہاں کشور نے ایک پوری محفل سجائی ہے اور کیا کیا بڑے دماغ کے لوگ اکٹھے کئے ہیں۔

تراجم کا مجموعہ "نظمیں" 1975ء میں طبع ہوا جس میں مختلف ممالک کے شعراء کی نظموں کے نثری تراجم شامل ہیں، ان نظموں کے چناؤ میں موضوعاتی ہم آہنگی اپنے ملکی حالات کی عکس آمیزی اور جزباتی پسندی کے ساتھ ساتھ اپنی انفرادی جدوجہد کو بین الاقوامی آہنگ کے ساتھ محسوس کرنے کی صلاحیت کا پتہ چلتا ہے وہ اپنی

آواز کو جدّو جہد کرتی دوسری آوازوں میں شامل کرنا چاہتی ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ اب اس کی بغاوت۔ سرکشی اور بے باکی مرد کی روایتی بالادستی کے خلاف احتجاج تک ہی محدود نہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر طبقاتی سماج کے خلاف ایک مئوثر اور باوقار تحریک میں تبدیل ہو چکی ہے، غیر م، ملکی نظموں کے مطالعے نے اسے وسعتِ نظر تو بخشی ہی ہوگی مسائل کو سمجھنے اور اپنے خطے کے معاملات کو بین الاقوامی سیاسی شطرنج کے تناظر میں سمجھنے کی استعداد بھی دی ہے، چنانچہ سامراج کا کھیل اور تیسری دنیا میں حکمران چہرے بدلنے کی رسم اب اس کے لئے ایک تماشا نہیں بلکہ وہ اس کے سیاسی اور نفسیاتی عوامل کو دریافت کرنے کی کوشش کرتی ہے، فلسطینی مجاہدہ لیلیٰ خالد کی ڈائری بھی کشور ناہید نے میرے لوگ زندہ رہیں گے کے عنوان سے ترجمہ کی ہے۔

ان ترجموں کی اپنی حیثیت جو بھی ہو، عالمی شاعری کے مطالعے نے کشور ناہید کے اسلوب اور ان کے موضوعاتی دائرے میں بہت سے نئے امکانات کو جنم دیا ہے۔

فہمیدہ ریاض بنیادی طور پر شاعرہ ہیں، شاعری کے حوالے سے وہ معتبر اور مستحکم پہچان رکھتی ہیں لیکن وہ بہت اچھی مترجم بھی ہیں، ایرک فرام (ERICH FROMM) آج کے مشہور نفسیات دان ہیں "ادھورا آدمی" ایرک فرام کی مشہور کتاب (FEAR OF FREEDOM) سے ماخوذ ہے جس میں فہمیدہ ریاض نے اس موضوع پر پاکستانی معاشرے کے تعلق سے بحث کی ہے اور نتائج اخذ کئے ہیں اور ترجمہ عمدگی سے کیا گیا ہے "ادھورا آدمی" کی بے ساختگی اور روانی میں فہمیدہ ریاض کے انداز نے ایسی دلآویزی اور گرفت پیدا کر دی ہے کہ پڑھتے ہوئے خشک موضوع کا احساس بھی نہیں ہوتا،

گیتانجلی، بھارت کی نوخیز شاعرہ تھی اسے پندرہ سال کی عمر میں کینسر جیسا

مہلک مرض لاحق ہو گیا تھااور ایک برس بعد سولہ سال کی عمر میں وہ زندگی سے ہار گئی پروین شاکر نے اس سے متاثر ہو کر گیتانجلی کی شاعری کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ لیکن پروین شاکر کی زندگی میں یہ کتاب طبع نہ ہوئی اور پروین شاکر کی وفات کے تین ماہ بعد 1995ء میں گیتانجلی البم کے نام سے طبع ہوئی۔

ڈاکٹر روبینہ ترین نے پی گرے کی مشہور انگریزی تنقیدی کتاب کا تحسین شعر کے عنوان سے صاف ستھرا ترجمہ کر کے اردو تراجم میں ایک قیمتی اضافہ کیا ہے۔

سعیدہ درانی وسیع النظر اور ذہنی صلاحیتوں کے لحاظ سے متوازن خاتون ہیں۔ ان کا تعلق سندھ کے علاقہ شکار پور سے ہے۔ انہوں نے تعلیم کے تمام مراحل سندھ میں ہی مکمل کیے۔ تاریخ میں ایم اے کا امتحان سندھ یونیورسٹی جام شورو سے پاس کیااور پھر ایم فل بھی وہیں سے کیا۔ ان کے مقالے کا موضوع تھا،

''سندھی پٹھان آف شکار پور اینڈ سراونڈنگ ایریاز''

سعیدہ درانی، سندھی سے اردواور انگریزی سے سندھی اور اردو میں تراجم کرنے پر دسترس رکھتی ہیں۔ اور بہت خوبصورت تراجم کرتی ہیں۔ انہوں نے انداز فیڈریکومایور کی نظموں کا سندھی میں ترجمہ کیا ہے اس کے علاوہ انہوں نے پاکستان کے صوفی شعراء کے کلام کا بھی ترجمہ کیا ہے جو کتابی صورت میں طبع ہو چکا ہے۔ 1990ء تا 1996ء (کتابیات) اور پاکستانی ادب کی تدوین بھی ان کی بہترین کوشش ہے۔

الطاف فاطمہ نے ''جاپانی افسانہ نگار خواتین'' کے عنوان سے جاپانی افسانوں کے تراجم کیے ہیں، کتاب طبع ہو چکی ہے۔

سلمٰی جبین نے جرمن افسانوں کے بہت عمدہ تراجم پیش کیے ہیں۔ یہ تراجم

ایسے ہیں کہ ان کے ذریعے ہم جذباتی سطح پر اپنا اور دوسروں کا موازنہ کر سکتے ہیں۔

مرحب قاسمی کا شمار سندھی اور اردو کی معروف شاعرہ، کہانی کار، ناول نگار اور وسیع النظر مترجم خواتین میں ہوتا ہے۔ سندھی فکشن پر موصوفہ کی خاص نظر ہے۔ گذشتہ کچھ عرصہ سے سندھی زبان میں ایسی کہانی لکھی جارہی ہے جو نہ صرف سندھ کی دھڑکنوں کی ہم نوا ہے بلکہ سچے آفاقی انسانی محسوسات کا بھی تخلیقی اظہار ہے۔

سندھی کہانی کا اردو میں بہت کم ترجمہ ہوا ہے۔ اس لیے اردو کے قاری کو سندھی میں لکھی جانے والی عظیم کہانی کا ادراک حاصل نہیں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ سندھی کہانی، عالمی کہانی کے ہم پلہ ہے۔

''لیر لیر دامن'' سندھی کہانی کاروں کی کہانیوں کا انتخاب ہے جو سندھی معاشرے کی جیتی جاگتی کہانیوں پر مشتمل ہے۔ جنہیں مرحب قاسمی نے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ چنانچہ بلا مبالغہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو زبان میں سندھی کہانی کا پہلا بھرپور تعارف ''لیر لیر دامن'' کے حوالے سے ہوگا اس اعتبار سے اور وسیع تر معنی میں بھی اس افسانوی مجموعے کا نام بہت مناسب اور موزوں ہے۔

# متفرق اصنافِ شعرو نثر

## موم بتی کے سامنے

ستمبر 1965ء پاک بھارت کی جنگ کے زمانے میں

ہر رات بلیک آؤٹ کی جملہ ہدایات پر عمل پیرا ہونے کے باعث حجاب امتیاز علی کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اپنی دیرینہ عادت کے مطابق سونے سے پہلے اپنا روزنامچہ لکھیں تو موم بتی روشن کریں، اس مجبوری نے جنگ کے سترہ دنوں کے اس روزنامچے کو" موم بتی کے سامنے "کا بہت موزوں دلچسپ اور لطیف نام دیا۔

ستمبر 1965ء کی پاک بھارت جنگ کے حوالے سے جو تحریریں سامنے آئیں ان میں یہ روزنامچہ کئی اعتبار سے اہم دستاویزی مقام رکھتا ہے اور ایک لحاظ سے یہ دقیع بھی ہے کیونکہ اصنافِ اُدب میں روزنامچے اور پھر اُردو ادب میں نا ہونے کے برابر ہیں، چنانچہ پاکستانی اُردو اَدب میں حجاب امتیاز علی کے روزنامچہ "موم بتی کے سامنے" کو ایک قابلِ قدر اضافہ قرار دیا جاتا ہے۔

## پروین شاکر فن اور شخصیت :

عصر حاضر میں جن شخصیات نے اپنی صلاحیتوں عزم و ہمت اور جہدِ مسلسل سے اپنا آپ منوایا ہے۔ ان میں پروین شاکر کا نام نمایاں ہے جو مرحومہ ہو چکی ہیں لیکن اپنی زندگی کی مختصر مدت میں انہوں نے شعر و سخن کے حوالے سے خوب نام کمایا۔ پروین شاکر کی حادثاتی موت کے ایک برس بعد ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش اور پروین آغا قادر نے ایک کتاب بعنوان "پروین شاکر فن اور شخصیت" مرتب کی۔ اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں سوانحِ حیات اور شخصیت کے حوالے سے اکیس مضامین شامل کئے گئے ہیں دوسرے حصے میں فکر و فن کے بارے میں انہیں مضامین میں پروین شاکر مرحومہ کی زندگی اور فن پر بحث ہے۔

## خواتین کی خودنوشت سوانح عمریاں :

ڈاکٹر سلیم اختر کے مطابق 1995ء میں مطبوعہ کتاب کا بلحاظ رجحان مطالعہ کرنے پر یہ تعجب خیز امر واضح ہوتا ہے کہ تین خواتین کی خودنوشت سوانح عمریاں گزشتہ برس (1995ء) کا حاصل قرار پائی ہیں۔

"جو رہی سو بے خبر رہی" (ادا جعفری)

"بُری عورت کی کتھا" (کشور ناہید)

"ہمسفر" (بیگم اختر حسین رائے پوری)

ڈاکٹر سلیم اختر خواتین کی سوانح عمریوں کے متعلق مزید لکھتے ہیں۔ جہاں تک ان کے محرک کا تعلق ہے تو وہ نرگسیت پر مبنی نظر آتا ہے۔آپ بیتی خواہ کتنی بھی غیر جانبداری یا لاتعلقی سے لکھی جائے قلم ذات کی روشنائی میں ڈوب ہی جاتا ہے، البتہ فرق اس سے پڑتا ہے کہ لکھنے والے یا والی نے سلیقہ اختیار کیا ہے یا نہیں_؟

ایسا سلیقہ جس کا اسلوب سے رنگ چوکھا ہوتا ہے اس لحاظ سے خواتین کی یہ آپ بیتیاں دلچسپ تقابل پیش کرتی ہیں۔

جس اسلوب میں ادا جعفری نے ذات کی نقاب کشائی کی کشور ناہید وہ اسلوب نہ اپنا سکتی تھیں اور اسی میں "جو رہی سو بے خبر رہی" اور "بُری عورت کی کتھا" کا مزہ ہے ادا جعفری کی کتاب میں شخصی اور تخلیقی روئے متوازن سفر کرتے نظر آتے ہیں، اس سلسلہ کی تیسری کڑی بیگم اختر حسین رائے پوری کی کتاب "ہمسفر" ہے جنہوں نے عمر بھر ایک لفظ نہ لکھا مگر اپنے نامور شوہر اختر حسین رائے پوری کے انتقال کے بعد "افکار" میں بالاقساط چھپنی شروع ہوئی تو ادبی حلقوں میں دھوم مچ گئی۔

## نسوانی آوازیں :

یہ ضمنی سُرخی دراصل ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کی مرتبہ کتاب کا عنوان ہے جس میں پاک وہند کی نامور خواتین کے معروف افسانے مدوّن کئے گئے ہیں۔ مرزا حامد بیگ کا تحقیقی مقدمہ مستند حوالوں پر مبنی ہے اور خوب ہے۔

## عالیہ امام کی کاوشیں :

ڈاکٹر عالیہ امام ہمہ جہت شخصیت ہیں، وہ ادیبہ اور ڈرامہ نگار کے ساتھ ساتھ سیاسی رہنما اور شخصیت نگار بھی ہیں انکے ہاں سیاسی و تہذیبی زندگی اپنے بھرپور انداز میں نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر عالیہ امام کی قلمی کاوشیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ موصوفہ "ہری شاخ" "پیلے پھول" "ردائے وفا" "رنگِ سحر" "غزل اور ارتقاء" "رفیق دل فگاراں" اور "میر انیس اور نفسیاتی تجزیہ" کے عنوانات سے مختلف کتب و مقالات تحریر کرچکی ہیں۔ خصوصاً ان کی شخصیت نگاری کو بے پناہ پذیرائی ملی۔

عالیہ امام نے بعض شخصیتوں پر بڑا اہم کام کیا اور ان کے بارے میں بعض ایسے پہلو سامنے لائیں جنہیں اس زاوئے سے شاید بہت کم لوگوں نے پہلے دیکھا تھا۔

## نئے زمانے کی برہمن :

اُردو شعر واَدب میں کشور ناہید ایک مضبوط پہچان کا نام ہے "نئے زمانے کی برہمن" (مطبوعہ 1990) کشور ناہید کے فن اور شخصیت پر لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ہے جسے اصغر ندیم سید اور افضال احمد نے مرتب کیا ہے۔

اصغر ندیم سید اس کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ میرے پاس اس کتاب کو مرتب کرنے کا جواز وہ نام ہیں، جنہوں نے کبھی کوئی فرمائشی مضمون نہیں لکھا اور نہ ہی کوئی ان کی رائے پر اثرانداز ہو سکا، اس بات کا ایک اور پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ کشور ناہید کی شاعری اور شخصیت میں ایسی گنجائشیں موجود ہیں جو نئے نئے تخلیقی نکات پیدا کرتی ہیں اور تخلیقی مزاج کے نقادوں کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں۔ کشور ناہید

کے فن پر بر صغیر کے نامور نقادوں نے لکھا ہے جو بہت کم اپنے ہمعصروں پر لکھتے ہیں، بہر حال یہ مضامین کسی ستایش و تحسین کے نقطہ ء نظر سے ہر گز جمع نہیں کیے گئے یہ تو اس عہد کی ایک منفرد شاعرہ کو سمجھنے کیلیے تخلیقی اور تنقیدی نقطہ نظر کو سامنے لانے کی ایک کوشش ہے۔

## صنفِ نازک کی کہانیاں :

ڈاکٹر طاہر تونسوی کی مرتبہ کتاب ''صنف نازک کی کہانیاں" طبع ہو چکی ہیں۔ فاضل مرتب نے بڑے قرینے سے اپنے انداز اور اسلوب میں خواتین کے افسانوں کا محاکمہ کیا ہے۔

## زندگی اور زاویے :

رباب عائشہ ، خاتون صحافی کی حیثیت سے اپنی ایک پہچان رکھتی ہے، اس کے بیس سال کے صحافتی عرصہ پر محیط صحافیانہ مضامین کا مجموعہ" زندگی اور زاویے" کے نام سے طبع ہو چکا ہے جو دراصل رباب عائشہ کے اخباری کالموں کا مجموعہ ہے جو پچاس کالموں پر مشتمل ہے رباب عائشہ کا بنیادی موضوع طبقاتی تضادات ہیں اور موصوفہ کو یہ معاشرتی تفاوت اور تضادات بہت دکھی کرتے ہیں اس کے یہ دُکھ اور احساس الفاظ بن کر اخبارات کے کالموں میں ڈھلتا رہا ہے جو کتابی صورت میں "زندگی اور زاویے" کے عنوان سے سامنے آیا ہے۔

افتخار عارف کہتے ہیں ــــ جس طرح ادب کے نام پر لکھی ہوئی ہر تحریر اَدب نہیں ہوتی اسی طرح ضروری نہیں کہ صحافت کے نام پر لکھے ہوئے تمام لفظ

صحافیانہ ہی کہلائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لفظ برسوں بعد بھی بامعنی رہیں وہ ادبی تخلیق کا درجہ رکھتے ہیں

رباب عائشہ کے الفاظ بامعنی ہیں اسکی تحریروں میں مایوسی نہیں بلکہ وہ روشنی کی کرن دیکھنے پر یقین رکھتی ہے۔ وہ روزمرہ کے مسائل اور معمول کے واقعات کو باریکی سے دیکھتی ہے اور ان واقعات کو آئے دن کا قصہ کہانی سمجھ کر نظر نداز کر دینے کی بجائے ایک حساس دل خاتون صحافی کی طرح اپنا موضوع بناتی ہے۔

## پروین شاکر ایک جائزہ :

پروین شاکر کی وفات کے بعد ملک محمد ارشد کی مرتبہ کتاب سامنے آئی جس کا عنوان ہے "پروین شاکر ــــ ایک جائزہ" جس میں شاعرہ مرحومہ کی المناک وفات پر کچھ شخصیات کے تاثرات اور تعزیتی پیغامات کے علاوہ پروین شاکر کے مختصر حالات زندگی اور ان کی شاعری کی جھلکیاں بھی شامل ہیں۔

## خواتین افسانہ نگار :

ان دنوں خواتین کی تخلیقی کاوشوں میں خصوصی دلچسپی لی جا رہی ہے، حال ہی میں کشور ناہید کی مرتبہ کتاب بعنوان "خواتین افسانہ نگار" (1930ء) بہت ہی عمدہ انداز میں طبع ہوئی ہے۔

## عکسِ خیال :

عکس خیال ۔ شہناز مزمل کا بھرپور تعارف نامہ ہے جسے نعمانہ فاروق نے مرتب کیا ہے۔ شہناز مزمل کے فن و شخصیت کے حوالے سے لکھے گئے مضامین مختلف اخبارات میں شائع ہونے والے شہناز مزمل کے انٹرویوز کے علاوہ شہناز مزمل کی کتابوں پر اہلِ قلم کی آراء بھی عکسِ خیال میں شامل ہیں اور یہ سب تحریریں نہ صرف شہناز مزمل کے ماضی ۔ اس کی جدوجہد اور نظریات سے آگاہ کرتی ہیں بلکہ منفرد اسلوب بیان کی شاعرہ کے ادبی مقام کا تعین بھی کرتی ہیں۔

## سلمیٰ کا مقدمہ ڈھاکا سے کراچی تک :

نسرین پروین کا تعلق صحافت سے ہے وہ گزشتہ تیرہ برس تک سرکاری ملازمت میں بھی رہ چکی ہیں اس ملازمت کے دوران انہوں نے بیورو کریسی کے کیا کیا رُوپ اور رنگ ڈھنگ دیکھے اور وہ اپنی حق گوئی کی وجہ سے کن کن مشکلات سے دوچار ہوئیں انہوں نے کس طرح سوچا اور اب کیا سوچتی ہیں یہ سب کچھ اس کتاب " سلمیٰ کا مقدمہ ۔۔ ڈھاکہ سے کراچی تک " کے متن کا حصہ ہے۔ مصنفہ نے کسی رکھ رکھاؤ اور لگی لپٹی کے بغیر کتاب لکھی ہے۔

## پروین شاکر فکر و فن :

پروین شاکر کی وفات سے چند برس پہلے (1990ء) ان کی زندگی میں ان کے فکر و فن کے حوالے سے راقم الحروف (احمد پراچہ) کی کتاب

طبع ہوئی جس کا عنوان ہے " پروین شاکر ___ فکر و فن " جس میں ملک کے علاوہ
بھارت کے نامور اہلِ قلم کے مضامین بھی شامل ہیں۔

اس کتاب کے لئے دو باتیں اہم اور قابلِ ذکر ہیں، ایک تو یہ کہ پروین شاکر
کے فکر و فن کے حوالے سے چھپنے والی یہ پہلی کتاب ہے دوسرے یہ کہ اس کتابے سر
ورق کے لئے پروین شاکر نے خصوصی طور پر اپنی رنگین تصویر عنایت کی تھی جو کتاب
کے سرورق پر چھپی ہے۔

# کتابیات

رشید امجد ڈاکٹر

پاکستان کی اُردو شاعرات، مشمولہ، عبارت راولپنڈی 1997ء

انتظار حسین

کشور ناہید۔ نظم سے نثر کی طرف، مشمولہ، نئے زمانے کی برہمن 1990ء

اعجاز راہی، ڈاکٹر

اُردو نظم کی نئی فکری جہت مشمولہ ،" اظہار" راولپنڈی 1984ء

رشید امجد، ڈاکٹر

کشور ناہید ایک چیلنج مشمولہ نئے زمانے کی برہمن 1990ء

آل احمد سرور

اُردو ناول کا ارتقاء مشمولہ، اُردو نثر کا فنی ارتقاء 1989ء

عبدالسلام، پروفیسر

تقسیم کے بعد اُردو ناول" مشمولہ" ایضاً

وقار عظیم

داستان سے افسانے تک، اردو مرکز لاہور، 1960ء

عندلیب شادانی، ڈاکٹر

تحقیق اور اس کا طریق کار، مشمولہ، اردو میں اصول تحقیق، 1988ء

مجنون گورکھپوری، ڈاکٹر

مَبادیات تنقید، مشمولہ ،اردو نثر کا ارتقاء 1989ء

نیاز فتحپوری

ادبیات اور اصولِ نقد//

عبادت بریلوی، ڈاکٹر

تنقیدی زاویے (دیباچہ)

شوکت صدیقی

حرفِ آغاز، مشمولہ، ترقی پسند ادب 1986ء

سلیم اختر، ڈاکٹر

پاکستان میں ادبی تجربات اور نئے رجحانات 1993ء

سلام سندیلوی، ڈاکٹر

ادب کا تنقیدی مطالعہ 1961ء

ممتاز شیریں

فسادات پر ہمارے افسانے، مشمولہ معیار 1963ء

ایم سلطانہ بخش، ڈاکٹر

اردو تحقیق کی ترقی میں پاکستانی خواتین کا حصہ 1990ء

غفور شاہ قاسم، پروفیسر

پاکستانی ادب ۱۹۴۷ء تا حال 1995ء

محمد منشاء یاد

پیش لفظ، مشمولہ منتخب افسانے، 1987ء

احسان اکبر

پاکستانی ناول ہیئت رجحان اور امکان مشمولہ ماہ نو 1997ء

محمد حسن، ڈاکٹر

ہمعصر اردو تنقید، مطبوعہ مجلّہ شاعر، بمبئی (بھارت) 1977ء

حامدی کاشمیری، ڈاکٹر

تمدنی تنقید کی معنویت، مطبوعہ رسالہ ماہِ نو، لاہور 1987ء

سلیم شہزاد، ڈاکٹر

ممتاز شیریں کی تنقید، مطبوعہ سوغات، بھارت۔

خاور اعجاز

اردو ماہیا۔ چند گزار اشات مطبوعہ "تجدید نو"_1993ء

سلیم اختر، ڈاکٹر

تخلیقات اور تخلیقی روئے مجلہ رابطہ، 1996ء

سحر انصاری

پاکستانی اُدب اور نئے ذہنی رجحانات مشمولہ، سہ ماہی قلم قبیلہ، 1993ء

ایوب ندیم

جدید اُردو نظم فکر اور طرزِ احساس، "ماہ نو" لاہور، 1963ء

حنیف فوق، ڈاکٹر

ادا جعفری اور متاعِ قلم، مطبوعہ مجلہ فنون لاہور

فاروق احمد، ڈاکٹر

جدید نظم کے رجحانات، مطبوعہ سہ ماہی قلم قبیلہ کوئٹہ 1991ء

اجمل نیازی، ڈاکٹر

پاکستانی اُردو غزل ایک اجمالی جائزہ، "ماہ نو" (گولڈن جوبلی نمبر) 1997ء

ریاض صدیقی

پتھر کی زبان سے بدن دریدہ تک مشمولہ، مجلّہ "فنون" لاہور 1956ء

فردوس انور قاضی

اُردو ناول اور افسانہ ۶۵ء کے بعد، مشمولہ مجلّہ قلم قبیلہ کوئٹہ 1993ء

ممتاز احمد خان، ڈاکٹر

جدید اُردو ناول میں موضوعاتی تنوع مطبوعہ رسالہ "آئندہ" کراچی 1996ء

انور سید ڈاکٹر

اُردو میں خواتین کی افسانہ نگاری، قومی ڈائجسٹ 1991ء

زاہدہ حنا

خواتین کا ادب، مطبوعہ :رسالہ ماہ نو، اگست 1996ء

شہزاد منظر

پاکستان میں جدید اُردو افسانہ، مطبوعہ :رسالہ تجدید نو، 1995ء

# اخبارات

ایم سلطانہ بخش، ڈاکٹر

پاکستانی خواتین کا پچاس سالہ ادبی سفر روزنامہ جنگ راولپنڈی 20 جنوری 1997ء

وحید قریشی، ڈاکٹر

اردو تنقید کے پچاس سال، روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی 22 اکتوبر 1997ء

مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر

ستر کی دہائی اور ہمارا افسانہ، روزنامہ جنگ راولپنڈی 28 اگست 1995ء

بشیر سیفی، ڈاکٹر

اُردو ماہیا، روزنامہ جنگ 22 اکتوبر 1996ء

متین فکری

اردو نعت کا ارتقاء روزنامہ جنگ 5 فروری 1996ء

ریاض مجید، ڈاکٹر

نعت گوئی روزنامہ جنگ 6 اکتوبر 1995ء
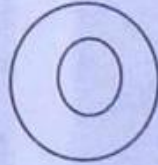
# شاعرات

ادا جعفری

فہمیدہ ریاض

کشور ناہید

پروین شاکر

سارہ شگفتہ

عذرا عباس

شاہین مفتی

ثمینہ راجہ

فاطمہ حسن

یاسمین حمید

منصورہ احمد

شہناز مزمل

بشریٰ اعجاز

سیّدہ حنا

رخشندہ نوید

نوشی گیلانی

فاخرہ بتول

صبیحہ صبا

سیما پیروز

غزالہ خاکوانی

مرحب قاسمی

یاسمین حبیب

گلنار آفریں

شبہ طراز

عذرا وحید

بشریٰ فرخ

طلعت نشاط

خلیق تبسّم

محمودہ غازیہ

ریحانہ قمر

سعیدہ شبنم

انیلا خان

غزل جعفری

ماریہ کومل

شمشاد نازلی

فرحت نواز

عائشہ اسلم

بینا گوئندی

نسرین سروش

طاہرہ شمیم

## نثر نگار

ممتاز شیریں

بیگم شائستہ اکرام اللہ

بانو قدسیہ

خالدہ حسین

زیتون بانو

نثار عزیز بٹ

نیلوفر اقبال

فردوس حیدر

بشریٰ رحمٰن

عذرا اصغر

ثاقبہ رحیم الدین

ڈاکٹر میمونہ انصاری

نورُ الہدیٰ شاہ

نیلم احمد بشیر

فہمیدہ اختر

بلقیس ظفر

ڈاکٹر سلطانہ بخش

ثریا شہاب

فرحت پروین

وحیدہ ملک

زینت قاضی

شبانہ گیلانی

فرخندہ شمیم

شبانہ حبیب

شیریں شاکر
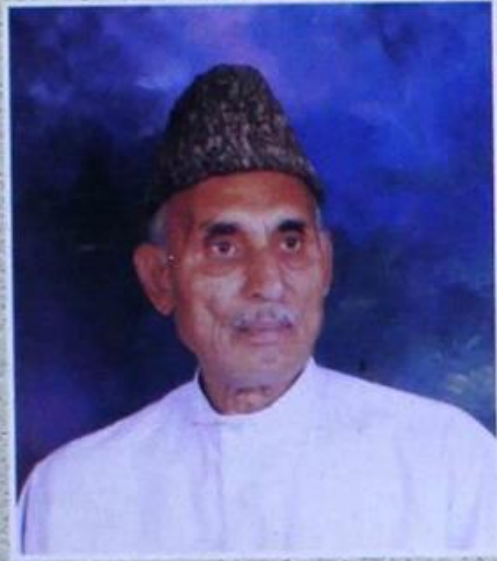
احمد پراچہ صوبہ سرحد کے ایک ہمہ جہت ادیب ہیں، جن کا تعلق کوہاٹ سے ہے اور ادبی حلقوں میں بڑے نمایاں فرد ہیں، انہوں نے وسائل میسر نہ ہوتے ہوئے بھی افسانہ نگاری، ناول نویسی، تذکرہ، تبصرہ نویسی اور شخصیت نگاری کے ذریعے اردو ادب کے خزانہ میں اضافہ کیا ہے۔ 1936ء میں غلام حسین پراچہ مرحوم کے ہاں پیدا ہوئے، والدین نے ان کا نام محمد یعقوب رکھا لیکن علمی حلقوں میں احمد پراچہ کے نام سے پہچانے جاتے ہیں، آپ ضلعی نامہ نگار کی حیثیت سے مختلف قومی اخبارات کے ساتھ منسلک رہے ہیں اور مختلف ادبی انجمنوں مثلاً بزمِ شعاعِ ادب، انجمن ترقی اردو اور بزم خیابان ادب کے صدر اور جنرل سیکرٹری بھی رہے۔ ادبیات کوہاٹ میں انہیں پہلا ناول نگار ہونے کا اعزاز حاصل ہے ان کا پہلا ناول "خلش" کے عنوان سے 1961ء میں چھپا۔ انجمن ترقی اردو لاہور کی طرف سے 1970ء میں خدمات اردو کے سلسلے میں "سندِ اعتراف" اور "خادمِ اردو" کا بیج ملا۔ ان کی کتاب "کوہاٹ کا ذہنی ارتقاء" پر پاکستان رائٹرز گلڈ کا 85-1984ء کا ادبی ایوارڈ بھی ملا۔ 1985ء سے ادبی مجلّہ "نایاب" بھی شائع کر رہے ہیں۔

نیشنل بک فاؤنڈیشن

اسلام آباد

لاہور۔ راولپنڈی۔ ملتان۔ بہاولپور۔ کراچی۔ حیدر آباد۔ سکھر

لاڑکانہ۔ پشاور۔ ایبٹ آباد۔ مردان۔ سیدو شریف۔ چترال۔ کوئٹہ

ISBN : 969-37-0183-6

Price : Rs. 165.00